جرم و سزا
انسپکٹر نواز خان کی جرم و سزا پر مبنی تفتیشی کہانیاں
کالی حویلی گوری لڑکی
FILE
طاہر جاوید مغل
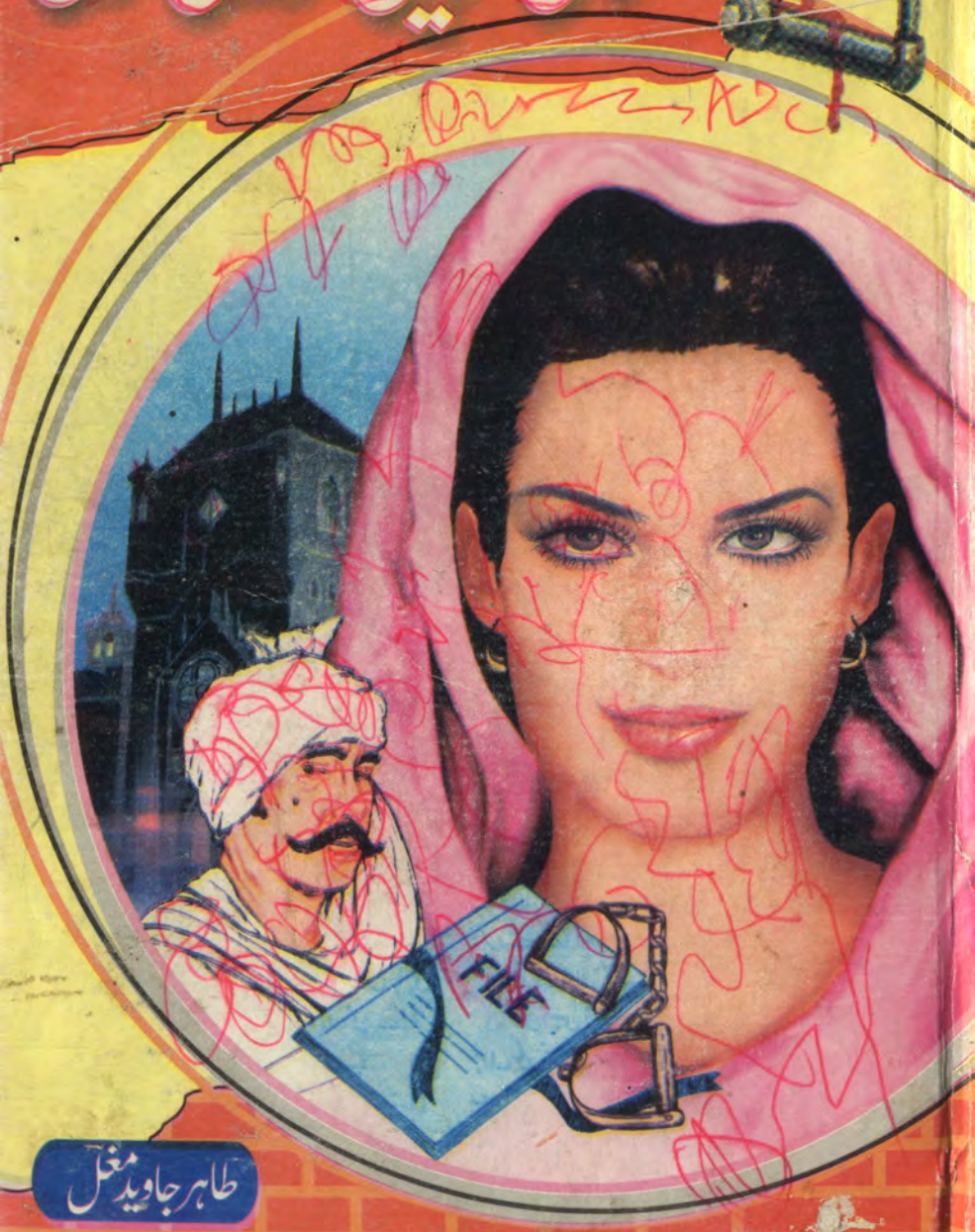
فہرست

کالی حویلی گوری لڑکی

مجرم خواہ کتنا ہی طاقتور اور چالاک کیوں نہ ہو، ایک نہ ایک دن قانون کے پھندے میں پھنس جاتا ہے۔ ایک ایسے ہی درندہ صفت مجرم کا عبرتناک قصہ جس سے بڑے بڑے پولیس آفیسر بھی کانپتے تھے کوئی اس کے خلاف گواہی دینے کو تیار نہ تھا......انسپکٹر نواز خان نے یہ چیلنج قبول کرلیا اور......

اشفاق میری زندگی میں آنے والے ان کرداروں میں سے ہے جنہیں میں آج تک نہیں بھول سکا۔ اشفاق سے میری پہلی ملاقات امرتسر کے ہی ایک تھانے میں ہوئی تھی۔ اُن دنوں وہ پولیس کالج میں تربیت حاصل کررہا تھا۔ پہلی ملاقات میں ہی وہ مجھے اچھا لگا تھا۔ لمبا نکلا ہوا قد، اچھے نقش، چوڑی چھاتی اور سفید کلیوں جیسے دانت جو مسکراتے ہوئے بہت اچھے لگتے تھے۔ وہ ایک ذہین اور خوش باش لڑکا تھا۔ اچھے کھاتے پیتے گھرانے سے تھا۔ اس کے والد فوج سے میجر ریٹائر ہوئے تھے۔ امرتسر کے ایک صاف ستھرے علاقے میں ان کی ذاتی کوٹھی تھی۔ اس کے علاوہ فارمنگ کا کام بھی تھا۔ ایسے گھرانوں کے لڑکے عموماً پولیس میں نہیں آتے۔ معلوم نہیں اشفاق کیسے آگیا۔ شاید اس نے اپنی مرحوم ماں کی خواہش پوری کی تھی۔ اس کی ماں چاہتی تھی کہ شوہر کے جسم پر سرحدوں کے محافظ کی وردی ہے تو بیٹے کے سینے پر قانون کے محافظ کی وردی سجے۔

اشفاق سے میری دوسری ملاقات اس وقت ہوئی جب وہ اپنی ماں کی خواہش پوری کرتے ہوئے اے ایس آئی بن چکا تھا اور وردی پہن کر خوشی سے اٹھلاتا پھرتا تھا۔ ان دنوں میں جالندھر میں تھا۔ اشفاق میرا ماتحت بن کر میرے ہی تھانے میں آیا تھا۔ بہت جلد وہ تھانے کے عملے سے گھل مل گیا۔ چھوٹے عملے سے اس کی بہت بنتی تھی لیکن جہاں تک افسروں کا تعلق تھا وہ اسے زیادہ اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ جس روز اشفاق نے میرے تھانے میں حاضری لگوائی امرتسر سے ڈی ایس پی صاحب کا فون آیا۔

''انسپکٹر نواز! یہ جو نیا منڈا تیرے پاس آیا ہے پورا کھوتے کا پُتر ہے۔ خبیث کے دماغ میں فرض شناسی کا کیڑا گھسا ہوا ہے۔ خواہ مخواہ تیرے لئے کوئی مصیبت کھڑی نہ کردے۔ ذرا دھیان رکھنا اس کا۔''

میں نے کہا۔ ”آپ بےفکر رہیں جناب۔“

ڈی ایس پی صاحب بھڑک کر بولے۔ ”میں تو بےفکر ہوں لیکن تم بےفکر نہ ہو جانا...... بدبخت اوپر خط لکھ دیتا ہے ڈی آئی جی صاحب کو۔ ایک تھانیدار کو معطل کرا کے آیا ہے تیرے پاس۔ ڈی آئی جی سے گہرا ٹانکا لگتا ہے اس کا۔“

ڈی ایس پی صاحب کافی دیر اشفاق کے بارے زہر اگلتے رہے۔ میں بھی زور و شور سے ان کی ہاں میں ہاں ملاتا رہا۔ ویسے میں دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا۔ ڈی ایس پی صاحب جو کچھ فرما رہے تھے اسے سن کر اشفاق کی قدر میری نگاہوں میں بڑھتی جا رہی تھی۔

ٹیلی فون پر گفتگو ختم ہوئی تو میں نے اشفاق کو بلا لیا۔ اس نے اندر آ کر بڑا کڑکدار سلیوٹ کیا اور اجازت لے کر سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ ہمیشہ کی طرح اس کی وردی صاف ستھری اور استری شدہ تھی۔ وہ کمر بالکل سیدھی رکھ کر بیٹھتا تھا اور بیٹھا ہوا بھی اٹین شین لگتا تھا۔ میں نے اس سے اِدھر اُدھر کی باتیں چھیڑ دیں۔ باتوں باتوں میں مَیں نے پوچھا۔

”وہ شاہ آباد کے تھانیدار بال کرشن کا کیا چکر تھا یار؟“

بال کرشن کا نام سن کر اشفاق چونکا۔ پھر اس نے بڑے انداز سے سر ہلایا۔ جیسے اسے پہلے سے پتہ ہو کہ میں جلد یا بدیر اس سے یہ سوال پوچھوں گا۔ کہنے لگا۔

”نواز صاحب! ہمیں بتایا جاتا ہے کہ اپنے سے بڑے ہر افسر کی عزت کریں لیکن افسر کا جرم دیکھ کر آنکھیں بند کر لینا تو عزت میں شامل نہیں اور اگر یہی عزت ہے تو میں ایسی بےعزتی سے باز نہیں رہ سکتا۔ ہمارا قانون کہتا ہے کہ ہم ریمانڈ کے بغیر کسی شخص کو چوبیس گھنٹے سے زیادہ اپنے پاس نہیں رکھ سکتے لیکن کیا آپ یقین کریں گے کہ بال کرشن نے ایک شخص کو ساڑھے تین مہینے سے حوالات میں رکھا ہوا تھا۔ نہ اس کی گرفتاری ڈالی تھی نہ اس کے خلاف کوئی رپورٹ درج کی تھی۔ یہ ایک دھوبی ہے۔ اس پر ایک زمیندار نے چوری کا الزام لگایا تھا۔ وہ چوری پکڑی بھی گئی۔ چور بھی پکڑے گئے ہیں لیکن دھوبی کی مصیبت ختم ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔ اس کا قصور یہ تھا کہ وارثوں نے تھانیدار کو نذرانہ نہیں دیا تھا۔ تھانیدار دھوبی کو چھوڑتا تھا اور نہ اس کے وارثوں کو۔ روز تھانے بلا کر تنگ کرتا تھا۔ دھوبی کی جوان بیوی دو دو گھنٹے تھانے میں بیٹھی بال کرشن کے فحش مذاق سہتی رہتی تھی۔ ایک روز دھوبی کی بوڑھی ماں نے مجھے روتے ہوئے بتایا کہ تھانے دار ہم سے دو سو روپیہ مانگتا ہے لیکن یہ دو سو روپیہ لے کر وہ ملزم کو چھوڑے گا نہیں صرف اس کے خلاف پرچہ کاٹے گا...... نواز صاحب! ذرا انصاف ملاحظہ فرمائیے۔ دو سو روپیہ ملزم کے خلاف صرف پرچہ کاٹنے کے لئے مانگے جا رہے تھے اور

پرچہ بھی وہ جس میں سچائی ڈھونڈنے سے نہ ملے۔ میں اس معاملے کو بہت دنوں سے برداشت کر رہا تھا لیکن اس روز میرا دماغ گھوم گیا۔ میں نے بال کرشن کو آخری بار سمجھانے کی کوشش کی اور وہ نہیں مانا تو میں نے سب کچھ ڈی آئی جی صاحب کو لکھ دیا۔ اس کے ساتھ ہی اپنا استعفیٰ بھی لکھ کر رکھ لیا۔ بعد میں جو کچھ ہوا اس کا آپ کو بھی پتہ ہوگا۔“

میں نے اشفاق سے پوچھا۔ ”پولیس لائن میں آئے تمہیں کتنی دیر ہوئی ہے؟“

اس نے بتایا۔ ”یہی کوئی آٹھ مہینے ہو گئے ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”سال پورا کرنے کا ارادہ ہے یا نہیں؟“

وہ مسکرا کر بولا۔ ”کیوں نہیں ہے۔ بھاگنے کے لئے تو نہیں آیا ہوں۔“

میں نے کہا۔ ”کام تو تمہارے بھاگنے والے ہیں۔“ پھر اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”بھلے مانس! زیادہ تیز بھاگنے سے انسان کبھی کبھی اوندھے منہ گر پڑتا ہے۔ ابھی اپنے پاؤں جماؤ، راستے کی اونچ نیچ دیکھو۔ دوسروں کا چال چلن ملاحظہ کرو۔ پھر اگر ہمت رہے اور دوڑنا چاہو تو دوڑ لینا۔ جس دور سے تم گزر رہے ہو میں اس سے گزر چکا ہوں۔ میں جانتا ہوں، تمہارے دماغ میں قوم کی خدمت کا سودا سمایا ہوا ہے لیکن خدمت کے لئے دو چیزیں ضروری ہیں۔ ایک تو تم پولیس میں رہو، دوسرے زندہ رہو۔“

وہ مذاق کی بات کو بہت اچھی طرح سمجھتا تھا اور اس سے لطف بھی اٹھاتا تھا۔ میری بات سن کر مسکرانے لگا۔ میں نے کہا۔ ”میری باتوں کا بُرا نہ ماننا۔ کچھ عرصہ بعد تم یہ مان لوگے کہ میں نے اچھی نصیحت کی تھی۔“

اشفاق میرے پاس قریباً تین مہینے رہا۔ اس دوران میرے اور اس کے تعلقات بہت اچھے رہے۔ اس میں بہت صلاحیتیں تھیں اور جوش و خروش بھی بے پناہ تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ کسی طرح پولیس لائن میں ٹک گیا تو خاطر خواہ ترقی کرے گا۔ اس میں خامی بس ایک ہی تھی۔ قانون پسند نوجوانوں کی طرح وہ بالکل ناک کی سیدھ میں چلنا چاہتا تھا۔ میں نے اسے کئی بار سمجھایا کہ یہ کوئی سکاٹ لینڈ کی پولیس نہیں ہے۔ یہاں کے آدھے سے زیادہ تھانیدار صحیح طرح لکھ پڑھ بھی نہیں سکتے۔ اسے ان ہی تھانیداروں، سب انسپکٹروں اور سپاہیوں کے ساتھ زندگی گزارنی ہے۔ اس لئے وہ زیادہ نہیں تو کچھ نہ کچھ خود کو ماحول کے مطابق ضرور ڈھال لے۔ میری ماتحتی کے دوران ایک دو مرتبہ اس کی ڈی ایس پی صاحب سے بھی جھڑپ ہوتے ہوتے رہ گئی۔ میں جانتا تھا اشفاق حق پر ہے اور اس کی جگہ کوئی بھی انصاف پسند شخص ہوتا یہی کرتا لیکن بات پھر وہیں پر آ جاتی ہے آدمی کو جس ماحول میں رہنا ہو

اس کے مطابق خود کو تھوڑا بہت بدلنا ہی پڑتا ہے۔ میں نے اشفاق کو سمجھا بجھا کر بڑی مشکل سے یہ معاملے ٹالے ورنہ ممکن تھا ڈی ایس پی کا غصہ اسے ڈسچارج ہی کرا دیتا...... چند کیسوں میں اشفاق نے بے حد سمجھداری سے میری مدد کی تھی۔ میں نے اس کی کارکردگی کو بڑھا چڑھا کر ڈی ایس پی صاحب سے بیان کیا اور یوں ڈی ایس پی صاحب کی بھڑکتی آگ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے پڑ گئے۔ تین مہینے بعد میرے تھانے سے اشفاق کی ٹرانسفر ہوگئی اور وہ چوکی انچارج بنا کر برنالہ بھیج دیا گیا۔

ان دنوں برنالہ، رائے کوٹ اور بٹھنڈہ وغیرہ کے علاقے دور دراز علاقے شمار ہوتے تھے۔ زمین کم زرخیز تھی آبادی بھی زیادہ نہیں تھی۔ کئی علاقوں میں تو پولیس نام کی کوئی چیز ہی نہیں پائی جاتی تھی۔ اب انگریز گورنمنٹ کوشش کر رہی تھی کہ ان علاقوں میں قانون کی عملداری قائم کی جائے اور زیادہ سے زیادہ چوکیاں اور تھانے بنائے جائیں۔ اشفاق کو بھی ایک ایسی ہی دور دراز چوکی میں بھیجا گیا تھا۔ میری سمجھ میں یہ بات اس وقت نہیں آئی تھی اور اب بھی نہیں آئی کہ کم تجربہ کار ملازموں کو ایسے تجرباتی اسٹیشنوں پر کیوں بھیج دیا جاتا ہے۔

قریباً ایک ماہ بعد مجھے یہ خبر ملی کہ اشفاق کے کسی یار دوست کو اس کا خط آیا ہے جس سے پتہ چلا ہے کہ اشفاق کا وہاں کے کسی وڈیرے سے پھڈا چل نکلا ہے اور وڈیرے کے کارندوں نے چھپ کر اشفاق پر گولی چلائی ہے جس سے اس کا ایک ہاتھ زخمی ہوگیا ہے۔ یہ اطلاع سن کر مجھے سخت دکھ ہوا اور اس کے ساتھ ہی یہ احساس بھی ہوا کہ اشفاق کو اس چوکی میں بھیج کر سخت ناانصافی کی گئی ہے اور عین ممکن ہے کہ یہ سازش اسی انسپکٹر کی وجہ سے ہوئی ہو جسے اشفاق نے معطل کرایا تھا۔ پولیس میں ایسے کیس بہت عام ہوتے ہیں دشمنیاں چلتی ہیں۔ گروپ بندیاں ہوتی ہیں۔ لوگ دل میں خار رکھتے ہیں۔ بدلہ لینے کے لئے قانونی ہتھکنڈے استعمال ہوتے ہیں۔ اب ایک نوجوان اے ایس آئی کو انچارج بنا کر دور دراز علاقے میں پھینکوا دینا بھی تو قانونی ہتھکنڈا ہی تھا...... میں نے اس معاملے کی مزید سن گن لینے کی کوشش کی تو اس خط تک پہنچ گیا جو اشفاق نے اپنے ایک حوالدار دوست صفدر خان کو لکھا تھا۔ اس خط سے مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ جس شخص سے اشفاق کا پھڈا پڑا ہے اس کا نام بدروک ہے اور وہ ٹمانوں کے خاندان میں سے ہے۔ میں برنالہ کے ٹمانوں کے بارے میں بہت کچھ جانتا تھا۔ وہ بڑے زوردار لوگ تھے۔ علاقے میں ان کی بے شمار زمین تھی اور وہ بڑے دھڑلے سے رہتے تھے۔ 1940ء کے شروع میں ایک کیس کی تفتیش میں مجھے وہاں جانا پڑا تھا اور اس وقت مجھے پتہ چلا تھا کہ اس علاقے میں ٹمانوں کا کس قدر اثر و رسوخ ہے۔

میں ایک قبائلی مجرم کو پکڑنے وہاں گیا تھا۔ اس سلسلے میں پرکاش سنگھ ٹمانہ نے میری بہت مدد کی تھی۔ ٹمانوں کے خاندان میں پرکاش سنگھ ٹمانہ سب سے بزرگ آدمی تھا اور نئی نسل اس کی بہت عزت کرتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ٹمانوں کے کسی آدمی کو اتنی ہمت نہیں ہوئی تھی کہ وہ مجرم کو چھپا سکے۔ اشفاق کا خط پڑھ کر مجھے وہ سارے واقعات یاد آنے لگے اور مجھے دلی رنج ہوا کہ اشفاق جیسا نیا آدمی ٹمانوں سے متھا لگا بیٹھا ہے۔ اشفاق کے دوست حوالدار سے میں نے کافی بات چیت کی۔ اس سے اشفاق کے بارے میں کئی معلومات حاصل ہوئیں۔ اشفاق کی رہائش جیسا کہ میں نے بتایا ہے امرتسر میں تھی۔ وہاں قریب ہی اس کی پھوپھی کا گھر تھا۔ پھوپھی غریب تھی لیکن اشفاق بچپن سے اپنی پھوپھی زاد کو چاہتا تھا۔ اس نے اپنے سارے گھر والوں کی مخالفت مول لے کر پھوپھی زاد سے منگنی کرائی تھی اور امید تھی کہ جلد ہی شادی ہو جائے گی۔ حوالدار نے لڑکی کا نام یاسمین بتایا اور یہ بھی بتایا کہ وہ اشفاق کو بہت چاہتی ہے۔ جب اشفاق جالندھر میں تھا اور حوالدار کے ساتھ سرکاری کوارٹر میں رہتا تھا تو وہ دو دفعہ امرتسر سے اسے چپکے چپکے ملنے آئی تھی۔ جب وہ تیسری مرتبہ آئی تو اشفاق کی ٹرانسفر برنالہ ہو چکی تھی۔ وہ برنالہ جانے کے لئے تیار ہوگئی۔ حوالدار نے اسے سمجھایا کہ وہ دور دراز علاقہ ہے وہاں پہنچنا آسان نہیں۔ آنے جانے میں کم از کم دو دن لگ جائیں گے۔ بہت مشکل سے حوالدار نے اسے واپس بھیجا۔ حوالدار لڑکی کی تعریفیں کرنے لگا اور کہنے لگا کہ وہ بڑی خوبصورت اور تمیزدار لڑکی ہے۔ اشفاق کی جوڑی اس سے خوب سجے گی۔

☆======☆======☆

سات آٹھ روز کی بات ہے، جالندھر کے پولیس ہیڈ کوارٹر میں اعلیٰ افسروں کا اجلاس ہوا۔ اس اجلاس کی صدارت انگریز ڈپٹی کمشنر کر رہا تھا۔ اس اجلاس میں وہ چار ایس ایچ اوز چنے جانے تھے جنہوں نے برنالہ کے اس دور دراز علاقے میں چار تھانوں کا چارج سنبھالنا تھا۔ نہ جانے میرے دل میں کیا آئی کہ میں نے رضا کارانہ طور پر اپنا نام اس چناؤ کے لئے پیش کر دیا۔ اجلاس کے دوران میں نے ڈپٹی صاحب سے کہا۔

''جناب! آپ چاہیں تو مجھے رنگ کوٹ والے تھانے میں تعینات کر سکتے ہیں۔ رنگ کوٹ کے چند بااثر لوگ میرے جاننے والے ہیں۔ چند سال پہلے میں وہاں ایک گرفتاری کے لئے گیا تھا اور مہینہ ڈیڑھ مہینہ وہاں گزارا تھا۔''

ڈپٹی صاحب نے مجھ سے چند سوال کئے جن کے میں نے تسلی بخش جواب دیئے۔ ڈپٹی صاحب کے چہرے سے نظر آنے لگا کہ انہوں نے تجرباتی طور پر مجھے وہاں بھیجنے کا فیصلہ کرلیا

ہے۔ بعدازاں یہ اندازہ درست ثابت ہوا۔ چند روز بعد جب تبدیلیوں کا اعلان ہوا تو میرا نام رنگ کوٹ تھانے کے لئے موجود تھا۔ جالندھر کا یہ تھانہ کچھ ایسا بُرا نہیں تھا۔ میرے سارے ساتھی حیران تھے کہ میں نے رنگ کوٹ میں تبدیلی کیوں کرائی ہے۔ سب اپنے اپنے اندازے قائم کررہے تھے۔ کسی کا دھیان اشفاق کی طرف نہیں گیا جو رنگ کوٹ تھانے کی ایک چوکی میں انچارج تھا اور جس نے خواہ مخواہ اپنی جان خطرے میں ڈال رکھی تھی۔ تبدیلی کہیں نہ کہیں تو ہونا تھی۔ میں نے یہ سوچ کر رنگ کوٹ میں کرائی تھی کہ شاید اس طرح میں اشفاق کی کوئی مدد کرسکوں۔

دو ہفتے بعد میں رنگ کوٹ تھانے کا چارج سنبھالنے برنالہ پہنچ گیا۔ رنگ کوٹ کا تھانہ بہت پرانا تھا اور تھانے کی عمارت اس سے بھی پرانی تھی۔ شاید بہادر شاہ ظفر کے دور کی کوئی حویلی تھی جس کے ایک حصے میں لکڑی کا ایک بہت بڑا ٹال تھا اور دوسرے میں تھانہ قائم تھا۔ اس تھانے کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ فرنیچر ٹوٹا پھوٹا تھا، چھتیں ٹپکتی تھیں۔ دیواروں سے پلستر جھڑتا تھا۔ عملہ کاغذوں میں تو پورا تھا لیکن تھانے میں ایک آدھ سنتری یا حوالدار ہی نظر آتا تھا۔ وہ چوکی جس میں اشفاق کی ڈیوٹی تھی تھانے سے قریباً دس میل کے فاصلے پر تھی۔ کہنے کو تو یہ دس میل کا فاصلہ تھا لیکن بہت دشوار گزار راستہ تھا۔ گھوڑے اور بیل گاڑی کے علاوہ کوئی تیسری سواری وہاں نہیں چلتی تھی۔ بہرحال اشفاق کو میرے آنے کی خبر بہت پہلے ہی ہوچکی تھی۔ اس نے رات پچھلے پہر دس میل کا فاصلہ طے کر کے صبح سویرے میرا استقبال تھانے کے دروازے پر کیا۔ اس کے ایک ہاتھ پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں لیکن چہرہ ہمیشہ کی طرح تروتازہ نظر آتا تھا۔ میرے یہاں آنے پر وہ بے حد خوش تھا اور یہ خوشی اس کی باتوں سے بھی جھلک رہی تھی۔ میرے ساتھ مل کر دو روز میں اس نے خستہ حال تھانے کا حلیہ بدل دیا۔ فرنیچر مرمت ہوا، دیواروں پر سفیدی ہوئی، چھتوں پر مٹی ڈالی گئی۔ حوالات کے ٹوٹے ہوئے دروازے دوبارہ کارآمد بنائے گئے اور تھانے کی پیشانی پر ٹین کا ایک بڑا سا بورڈ لگا دیا گیا جس پر لکھا گیا ”رنگ کوٹ تھانہ۔“ ان میں سے زیادہ تر کام اشفاق نے ہی انجام دیئے۔ جب میں اسے اس تکلف سے منع کرتا تو وہ جھٹ کہتا۔ ”جناب! آپ افسر ہیں۔ میں آپ پر کوئی احسان نہیں کررہا۔ اپنا فرض ادا کررہا ہوں۔“

تیسرے روز شام کو اس نے مجھے اپنا پروگرام بتاتے ہوئے کہا۔ ”جناب! میں نے فیصلہ کیا ہے، آپ کے یہاں آنے کی خوشی میں کل ایک زبردست پارٹی ہوجائے۔ یہاں بھانڈوں کی دو ٹولیاں بہت مشہور ہیں۔ آپس میں ان کا خوب مقابلہ چلتا ہے۔ جس محفل میں

یہ مقابلہ ہوجائے اس میں لوگ ہنس ہنس کر بے ہوش ہوجاتے ہیں۔ رنگ کوٹ کے چوہدری شوبھا سنگھ نے کہا ہے کہ یہ سارا پروگرام اس کی حویلی میں ہوجائے تو زیادہ بہتر ہے۔ علاقے کے معززین بھی آجائیں گے اس طرح ان سے ملاقات ہوجائے گی اور تفریح بھی رہے گی۔“

اشفاق بڑے جوش و خروش سے باتیں کررہا تھا لیکن میری نظریں اس کے زخمی ہاتھ پر جمی تھیں۔ میں نے نہایت سنجیدہ لہجے میں کہا۔

”اشفاق! شاید تمہیں احساس نہیں کہ تم کتنے خطرناک حالات سے گزر رہے ہو...... تم نے حوالدار صفدر خان کو جو خط لکھا تھا وہ میں نے سارا پڑھا تھا۔ تم نے ٹمانوں سے ٹکر لے کر اچھا نہیں کیا۔“

وہ زور سے قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔ اس کے سفید دانت چمکنے لگے اور ٹھوڑی کا گڑھا کچھ اور نمایاں ہوگیا۔ کہنے لگا۔ ”نواز صاحب! معافی چاہتا ہوں آپ وہ باتیں کررہے ہیں جو میری ہونے والی بیوی کیا کرے گی۔ آپ ایسی باتیں کریں گے تو آپ کے ماتحتوں میں کیا حوصلہ رہ جائے گا۔“

میں نے چڑ کر کہا۔ ”اشفاق! زیادہ بہادر بننے کی کوشش نہ کرو۔ تم کچھ نہیں جانتے ہو ان لوگوں کے بارے میں۔ کچھ پتہ نہیں ہے تمہیں۔ تمہیں کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے کسی سے مشورہ کرلینا چاہئے تھا۔“

وہ ہنس کر بولا۔ ”نواز صاحب! آپ کیسی بات کررہے ہیں۔ میری آنکھوں کے سامنے جرم ہورہا ہو اور مجھے یہ بھی پتہ نہ ہو کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ مجرم کو پکڑنے کی بجائے میں افسروں سے مشورہ کرنے دوڑ پڑوں۔ آپ کا یہ خیال غلط ہے کہ میں جلد باز ہوں۔ یہاں آکر میں نے جو کچھ دیکھا ہے۔ میں ہی جانتا ہوں اور جتنا صبر کیا ہے شاید آپ بھی نہ کرسکتے۔ اب آپ ہی بتائیے بدروک سنگھ ٹمانہ کا ملازم کالو اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ مل کر ایک بیمار بوڑھے کے کپڑے پھاڑ رہا تھا اور اسے سربازار الف ننگا کرنا چاہتا تھا۔ میں وردی میں تھا اور موقعہ پر موجود تھا۔ اب اگر میں چپ رہتا یا آنکھ بچا کر پاس سے گزر جاتا تو پھر میرے یہاں آنے کا کیا فائدہ تھا اور اس چوکی کا کیا فائدہ تھا جو یہاں بنائی گئی ہے۔“

میں نے اشفاق سے پوچھا۔ ”کون بوڑھا تھا وہ؟“

اشفاق نے کہا۔ ”اس کا نام سورج سنگھ ہے لیکن سب اسے بابا میدا کہتے ہیں۔ بابا میدا لوہار ہے۔ زمینداروں کے ہل پنجالیاں ٹھیک کرتا ہے۔ ان کے کنوؤں کی مرمت کرتا ہے۔ اس کے بدلے اسے فصل میں سے حصہ دیا جاتا ہے۔ بابے میدے کی ایک جوان شادی شدہ

لڑکی بدروک سنگھ ٹمانہ کے قبضے میں ہے۔ وہ اسے ڈیڑھ برس سے اپنی حویلی میں رکھ کر اس سے زیادتی کر رہا ہے۔ حویلی میں ہی وہ بدروک کے دو جڑواں بچوں کی ماں بھی بن چکی ہے۔ اس بات کا علم سارے گاؤں کو ہے بلکہ پورے علاقے کو ہوگا لیکن کسی نے کوشش کی نہیں کی کہ اس مظلوم عورت کو بدروک سنگھ کے چنگل سے نکالے، نہ ہی بدروک سنگھ اسے چھوڑنے پر آمادہ ہے۔ درحقیقت یہاں ایسی باتوں کو زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی۔ چوہدری، وڈیرے، زمیندار اور ان کے گماشتے آئے دن ایسے کارنامے انجام دیتے رہتے ہیں۔ ظلم سہہ سہہ کر لوگوں کی چمڑی موٹی ہو چکی ہے۔ اب تو وہ یہ سمجھتے ہیں کہ عام لوگوں سے پالتو جانوروں کا سا سلوک کرنا چوہدریوں اور وڈیروں کا حق ہوتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''جناب اشفاق صاحب! آپ کوئی نئی بات نہیں کر رہے۔ ہمارے دور دراز دیہات میں حالات اس سے بھی خراب ہیں۔ یہ سب کچھ وقت کے ساتھ آہستہ آہستہ بدلے گا۔ میرے یا تمہارے بے قرار ہونے سے کچھ حاصل ہونے والا نہیں...... بہرحال تم بابے میدے کے متعلق بتا رہے تھے۔ کیا نام ہے اس کی لڑکی کا؟''

اشفاق نے کہا۔ ''گلاب کور عرف گلاباں۔ اپنی شادی کے چار پانچ ماہ بعد کی بات ہے وہ میکے آئی ہوئی تھی۔ رات کو بدروک ٹمانہ کا ملازم خاص کالو اپنے ساتھیوں کے ساتھ بابے میدے کے مکان میں گھس گیا اور باپ بیٹی کو زبردستی سردار بدروک کی حویلی میں لے گیا۔ پھر بابا میدا تو چند گھنٹے بعد واپس آ گیا لیکن گلاباں اُدھر حویلی میں ہی رہی اور اب اس کو ڈیڑھ برس گزر چکا ہے۔ گلاباں کا خاوند شرمندگی کے مارے منہ چھپا کر کہیں جا چکا ہے اور بابا میدا پاگلوں کی طرح گلیوں میں پھرتا رہتا ہے۔ ہر کسی کو روک کر پوچھتا ہے، تم سردار بدروکا کی حویلی میں گئے تھے، میری گلاباں کیسی ہے؟ لوگ اس کا سوال سن کر خاموشی سے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ جیسے یہ کوئی غور کرنے والی بات ہی نہ ہو۔ کبھی کبھی وہ صدمے سے بالکل آؤٹ ہو جاتا ہے۔ شراب خانے میں جا کر جی بھر کر شراب پیتا ہے، پھر کوئی لکڑی، اینٹ، پتھر یا ایسی ہی کوئی چیز اٹھا کر گاؤں کے چوراہے میں آ جاتا ہے۔ وہ چیز لوگوں کو دکھا کر کہتا ہے، دیکھو یہ بدروکا ہے۔ اس چیز کو زمین پر پھینک دیتا ہے اور بے تحاشا ٹھوکریں مارنے لگتا ہے۔ ساتھ ساتھ چیختا رہتا ہے۔ اُس روز بھی یہی ہوا تھا۔ گاؤں کے چوک میں گردوارے کے سامنے بابا میدا رو پیٹ رہا تھا اوپر سے بدروکا کے کچھ کارندے آ گئے۔ ان میں کالو بھی تھا۔ انہوں نے بابے میدے کو زمین پر گرا کر بُری طرح مارا پیٹا پھر اس کے کپڑے پھاڑنے لگے۔ ستر ڈھانپنے کے لئے بابا زمین پر گٹھڑی ہو گیا وہ اسے ٹھوکریں مار مار کر کھڑا ہونے پر مجبور کرنے

لگے۔ مجھ سے یہ سب کچھ برداشت نہ ہوا۔ میں نے کالو اور اس کے ساتھیوں کا ہاتھ روکا۔ وہ مجھ سے الجھ پڑے۔ میں نے بھی ان میں سے ایک کی ٹھکائی کر دی۔ کالو اور اس کے ساتھی مجھے خونی نظروں سے گھورتے اور دھمکیاں دیتے ہوئے چلے گئے۔ شام کو سردار بدروک ٹمانہ نے مجھے حویلی بلا لیا۔ وہاں کالو اور دوسرے لوگ بھی موجود تھے۔ بدروک ٹمانہ نے اپنی طرف سے بڑا بن کر میری اور کالو کی صلح کرا دی۔ بہرحال میں نے صاف کہہ دیا کہ میری چوکی کی حدوں میں جہاں بھی قانون کی خلاف ورزی نظر آئے گی میں اپنا فرض ضرور ادا کروں گا۔ میری کسی سے ذاتی دشمنی نہیں، یہ قانون اور جرم کی دشمنی ہے...... اس واقعے کے چھ سات روز بعد میں صبح نہر سے نہا کر واپس آ رہا تھا کہ مکئی کے کھیت میں سے کسی نے مجھ پر گولیاں چلائیں۔ میرے اندازے کے مطابق دو رائفلیں تھیں۔ انہوں نے کم از کم آٹھ راؤنڈ فائر کئے، ایک گولی یہاں میری کلائی سے ذرا اوپر لگی۔ میں دوڑ کر ایک کھال کے اندر لیٹ گیا۔ اتنے میں دو تین کھیت مزدور وہاں پہنچ گئے اور انہوں نے میرا حال احوال پوچھا۔ ویسے میں سمجھتا ہوں کہ حملہ آوروں نے صرف مجھے ڈرانے کے لئے فائرنگ کی تھی ورنہ وہ مجھے مارنا چاہتے تو یہ زیادہ مشکل نہیں تھا۔''

میں پوری توجہ سے اشفاق کی روداد سن رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ''اچھا یہ بتاؤ سردار بدروک ٹمانہ لڑکی کے بارے میں کیا کہتا ہے؟''

اشفاق نے غصے سے کہا۔ ''وہ ایک نمبر کا جھوٹا ہے جی۔ صاف مکر جاتا ہے جی۔ کہتا ہے میں تو اس نام کی لڑکی کو جانتا بھی نہیں۔ حالانکہ بچے بچے کو معلوم ہے بابے میدے کی بیٹی اس کی حویلی میں ہے۔''

میں پریشانی کے عالم میں کبھی کبھار سگریٹ پیا کرتا تھا۔ میں نے اشفاق سے ایک سگریٹ لے کر سلگایا۔ چند ایک گہرے کش لینے کے بعد کہا۔

''اشفاق! میں سمجھتا ہوں یہ چوکی تمہارے لئے بالکل مناسب نہیں۔ بہتر ہوگا کہ تم یہاں سے اپنی تبدیلی کرا لو۔''

وہ مسکرایا۔ ''نواز صاحب! میں جانتا ہوں آپ یہ کیوں کہہ رہے ہیں لیکن اگر میں اس چوکی میں کام نہ کر سکا تو پھر سمجھئے ساری زندگی کام نہ کر سکوں گا۔ باقی جہاں تک آپ کے مشوروں کا تعلق ہے میں ان کی قدر کرتا ہوں اور ان پر عمل بھی کروں گا۔ آپ کو مجھ سے زیادہ شکایت جلد بازی کی ہے نا؟ ان شاء اللہ اب یہ جلد بازی نہیں ہوگی۔''

میرے سمجھانے بجھانے کا اشفاق پر کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔ تاہم مجھے اتنی کامیابی ضرور

ہوئی کہ میں نے اسے ''پارٹی'' وغیرہ کے پروگرام سے روک لیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ علاقے کے چوہدریوں اور وڈیروں کو چہرے پر جھوٹی خوشی سجا کر اس پارٹی میں شریک ہونا پڑے۔ ظاہر ہے ہم ان چوہدریوں کے بے بہا اختیارات میں کٹوتی کرنے کے لئے یہاں آئے تھے۔ ان کا ظاہر کچھ بھی کہتا ان کا اندر ہماری طرف سے ٹھنڈا کیسے ہو سکتا تھا۔

☆======☆======☆

دس بارہ روز بعد کی بات ہے۔ دوپہر کے وقت دھوپ نکلی تو میں نے اپنی کرسی تھانے کے صحن میں لگوالی۔ کافی سہانا موسم تھا۔ کوئی خاص کام بھی نہیں تھا۔ صبح صبح دو پارٹیوں میں صلح نامہ کروا کے میں فارغ ہو چکا تھا۔ فارغ وقت میں مَیں عموماً گاؤں کے کسی عام فرد کو بلا کر اس سے گپ شپ شروع کر دیتا تھا۔ اس سے اپنے علاقے کے لوگوں کو سمجھنے کا بہت موقع ملتا ہے۔ اس وقت بھی میں یہی شغل اختیار کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ ایک گھڑسوار سرپٹ گھوڑا دوڑاتا تھانے کے دروازے پر پہنچا۔ وہ اشفاق کی چوکی کا ہیڈ کانسٹیبل تھا۔ راستے کے گرد وغبار سے اس کا چہرہ اور لباس اَٹے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ فوراً گھوڑے سے نیچے اُتر آیا۔ سلیوٹ مار کر تیزی سے بولا۔

''جناب! میں ایک اہم خبر لایا ہوں۔''

اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ خبر بہت اہم ہے اور وہ سب کے سامنے سنانا نہیں چاہتا۔ میں اسے لے کر کمرے میں آ گیا۔ ہیڈ کانسٹیبل نے ہانپتے ہوئے لہجے میں بتایا۔ ''جناب! آپ کو فوراً ہماری چوکی چلنا ہوگا۔ وہاں بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ ٹمانوں نے دھمکی دی ہے کہ وہ چوکی کو آگ لگا دیں گے اور عملے کو قتل کر دیں گے۔''

یہ خبر بے حد پریشان کن تھی۔ میں نے کانسٹیبل سے پوچھا۔ ''ہوا کیا ہے؟''

وہ بولا۔ ''جی کوئی ڈاکیے وغیرہ کا جھگڑا تھا۔ اسی سے بات بڑھ گئی۔ مجھے تو ٹھیک طرح پتہ نہیں۔ کل شام بدروک ٹمانہ کے کارندوں نے ایک تندور پر ہمارے عملے سے ہاتھا پائی کی۔ سپاہی خدا بخش کے سر پر روٹیاں اتارنے والی کھرپی لگی جس سے اس کا سر پھٹ گیا۔ وہ ابھی تک بے ہوش ہے۔ اشفاق صاحب کھرپی مارنے والے کو گرفتار کر کے تھانے لے آئے۔ اس شخص کا نام مُرلی دھر ہے۔ ٹمانوں نے کہا ہمارے آدمی کو چھوڑ دو ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔ اشفاق صاحب نے انکار کر دیا۔ اب وہ دھمکیاں دے رہے ہیں کہ چوکی کو آگ لگا دیں گے۔''

مجھے ٹمانوں پر تو غصہ آنا ہی تھا اشفاق پر بھی آ رہا تھا۔ میرے بار بار سمجھانے کے باوجود

وہ حماقت سے باز نہیں آیا تھا۔ وہ ایک نادان بچے کی طرح ٹمانوں کے بچھائے ہوئے جال میں پھنستا جا رہا تھا۔ میں نے اسی وقت ضروری عملے کو ساتھ لیا اور ہم گھوڑوں پر سوار چوکی روتک کی طرف روانہ ہو گئے۔ ریتلا علاقہ، اونچی نیچی زمین اور دشوار راستہ تھا۔ دس میل کا سفر ہم قریباً تین گھنٹے میں طے کر کے شام کے وقت روتک پہنچے۔ سورج اس وقت دور ایک بڑے سرخ تھال کی طرح سرسوں کے کھیتوں میں چھپ رہا تھا۔ پورے گاؤں پر مردنی سی خاموشی طاری تھی جیسے کوئی طوفان آنے والا ہو۔ ہم سیدھے چوکی پر پہنچے۔ وہاں اشفاق اور اس کا عملہ موجود تھا۔ سب کے چہرے تنے ہوئے تھے۔ اشفاق مجھے لے کر ایک چھوٹے سے کمرے میں آ گیا۔

میں نے اسے کڑی نظروں سے گھور کر پوچھا۔ ''ہاں، کیا بات ہوئی ہے؟''

وہ بولا۔ ''آپ مجھے تو قصوروار سمجھتے ہیں۔ بہتر ہے ٹمانوں سے ہی پوچھ لیں۔''

میں نے جھڑک کر کہا۔ ''یہ چوٹیں کرنے کا وقت نہیں ہے جو بات ہوئی ہے وہ ٹھیک ٹھیک بتاؤ۔''

اشفاق نے ایک خط میرے سامنے رکھ دیا۔ میں نے پوچھا۔ ''یہ کیا ہے؟''

وہ بولا۔ ''پڑھ کر دیکھ لیں۔''

میں نے پڑھا۔ یہ دس پندرہ سطروں کا مختصر سا خط تھا۔ لکھنے والی نے اپنا نام نہیں لکھا تھا۔ بس خط کے آخر میں ''تمہاری'' لکھ دیا تھا۔ اشفاق کے بتائے بغیر ہی میں سمجھ گیا کہ یہ اس کی منگیتر یاسمین کا خط ہے۔ عام سا خط تھا۔ ویسا ہی خط جیسا ایک پیار کرنے والی اپنے محبوب کو لکھ سکتی ہے۔

اشفاق نے کہا۔ ''بس جی یہی خط سردار بدروک سنگھ کے ہاتھ لگ گیا تھا۔ اس نے بات کا بتنگڑ بنا لیا ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''لیکن سردار کے ہاتھ یہ کیسے لگا؟''

''اس ڈاکیے حرامزادے کی حرامزدگی۔ وہ سردار کے خاص چمچوں میں سے ایک ہے۔ میرے خط کھولتا ہے۔ یہ خط اس نے جا کر سردار کو دکھایا۔ سردار نے پنچوں کو اکٹھا کر لیا اور انہیں بھڑکایا کہ یہ دیکھو جو بندہ تم پر تھانیدار بنا کر بھیجا گیا ہے اس کے کچھن کیا ہیں۔ وہ پرائی بہو بیٹیوں سے عشق پیچے لڑاتا ہے۔ اب آپ انصاف کریں، یہ میری منگیتر کا خط ہے اور آپ نے پڑھ کر دیکھ ہی لیا ہے اس میں ایسی کون سی بات لکھی ہے۔ میرا یہ ذاتی خط سردار بدروک اور پورے گاؤں کے سامنے کیوں پہنچا۔ کیوں سب کے سامنے میری تذلیل کی گئی؟ میں

یہاں تھانیدار بن کر آیا ہوں اگر میں چوہدریوں سے اپنی عزت محفوظ نہیں رکھ سکتا تو دوسروں کی عزت کیا خاک بچاؤں گا۔ میں ڈاکیے سے بازپُرس کرنے اس کے گھر پہنچا تو پتہ چلا وہ حویلی میں ہے۔ میں حویلی چلا گیا۔ وہاں محفل جمی ہوئی تھی۔ میں نے ڈاکیے سے بات کرنی چاہی تو سردار بدروک سنگھ خود بیچ میں کود پڑا۔ سردار سے تُو تُو مَیں مَیں ہوگئی۔ اس نے مجھ پر لوفر پن کا الزام لگایا تو میں بھی چپ نہ رہ سکا۔ میں نے کہا لوفری اور بے حیائی کا پتہ تو اس وقت چلے گا جب بابے میدے کی گمشدہ بیٹی برآمد ہوگی اور وہ عدالت میں بتائے گی کہ اب تک وہ کس کس کے ظلم سہتی رہی ہے۔ میں اور بھی بہت کچھ کہہ سکتا تھا اور میں جو کچھ کہتا اس میں سے کسی بات کا جواب سردار بدروک کے پاس نہیں تھا۔ اس لئے ڈاکیے سے بات کئے بغیر واپس آ گیا۔ اسی روز شام کو میری چوکی کے چار سپاہی کھانا لینے گاؤں کے تندور پر گئے تو ٹمانوں کے کارندے وہاں آ گئے۔ انہوں نے چھیڑ چھاڑ شروع کی تو لڑائی ہوگئی۔ ایک شخص مُرلی دھر نے تندور کی آہنی سیخ سپاہی خدا بخش کے سر میں ماری وہ زخم کھا کر گر گیا۔ میرے ایک سپاہی کے پاس رائفل تھی۔ اس نے ہوا میں فائرنگ کی تو بدروک سنگھ کے کارندے بھاگ گئے۔ سپاہی بے ہوش خدا بخش کو اٹھا کر تھانے لائے۔ میں نے جا کر مُرلی دھر کو اس کے گھر سے گرفتار کر لیا۔ وہ اس وقت حوالات میں ہے۔ سردار بدروک سنگھ خود تو برنالہ گیا ہوا ہے اس کے کارندے کالو کے ساتھ دو تین دفعہ میرے پاس آ چکے ہیں۔ وہ دھمکیاں دے رہے ہیں کہ میں مُرلی دھر کو چھوڑ دوں ورنہ وہ زبردستی چھڑا لیں گے۔ صبح ایک مخبر نے آ کر مجھے بتایا ہے کہ وہ چوکی کو آگ لگانے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔"

اشفاق کی زبانی مجھے یہ سن کر قدرے اطمینان ہوا کہ سردار بدروک گاؤں میں نہیں ہے اور نہ ہی اس نے چوکی پر چڑھائی کرنے کی دھمکی دی ہے۔ یہ سب کچھ اس کے کارندے کر رہے تھے۔ ان کی باتوں کی کچھ زیادہ اہمیت نہیں تھی۔ کیونکہ میں جانتا تھا وہ بدروک سنگھ کی اجازت کے بغیر کچھ نہیں کریں گے۔ صرف تڑیاں لگائیں گے اور بدروک سنگھ ایسا احمق نہیں تھا کہ وہ اپنے کارندوں کو چوکی پر چڑھائی کرنے کی اجازت دے کر پولیس سے براہِ راست ٹکر لے لیتا۔ یہ بڑے گہرے اور کھچرے لوگ تھے۔ کھچرے نہ ہوتے تو سردار نہ کہلاتے اور نہ اتنی زمینوں کے مالک ہوتے۔ انہیں سب پتہ ہے کہاں جوش دکھانا ہے اور کہاں "گجی مار" مارنی ہے۔

میں نے اشفاق سے کہا۔ "دیکھو اشفاق! یہ کہاوت جتنی پرانی ہے اتنی ہی سچی ہے کہ دریا میں رہ کر مگر مچھ سے بیر نہیں رکھنا چاہئے۔ تم جو کچھ کر رہے ہو بالکل اُلٹ ہے۔ میں نہیں

سمجھتا کہ تم اس طرح محکمے کے لئے کوئی نیک نامی کماؤ گے۔"

اشفاق نے لاپرواہی سے کہا۔ "نواز صاحب! جب آپ ایسی بات کرتے ہیں تو مجھے افسوس ہوتا ہے، کیونکہ میں آپ کو دوسرے پولیس والوں سے مختلف سمجھتا ہوں۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میں جھوٹا ہوں؟ اگر اس بات کا جواب نفی میں ہے تو پھر میں کسی ٹمانے، ٹھاکر، رائے یا چوہدری سے کیوں ڈروں۔ کیوں اپنی گردن جھکا کر رکھوں اور قانون شکنوں سے نظر بچا کر گزر جاؤں۔ نہیں میں ایسا نہیں کر سکتا۔ زیادہ سے زیادہ میری پیٹی اُتر جائے گی، میری جان چلی جائے گی لیکن میں پیچھے نہیں ہٹوں گا۔ میرے دل میں جو تھوڑا بہت خوف تھا، اب اللہ کے فضل سے وہ بھی دور ہو گیا ہے۔ میں اب ٹمانوں کو بتا دوں گا کہ قانون سے کیسے ٹکر لی جاتی ہے۔ آپ دیکھ لینا، اب یا ان کی خرمستیاں رہیں گی یا میں رہوں گا۔"

جوش سے اشفاق کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ مجھے اس کی دلیری نے اور بھی پریشان کر دیا۔

اتنے میں اشفاق کا ایک مخبر چوکی آ گیا۔ اس نے علیحدگی میں جا کر اشفاق کو کوئی اطلاع دی۔ اشفاق نے مجھے آ کر بتایا کہ سردار بدروک شہر سے واپس آ گیا ہے۔ وہ اس وقت حویلی میں ہے اور وہاں کوئی کھچڑی پک رہی ہے۔

میں نے اشفاق کو سمجھا بجھا کر کچھ ٹھنڈا کیا اور اسے سختی سے ہدایت کی کہ وہ میری اجازت کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھائے گا۔ اس کے بعد میں فوراً سردار بدروک سے ملنے حویلی روانہ ہوا۔ یہ حویلی گاؤں کے عین وسط میں واقع تھی۔ حویلی کے چاروں طرف باغ تھا۔ حویلی کی بیرونی دیواریں کافی اونچی بنائی گئی تھیں۔ میں پہلے بھی اس حویلی میں آ چکا تھا۔ اس وقت سردار بدروک سنگھ کا باپ پرکاش سنگھ زندہ تھا اور جیسا کہ میں نے بتایا ہے اس نے ایک مجرم کی گرفتاری میں میری مدد کی تھی۔

حویلی کے بڑے دروازے پر دو مسلح پہرے داروں نے میرا استقبال کیا۔ نظروں ہی نظروں میں میری جامہ تلاشی لی اور مجھے لے کر سردار بدروک کی بیٹھک کی طرف چل دیئے۔ یہ ایک بہت بڑی بیٹھک تھی۔ نئے اور پرانے اسلحے سے سجی ہوئی تھی۔ دیواروں پر بڑی بڑی تصویریں تھیں جن میں ٹمانوں کے بھوری آنکھوں والے سرخ و سپید بزرگ نظر آ رہے تھے۔ اس سارے خانوادے کی آنکھیں بھوری اور چہرے بارعب تھے۔ میں بیٹھک میں پہنچا تو سردار بدروک گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے ایک بڑی چارپائی پر بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے پہچان لیا اور اٹھ کر مصافحہ کیا۔ اس کے کارندے اور دوسرے حاضرین گہری نظروں سے مجھے دیکھنے لگے۔ جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں میرا وزن اور قد کاٹھ پرکھ رہے ہوں۔ میں نے اپنا

تعارف کرانا چاہا تو بدروک سنگھ نے مسکرا کر کہا۔

''میں تم کو جانتا ہوں تھانیدار صاحب۔ تم باپو جی کے پاس چار پانچ ہفتے رہ کر گئے تھے۔ مجھے سب یاد ہے۔ میرا خیال ہے...... آج کل تم رنگ کوٹ کے تھانے میں آ گئے ہو۔''

میں نے کہا۔ ''سردار بدروک تمہاری اطلاع بالکل صحیح ہے۔''

رسمی گفتگو کے بعد سردار بدروک نے سب کو بیٹھک سے باہر بھیج دیا۔ میں اور بدروک اکیلے رہ گئے۔ سردار بدروک نے مونچھوں کو بل دے کر کہا۔

''کیا بات ہے تھانیدار۔ یہ لونڈا تمہارے قابو میں نہیں ہے۔ اسے کچھ سمجھاؤ کہ عقل کو ہاتھ مارے۔ ابھی اس کی ماں کو اس کی ضرورت ہوگی۔''

سردار بدروک کے دھیمے سے لہجے میں بے پناہ سفا کی چھپی ہوئی تھی۔ میری ریڑھ کی ہڈی میں سردی کی لہر دوڑ گئی۔ میں جانتا تھا سردار بدروک وہ کچھ کر سکتا ہے جس کا اشفاق نے تصور بھی نہ کیا ہوگا۔ چار سال پہلے یہاں اپنے قیام کے دوران میں نے ٹمانوں کی درندگی کے بے مثال واقعات دیکھے تھے۔ میں نے بظاہر مسکراتے ہوئے کہا۔

''سردار بدروکا! زیادتی تو دونوں طرف سے ہوئی ہے۔ تمہارے آدمیوں کو باوردی سپاہیوں پر حملہ نہیں کرنا چاہئے تھا۔''

بدروک سنگھ زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ''باوردی کی بات اچھی کی ہے تم نے۔ اب باوردی پولیس والے ہماری عزت اتار کر ہاتھ میں پکڑا دیں تو ہم خاموش رہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے جان جی۔''

میں نے محسوس کیا کہ بدروک سنگھ کے لہجے میں بے شمار سنگین دھمکیاں چھپی ہوئی ہیں اور ممکن ہے کہ ابھی تھوڑی دیر میں کوئی سخت ناخوشگوار واقعہ پیش آ جائے۔ میں نے چہرے پر زبردستی مسکراہٹ لا کر کہا۔

''سردار بدروکا! تم نے بھی جوانی گزاری ہے۔ اٹھتی عمر ہو تو بڑا جوش ولولہ ہوتا ہے۔ آدمی کام پہلے کرتا ہے سوچتا بعد میں ہے اشفاق بھی بچہ ہے۔ ابھی اس کام کا اسے کوئی تجربہ نہیں۔ میں نے اسے سمجھایا بجھایا ہے۔ وہ ابھی تھوڑی دیر میں تمہارے بندے کو چھوڑ دے گا۔ تم بھی ذرا اپنے بندوں کو بُرا بھلا کہہ دینا۔ کچھ بھی ہے عام لوگوں کے سامنے تو وردی کا تھوڑا بہت احترام ہونا چاہئے۔''

بدروکا ہٹ دھرمی سے بولا۔ ''میرے بندوں نے کیا کیا ہے جو میں انہیں بُرا بھلا کہوں...... باقی اگر تمہارا حکم ہے تو ابھی الٹا لٹکا کر ان کی چمڑیاں اتار دیتا ہوں۔''

میں نے بدروکا کے طنزیہ لہجے کو بہت مشکل سے برداشت کیا اور اپنے چہرے کی مسکراہٹ برقرار رکھنے میں کامیاب رہا۔ کچھ دیر کی بے تکلف گفتگو کے بعد میں نے بات چیت کا رخ بابے میدے اور اس کے پاگل پن کی طرف موڑ دیا۔ بدروکا سنگھ تاڑ گیا کہ میں اس سے اصل حقیقت معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ بولا۔

''تم پکے تھانیدار ہو جان جی...... بات پوچھنے کا ڈھنگ جانتے ہو، بہرحال میں تمہیں بتا دوں گا لیکن ابھی نہیں، پہلے کھانا کھانا ہوگا۔''

ٹمانوں کی حویلی میں کھانا بڑا شاندار ہوتا تھا۔ ہر کھانے پر دعوت کا گمان ہوتا تھا۔ کھانا وغیرہ کھا کر ہم ایک علیحدہ کمرے میں جا بیٹھے۔ سردار بدروکا نے اوپر تلے کئی ڈکار لینے کے بعد کہا۔

''جان جی! میں تم سے کچھ چھپانا نہیں چاہتا۔ سچی بات یہ ہے کہ بابے میدے کی لڑکی میری ہی حویلی میں ہے۔''

اُس کا فقرہ میرے سر پر بم کا دھماکہ ثابت ہوا۔ کتنی آسانی اور کتنے اعتماد سے بدروکا ایک سنگین جرم کا اقرار کر رہا تھا۔ بہرحال پہلے فقرے کے بعد اس نے جو کچھ کہا اس سے وہ پھر بات پر پردہ ڈال گیا۔ کہنے لگا۔ ''مگر نہ میں نے اس لڑکی کو اغوا کیا ہے اور نہ میری حویلی میں اس سے کوئی زیادتی شیادتی ہوئی ہے۔ اگر کسی نے تمہیں یہ بتایا ہے تو بالکل غلط بتایا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ گلاباں کا اپنے خاوند گروسنگھ سے لڑائی جھگڑا رہتا تھا۔ یہ اپنے باپ کی کچھ زیادہ لاڈلی تھی۔ دوسرے دن جا کر میکے بیٹھ جاتی تھی۔ اس بیچارے کو منا منا کر لانا پڑتا تھا۔ آخر گروسنگھ نے گلاباں کو منع کر دیا کہ وہ آئندہ اپنے باپ کے گھر نہیں جائے گی۔ ورنہ ان کا رشتہ ختم ہو جائے گا۔ گلاباں اس دھمکی کے بعد ٹھیک ہو گئی۔ کچھ دن بعد گروسنگھ نے برنالہ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ شہر میں کام کر کے اپنی مالی حالت ٹھیک کرنا چاہتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ گلاباں کو ماں باپ کے گھر میں بڑا سکھ ملا ہے۔ وہ اسے اپنے گھر میں بھی سکھی رکھنا چاہتا تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ وہ گلاباں کو اپنے ساتھ برنالہ نہیں لے جا سکتا تھا، نہ ہی وہ چاہتا تھا کہ گلاباں اپنے میکے میں رہے۔ سوچ سوچ کر اس نے مجھ سے ذکر کیا۔ وہ ہمارے خاندان کا پرانا نوکر ہے۔ اس کے باپ کی ساری عمر بھی ہماری حویلی میں گزری تھی۔ ایسے جدی پشتی نوکروں کا خیال تو رکھنا ہی پڑتا ہے۔ میں نے کہا کہ اگر وہ چاہے تو گلاباں کو ہماری حویلی میں چھوڑ جائے۔ یہاں وہ گھر کے کام کاج میں ہاتھ بٹا دیا کرے گی اور ویسے بھی حفاظت سے رہے گی۔ وہ خوش ہو گیا۔ بس اتنی سی بات ہے جس کا کچھ لوگوں نے بتنگڑ بنا رکھا ہے۔ پیٹھ

پیچھے بات کرنا کوئی بہادری نہیں ہوتی جان جی۔ کوئی کھوتے کا پتر میرے منہ پر یہ بات کرے تو میں اسے جواب بھی دوں۔ گرو جانتا ہے، گلاباں یہاں اپنی اور اپنے پتی کی مرضی سے رہ رہی ہے۔ اگر تم چاہو تو میں اسے تمہارے منہ پر کرا سکتا ہوں۔''

میں نے کہا۔''اور وہ گرو سنگھ اب کہاں ہے؟''

بدروک سنگھ بولا۔''امرتسر میں ہی کہیں ہے۔ سنا ہے آٹے کی کسی مل میں کام کرتا ہے۔''

میں نے کہا۔''اب وہ آتا کیوں نہیں؟''

بدروک نے کہا۔''جان جی! یہ اس سے پوچھو کہ کیوں نہیں آتا۔ میرا خیال ہے وہ ضد میں آیا ہوا ہے۔ سوچتا ہے کہ اسی وقت گاؤں جائے گا جب جیب میں چار پیسے ہوں گے۔''

بدروکا کی بات کچھ دل کو لگتی تھی۔ میں نے مسکرا کر کہا۔''اور سردار جی! یہ جڑواں بچے کس کے ہیں؟''

وہ سنجیدگی سے بولا۔''بچوں کے باپ کے ہیں اور کس کے ہیں۔'' پھر قہقہہ لگا کر کہنے لگا۔''میرا خیال ہے تھانیدار! ابھی تیری تسلی نہیں ہوئی ہے۔ ٹھہر جا، میں بلاتا ہوں اُس کو۔''

میرے روکنے سے پہلے ہی وہ اٹھ کر اندر چلا گیا۔ قریباً پانچ منٹ بعد ایک عورت اُس کے ساتھ اندر داخل ہوئی۔ اُس نے ٹاسے کی بڑی سی چادر میں منہ سر لپیٹ رکھا تھا۔ گود میں دو تین ماہ کا بچہ ریں ریں کر رہا تھا۔ وہ اندر آ کر موڑھے پر بیٹھ گئی۔ بدروکا سنگھ بے تکلفی سے بولا۔

''لے پوچھ لے اس سے جو پوچھنا ہے۔'' اور خود باہر چلا گیا۔

میں چند لمحے خاموش بیٹھا رہا۔ پھر عورت سے پوچھا۔''تمہارا نام؟''

''گلاباں۔'' اس نے جھجک کر کہا۔

''تمہارے پتی کا نام گرو سنگھ ہے؟'' چند لمحے بعد اس نے اقرار میں سر ہلا دیا۔

میں نے پوچھا۔''اب گرو سنگھ کہاں ہے؟''

وہ بولی۔''معلوم نہیں۔ شہر کام کرنے گئے ہوئے ہیں۔''

''اس نے خود تمہیں یہاں چھوڑا تھا؟''

''جی ہاں۔''

''تم اپنی مرضی سے یہاں رہ رہی ہو؟''

''جی ہاں۔''

''کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟''

''جی نہیں۔''

''تمہارا باپ گلیوں میں تمہیں ڈھونڈتا پھرتا ہے۔ اُس سے ملنا نہیں چاہتی ہو؟''

تھوڑی دیر ٹاسے کی چادر لرزتی رہی، پھر آواز آئی۔''نہیں، میرے پتی کا حکم نہیں ہے۔''

میں نے ذرا آگے جھک کر سرگوشی میں کہا۔''بی بی! میں پولیس انسپکٹر ہوں۔ اگر کوئی بھی مسئلہ ہے تو مجھے بتا دو۔ میں یہاں تمہاری مدد کے لئے آیا ہوں۔''

ٹاسے کی چادر میں جنبش پیدا ہوئی۔ ایک خوبصورت گندمی چہرہ میری طرف گھوما۔ ستواں ناک میں چاندی کا کوکا چمک رہا تھا۔ دو حیران نظروں نے میری طرف دیکھا۔ جیسے پتہ ہی نہ ہو۔ پولیس کس کو کہتے ہیں اور پولیس والے کیسے ہوتے ہیں۔ یہ حیرانی ٹھیک ہی تو تھی۔ اس علاقے تک پولیس پہنچی ہی کہاں تھی۔ جو کچھ تھے سردار تھے اور چوہدری تھے۔

میں نے کہا۔''چپ کیوں ہو۔ بتاؤ...... ڈرنے کی ضرورت نہیں۔''

اس نے چہرہ پھر گھونگھٹ میں چھپا لیا اور زور سے دائیں بائیں سر ہلا کر بولی۔''نہیں، مجھے یہاں کوئی تنگی نہیں ہے پتہ نہیں آپ ایسی باتیں کیوں پوچھ رہے ہیں۔''

میں نے چند سوال اور کئے جن کے گلاباں نے مختصر جواب دیئے۔ اتنے میں سردار بدروک اندر آ گیا۔ سوال جواب کا سلسلہ ختم ہو گیا۔

بدروک سنگھ کی حویلی سے میں کئی الجھنیں لے کر واپس آیا۔ جس وقت میں چوکی پہنچا رات کے آٹھ بج چکے تھے۔ جاتے ساتھ ہی میں نے اشفاق کو حکم دیا کہ وہ حوالاتی کو چھوڑ دے۔ اشفاق نے پس و پیش سے کام لینا چاہا لیکن میں نے اس کی ایک نہیں چلنے دی۔ حوالاتی چھوٹ گیا تو میں اشفاق کو لے کر دوسرے کمرے میں جا بیٹھا۔ میں نے اسے سمجھایا کہ اب اس کا یہاں رہنا کسی طور ٹھیک نہیں۔ بہتر ہے وہ ایک دو مہینے کی چھٹی لے لے اور پھر تبدیلی کروا لے۔

وہ دوٹوک الفاظ میں بولا۔''یہ نہیں ہو سکتا نواز صاحب! ٹسل ہو گئی ہے تو ہو گئی ہے۔ جب تک میں اس چوکی پر ہوں، نہ چھٹی لوں گا اور نہ تبدیلی کرواؤں گا۔''

مجھے اس پر غصہ تو بہت آیا لیکن میں کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ میں نے کہا۔''اشفاقے! تُو اپنی ہمت سے بڑھ کر بات کر رہا ہے۔ تجھے یہاں کے حالات کا کچھ پتہ نہیں۔ نہ ہی تجھے ابھی تفتیش کرنا آتی ہے۔ تفتیش کرتے ہوئے ہر پہلو سامنے رکھنا ہوتا ہے۔ تُو جس لڑکی کو مغویہ کہہ

رہا ہے۔ ہوسکتا ہے وہ اپنی مرضی سے ٹمانوں کی حویلی میں ہو۔ کیا تُو اس سے ملا ہے؟''
وہ بولا۔ ''نہیں۔''

میں نے کہا۔ ''میں مل کے آرہا ہوں اور اس نے بیان دیا ہے کہ اس کا پتی خود اسے حویلی میں چھوڑ کر گیا ہے۔''

اشفاق کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ وہ نفی میں سر ہلا کر بولا۔ ''ہرگز نہیں، بالکل غلط۔ یہ بیان اگر گلاباں نے دیا ہے تو جان کے خوف سے دیا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''اگر جان کے خوف سے وہ یہی بیان عدالت میں دے ڈالے تو تُو کیا کرلے گا؟'' وہ خاموش ہوگیا۔ میں نے کہا۔ ''بھلے مانس! پتھر سے سر پھوڑنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ یہاں کوئی تجھے ٹمانوں کے بارے میں کچھ نہیں بتائے گا۔ سب کو خوف کا سانپ سونگھا ہوا ہے۔ اگر تُو کچھ جاننا ہی چاہتا ہے تو کچھ صبر کر، بدروک سنگھ نے مجھے گلاباں کے شوہر کا کچھ اتا پتا بتایا ہے۔ وہ امرتسر کی کسی فلور مل میں کام کرتا ہے۔ میں اس کا کھوج لگواتا ہوں۔ وہی بدروک سنگھ کے بیان کی تصدیق کرسکتا ہے۔''

ابھی ہماری گفتگو جاری تھی کہ برآمدے میں لاٹھی کی ٹھک ٹھک سنائی دی۔ کوئی ضعیف شخص کھانستا اور لاٹھی ٹیکتا آرہا تھا۔ اشفاق نے کہا۔

''یہ بابا میدا آرہا ہے۔ وہ اکثر گھومتا ہوا آجاتا ہے۔''

چند لمحے بعد ایک بوڑھا سکھ بغیر اجازت لئے اندر داخل ہوا۔ اس کا لباس میلا کچیلا تھا لیکن وہ دیکھنے میں بالکل ہوش مند نظر آتا تھا۔ شاید پاگل پن کا دورہ اس پر کبھی کبھار ہی پڑتا تھا۔ وہ سلام کرکے اطمینان سے ہمارے پاس بیٹھ گیا۔ رسمی تعارف کے بعد میں نے بابے میدے سے پوچھا۔

''ایک بات بتاؤ بابا! تم کہتے ہو کہ تمہاری بیٹی کو سردار بدروک نے اغوا کرایا ہے، جب کہ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ اپنے پتی کی مرضی سے وہاں ٹھہری ہوئی ہے۔ یہ بھی پتہ چلا ہے کہ تم میاں بیوی نے بیٹی کے گھر میں لڑائی ڈال رکھی تھی جس کی وجہ سے تمہارے داماد نے تم سے قطع تعلق کرلیا تھا۔ اس لئے شہر جاتے جاتے وہ بیوی کو ٹمانوں کی حویلی میں ٹھہرا گیا۔''

بابا عجیب سے انداز میں ہنسنے لگا اور اس گھڑی مجھے محسوس ہوا کہ بابے کا دماغ واقعی کچھ ہلا ہوا ہے۔ وہ میری آنکھوں میں جھانک کر بولا۔ ''پتر جی! جنہاں گھر دانے اونہاں دے کملے وی سیانے۔ غریب کی بات کون سنتا ہے اپنے داماد سے میرا جھگڑا ضرور تھا لیکن ایسے چھوٹے موٹے جھگڑے کہاں نہیں ہوتے۔ میرا داماد پاگل نہیں تھا کہ اپنی نئی نویلی پتنی کو چیر پھاڑ کرنے

والے درندوں کی حویلی میں چھوڑ جاتا۔ وہ کوئی پاگل تھا بھلا؟ اچھا خاصا سیانا بندہ تھا۔ اب پاگل ہوگیا ہو تو پتہ نہیں۔ رب جانے منہ چھپا کر کہاں چلا گیا ہے۔ کبھی شکل بھی دکھائے گا کہ نہیں۔'' بوڑھا ایک دم آبدیدہ ہوگیا۔ پھر اٹھ کر دروازے سے باہر نکل گیا۔ میں نے چوکی کے برآمدے میں اس کی سسکیاں سنیں۔ وہ ایک ہیڈ کانسٹیبل سے کچھ پوچھ رہا تھا۔ ''تم سردار بدروک سنگھ کی حویلی میں گئے تھے، میری گلاباں کیسی ہے؟''

☆======☆======☆

رنگ کوٹ کے تھانے واپس پہنچتے ہی میں نے اپنے ایک ہوشیار حوالدار کو اس کام پر لگا دیا کہ وہ امرتسر جائے اور وہاں آٹے کی مل میں کام کرنے والے گروسنگھ نامی شخص کو ڈھونڈے۔ میں نے حوالدار کو گروسنگھ کی ایک تصویر بھی دے دی۔ یہ تصویر مجھے بابے میدے کی بیوی سے حاصل ہوئی تھی۔ اس تصویر میں گروسنگھ کے ساتھ اس کی خوبرو بیوی گلاباں بھی تھی۔

حوالدار نے میری توقع سے زیادہ تیزی دکھائی اور صرف پانچ روز بعد واپس آکر مجھے اطلاع دی کہ گروسنگھ کا سراغ مل گیا ہے۔ وہ پران فلور مل میں بطور سٹور کیپر ملازم ہے اور اپنے ایک دوست کی کھولی میں رہتا ہے۔ اس کی کھولی کا مکمل پتہ بھی حوالدار کے پاس تھا۔ میں اس کارکردگی پر حوالدار سے بہت خوش ہوا۔ اب میری خواہش تھی کہ پہلی فرصت میں اس شخص سے ملاقات کروں...... چند روز بعد مجھے ضلع جالندھر جانا پڑا تو میں نے وہاں سے امرتسر کا رخ کرلیا۔ دوپہر کے بعد میں امرتسر پہنچا۔ بس سٹینڈ سے ڈھونڈتا ڈھونڈتا فلور مل میں پہنچ گیا۔ میں سادہ لباس میں تھا۔ یہ بھی ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا کہ خاص طور پر گروسنگھ سے ملنے آیا ہوں۔ میں یونہی فلور مل کے آس پاس منڈلانے لگا۔ مل میں چھٹی ہوئی اور میں غور سے چہروں کو دیکھنے لگا۔ جلد ہی مجھے گروسنگھ نظر آیا۔ وہ ایک دوست کی بانہوں میں بانہیں ڈالے باتیں کرتا چلا آرہا تھا۔ میں نے اسے روک کر کہا۔

''تمہارا نام گروسنگھ تو نہیں؟''

وہ ذرا سا چونکا پھر سنبھل کر بولا۔ ''ہاں...... کیا کام ہے آپ کو؟''

میں نے کہا۔ ''تم برنالہ میں روتک گاؤں کے رہنے والے ہونا؟'' اس نے ایک بار پھر ''ہاں'' میں جواب دیا۔ میں نے کہا۔ ''میرا نام نواز ہے۔ روتک میں بابے میدے کا بڑا بیٹا جو پچھلے سال نہر میں ڈوب گیا تھا میرا یار بیلی تھا۔ ایک دفعہ روتک گیا تو بابے میدے کے گھر تمہیں دیکھا تھا تمہاری شادی بابے کی بیٹی سے ہوئی تھی ناں؟'' وہ اثبات میں سر ہلانے لگا۔

مجھ سے مل کر اسے کوئی خاص مسرت نہیں ہوئی تھی لیکن میں اس کا پیچھا چھوڑنے والا کہاں تھا۔ میں اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا اور بات سے بات نکالنے لگا۔ مجبوراً گروسنگھ کو مجھے چائے کی دعوت دینا پڑی۔ ایک فٹ پاتھیے ٹی سٹال پر ہم لکڑی کے سٹولوں پر بیٹھ گئے۔ میں نے گروسنگھ سے گھریلو باتیں شروع کر دیں۔ جلد ہی میں اسے اپنے ڈھب پر لے آیا۔ اس نے بتایا کہ وہ کام کرنے کے لئے شہر آیا ہوا ہے۔ ساس سسر سے اس کا جھگڑا چل رہا تھا۔ اس لئے بیوی کو اس نے ٹمانوں کی حویلی میں سردارنی کے پاس چھوڑ دیا ہے۔ وہ وہاں بڑے سکون سے رہتی ہے۔ جلد ہی وہ اپنا کاروبار شروع کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ پھر بیوی کو یہاں شہر میں لے آئے گا۔

گروسنگھ کافی دیر بولتا رہا۔ اس نے جو باتیں کیں ان سے بدروک سنگھ کے بیان کی تصدیق ہوتی تھی اور گاؤں والوں کا یہ خیال غلط ثابت ہوتا تھا کہ بابے میدے کی بیٹی کو زبردستی حویلی میں رکھا گیا ہے اور اس کا شوہر شرم سے منہ چھپا کر کہیں نکل گیا ہے۔ میں نے گروسنگھ سے اور بھی کئی سوال کئے جن کے اس نے بڑے مناسب جواب دیئے لیکن پتہ نہیں کیا بات تھی۔ اس پر مجھے کچھ شبہ سا ہونے لگا۔ جیسے وہ بناوٹی باتیں کر رہا ہے میرے شک کی کوئی خاص وجہ بھی نہیں تھی۔ شاید کبھی کبھی ایک پولیس والے کی آنکھ بغیر وجہ کے بھی شک کرنے لگتی ہے۔ میں نے خود کو بے ٹھکانہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ کسی طرح گروسنگھ کی کھولی میں رات گزارنے اور باتیں کرنے کا موقع مل جائے لیکن وہ بڑا کورا ثابت ہوا۔ اس نے خالی چائے پلا کر مجھ سے چھٹکارا حاصل کر لیا۔ اب ایک ہی طریقہ تھا میں خود کو اس پر ظاہر کروں اور پوچھ گچھ کے لئے قریبی تھانے لے جاؤں لیکن اس میں بھی کئی نقصان تھے اور سب سے بڑا نقصان یہ تھا کہ اگر ٹمانوں کو میری پوچھ گچھ کا پتہ چل جاتا تو وہ میری طرف سے بالکل بدگمان ہو جاتے۔

سوچ بچار کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ فی الحال برنالہ واپس چلا جاؤں اور جب اس مسئلے کا کوئی حل ذہن میں آجائے تو پھر عملی قدم اٹھاؤں۔

☆=====☆=====☆

چار پانچ روز کی بات ہے۔ میں اپنے رنگ کوٹ کے تھانے میں موجود تھا۔ رات قریباً دس بجے کا وقت تھا۔ سردی بہت زیادہ تھی۔ میری رہائش تھانے کے اندر ہی تھی۔ پرانی طرز کا اونچی چھت والا وسیع و عریض کمرہ تھا۔ ایک کمرے میں نانک چندی اینٹوں کا بنا ہوا آتش دان تھا۔ آتش دان کے بغیر ایسے کمرے بہت ٹھنڈے رہتے ہیں۔ میں نے چارپائی آتش دان

کے پاس ہی بچھا رکھی تھی۔ ابھی میں اونگھ ہی رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے لحاف سے نکل کر دروازہ کھولا۔ سامنے اشفاق کھڑا تھا۔ وہ وردی میں تھا۔ اس کے ساتھ ایک دوسرا شخص تھا، اس شخص نے کمبل لپیٹ رکھا تھا۔ ہاتھوں میں ہتھکڑی تھی۔ ہتھکڑی کی زنجیر کا سرا اشفاق کے ہاتھ میں تھا۔ کمبل والے کا چہرہ روشنی میں آیا تو میں بُری طرح چونک گیا۔ وہ گروسنگھ تھا۔ گروسنگھ بھی مجھے پہچان کر حیران رہ گیا۔ وہ حیرت سے کبھی مجھے اور کبھی میری وردی کو دیکھتا تھا۔

میں نے گھبرا کر پوچھا۔ ”یہ کیا ہے؟“

وہ بولا۔ ”یہ سردار بدروک کے جرم کا ثبوت ہے نواز صاحب۔“

وہ گروسنگھ کو کھینچ کر اندر لے آیا۔ میں نے دیکھا گروسنگھ کے چہرے پر چوٹوں کے نشان ہیں۔ لگتا تھا اشفاق نے اس کی اچھی خاصی ٹھکائی کی ہے...... میں جلد ہی معاملے کی تہہ تک پہنچ گیا۔ اشفاق کو کسی طرح گروسنگھ کے ٹھکانے کا پتہ چل گیا تھا۔ اس نے گروسنگھ کو جا پکڑا۔ جو کام میں اپنے طریقے سے کرنا چاہتا تھا وہ اشفاق نے اپنے طریقے سے کر لیا تھا۔ (جیسا کہ بعد میں پتہ چلا اشفاق کو گروسنگھ کا پتہ بتانے والا میرا بڑبولا حوالدار ہی تھا۔ اسے اس بات پر کئی بار سخت جھاڑ کھانا پڑی) میں نے اشفاق سے چند سوالات کئے، جن کے جوابات سے پتہ چلا کہ اشفاق نے گروسنگھ کو کل دوپہر امرتسر سے گرفتار کیا تھا۔ امرتسر کے ہی ایک تھانے میں اس نے گروسنگھ سے پوچھ گچھ کی اور یہاں گروسنگھ نے سب کچھ بک دیا۔ اب وہ گروسنگھ کو یہاں لے آیا تھا تا کہ مجھے اس کا بیان سنا سکے۔ اس نے گروسنگھ سے کہا کہ جو کچھ وہ بتا چکا ہے ایک بار پھر دہرا دے۔ گروسنگھ کے سارے کس بل نکل چکے تھے۔ وہ ٹیپ ریکارڈر کی طرح بولنے لگا۔ سب سے پہلے تو اس نے یہ حیران کن اقرار کیا کہ گلاباں کے گھر ہونے والے جڑواں بچے اس کے نہیں سردار بدروک سنگھ کے ہیں اور گلاباں سردار بدروک کی حویلی میں اس کی رکھیل بن کر رہتی ہے۔ اس نے یہ انکشاف بھی کیا کہ گلاباں کے بدلے اس نے سردار بدروک سے ایک ہزار روپیہ لیا تھا اور اس ایک ہزار میں سے پانچ سو اس نے اگلے ہی روز جوئے میں ہار دیا تھا۔ میرا دماغ چکرا کر رہ گیا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا، یہ کیا گورکھ دھندا ہے۔ میں نے گروسنگھ سے کہا کہ وہ شروع سے تمام واقعات بتائے۔ جواب میں گروسنگھ نے جو کچھ بتایا اس سے مندرجہ ذیل معلومات حاصل ہوئیں۔

”گروسنگھ کھیت مزدوری کرتا تھا۔ محنتی تھا۔ بظاہر اس میں کوئی برائی نہیں تھی۔ ماں باپ فوت ہو چکے تھے وہ اکیلا رہتا تھا۔ بابے میدے نے سوچا اس کی لڑکی گروسنگھ کے ساتھ خوش

رہے گی۔ گلاباں اور گروسنگھ کا بیاہ ہوگیا۔ گلاباں بابے میدے کی لاڈلی بیٹی تھی۔ وہ اپنے ساتھ کافی جہیز لائی۔ گروسنگھ کا خالی گھر بھرا بھرا نظر آنے لگا۔ شادی کے بعد دو تین ماہ تو ٹھیک گزرے پھر میاں بیوی میں جھگڑا رہنے لگا۔ جھگڑے کی اصل وجہ جو بہت کم لوگوں کو معلوم تھی یہ تھی کہ گروسنگھ ایک عورت کے چکر میں پڑا ہوا تھا۔ یہ عورت عمر میں گروسنگھ سے بہت بڑی تھی اور امرتسر میں رہتی تھی لیکن اس نے گروسنگھ کو اپنے جال میں یوں پھنسا رکھا تھا کہ وہ سب کچھ بھولا ہوا تھا۔ ہر مہینے دس پندرہ روپے کرایہ خرچ کر کے وہ کم از کم دو مرتبہ امرتسر جاتا تھا۔

گلاباں کو کسی طرح اس چکر کا علم ہوگیا۔ پھر اسے یہ بھی پتہ چل گیا کہ گروسنگھ نے اس کے زیورات میں سے ایک ہار اور جھمکوں کی جوڑی اپنی اس ''لگتی'' کو دے دی ہے۔ اس کے بے پناہ دکھ میں کچھ اور اضافہ ہوگیا، لیکن اپنی اس مصیبت کا ذکر اس بھلی مانس نے ماں باپ سے نہیں کیا۔ بس اتنا ہی بتایا کہ گروسنگھ اس سے جھگڑتا رہتا ہے۔ وہ دو تین بار لڑ کر میکے آئی اور صلح صفائی کے بعد گروسنگھ اسے واپس لے گیا، لیکن وہ اپنے کرتوتوں سے ایک قدم بھی پیچھے نہیں ہٹا بلکہ گزرنے والے ہر دن کے ساتھ اس کی ہٹ دھرمی اور بے باکی میں اضافہ ہوتا گیا۔ وہ بڑی دلیری سے گلاباں کے ساتھ اپنی ''معشوقہ'' کا ذکر کرنے لگا۔ کبھی کہتا میں اسے گاؤں لے آؤں گا۔ کبھی دھمکی دیتا کہ میں اس کے پاس امرتسر جا رہا ہوں۔ ایک روز وہ کپڑا لے کر آیا اور گلاباں سے کہا کہ اس کے فراک سی کر دو۔ گلاباں کے پوچھنے پر اس نے کہا کہ یہ فراک اس کے بچے کے ہیں۔ گلاباں نے کپڑا پھینک دیا اور رونے لگی۔ گروسنگھ نے اسے تھپڑ مارے اور گالیاں دیں۔ کئی روز گھر میں سخت کشیدگی رہی۔ آخر گلاباں پھر اپنے میکے چلی گئی۔ اتنا کچھ ہونے کے باوجود اس نے والدین کو اصل بات نہیں بتائی وہ بڑی حساس لڑکی تھی۔ بوڑھے والدین کا دل دکھانا نہیں چاہتی تھی۔ دوسری طرف وہ گروسنگھ کو دل و جان سے اپنا پتی سمجھتی تھی۔ وہ کیسا بھی تھا وہ اسے دنیا کے سامنے ننگا کرنا نہیں چاہتی تھی۔ سوچتی تھی شاید وہ راہِ راست پر آجائے۔ حالات بے انتہا بگڑنے کے باوجود اس کے دل کی گہرائیوں میں کہیں امید کی کرن موجود تھی۔ وہ گروسنگھ سے دور رہ کر اسے سدھارنے کی ایک آخری کوشش کرنا چاہتی تھی۔ لہٰذا گروسنگھ کے بار بار آنے کے باوجود اس نے سسرال جانے سے صاف انکار کر دیا۔

گروسنگھ کا ملنا جلنا کالو سے تھا۔ کالو کی گاؤں میں بہت دہشت تھی کیونکہ وہ سردار بدروک کا ملازم خاص تھا۔ اس نے گروسنگھ سے کہا کہ تم بے فکر رہو، جو زنانی نہ مانے اس کا علاج ہے۔ کالو نے کہا سیدھا سادہ علاج ہے جو نہیں آتی اسے اٹھا کر لے آؤ۔ یہ بات

گروسنگھ کے دل کو لگی۔ درحقیقت اس نے گلاباں سے ایک دن بھی محبت نہیں کی تھی۔ وہ اسے صرف بیوی سمجھتا تھا گھر کا کام کاج کرنے والی، روٹیاں پکانے والی اور وقتاً فوقتاً اس کے لئے خوشی فراہم کرنے والی۔ گھریلو تنازعہ شروع ہونے کے بعد یہ معمولی تعلق بھی نفرت میں بدل گیا تھا......اس نے کالو سے ساز باز کی۔ اسے کہا کہ وہ گلاباں کو اٹھا لے اور ڈرا دھمکا کر سیدھا کر دے۔ اسے اتنا خوفزدہ کرے کہ وہ پھر ساری زندگی اسے متھا نہ لگا سکے۔

کالو نے کہا۔ ''ایسا ہی ہوگا۔''

ایک رات وہ اپنے ساتھیوں کو لے کر بابے میدے کے گھر پہنچ گیا۔ اس نے بابے میدے سے کہا کہ سردار بدروک تمہیں اور تمہاری بیٹی کو حویلی میں بلاتے ہیں۔ بابے میدے نے پس و پیش سے کام لیا، لیکن کالو کے سامنے اس کی ایک نہ چلی۔ کالو ان دونوں کو زبردستی حویلی میں لے گیا۔ وہ اپنے مالک بدروک سے پہلے ہی گلاباں کی بات کر چکا تھا۔ گلاباں سیدھی بدروک کے خاص کمرے میں پہنچا دی گئی۔ جبکہ بابا میدہ باہر کالو اور اس کے ساتھیوں کے ٹھڈے کھاتا رہا۔ صبح بابے کو تو رہا کر دیا گیا۔ مگر گلاباں مستقل طور پر حویلی کی ہو کر رہ گئی۔

گروسنگھ سے سردار بدروک کی ملی بھگت تھی اس لئے اگلے روز گروسنگھ نے سردار بدروک سے ایک ہزار روپیہ وصول کیا اور امرتسر جا بیٹھا جہاں اس نے پانچ سو روپیہ تو جوئے میں ہار دیا اور باقی پانچ سو اپنی معشوقہ پر خرچ کر ڈالا۔ اس کے بعد ٹھنڈا ٹھار ہو کر فلور مل میں کام کرنے لگا۔ دوسری طرف سردار بدروک سنگھ بھی مطمئن تھا کہ اگر کوئی اس سے گلاباں کے بارے پوچھے گا تو وہ کہہ دے گا کہ گلاباں کو اس کا شوہر حویلی میں چھوڑ گیا ہے، لیکن اس سوال کی نوبت ہی نہیں آئی۔ کسی کو ہمت ہی نہیں ہوئی کہ ٹمانے سردار سے یہ سوال پوچھ سکے۔ بس لوگ چپکے چپکے چہ میگوئیاں کرتے رہے اور خیالی گھوڑے دوڑاتے رہے۔

پوری کہانی سن کر میرا خون کھول اٹھا۔ جی چاہا اس بے غیرت شوہر کے منہ پر تھوک دوں۔ ایک شریف باپ کی بیٹی کو اس نے یوں برباد کیا تھا کہ اس کی پوری زندگی گالی بن گئی تھی۔ بابے میدے کی مصیبت زدہ صورت میری نگاہوں میں گھومنے لگی۔ وہ اپنے داماد کو کیا سمجھتا تھا اور داماد درحقیقت کیا تھا۔ کیسے کیسے بھیس بدلتا ہے انسان۔

میں اشفاق کو لے کر دوسرے کمرے میں آگیا۔ ہم دونوں آمنے سامنے بیٹھ گئے تو میں نے کہا۔ ''اشفاق! میرے دل کی بات پوچھو تو تم نے جرأت کا کام کیا ہے اور تمہیں شاباش ملنی چاہئے لیکن مجھے ڈر ہے کہ شاباش کی جگہ تمہیں سزا نہ بھگتنی پڑے۔ سردار بدروک سنگھ اب نچلا نہیں بیٹھے گا۔ اس کا کیا سوچا ہے تم نے؟''

اشفاق بولا۔ ''نواز صاحب! مجھے کیا سوچنا ہے۔ سوچنا تو اب اسے چاہئے۔ جرم اس نے کیا ہے ہم نے نہیں۔ میں صرف آپ سے مشورہ کرنے کے لئے آیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ گلاباں کے شوہر کو آپ اپنے پاس ہی رکھیں۔ ایک دو روز میں کیس مکمل کر کے میں ایس پی صاحب کو بھیج دوں گا۔ مجھے پورا یقین ہے کہ گرو سنگھ کے اقبالی بیان کے بعد سردار بدروک بچ نہیں سکے گا۔''

میں نے کہا۔ ''اشفاق! تم اصولی کارروائی کے چکر میں نہ پڑو اگر ڈی آئی جی صاحب واقعی تمہاری سنتے ہیں تو پھر ان سے بات کرو۔ بلکہ میرا تو خیال ہے کل ہی ان سے مل لو۔ یہ معاملہ تاخیر کرنے والا نہیں۔ تم نے ایک بہت بڑی مصیبت مول لی ہے۔ اب دیر کرو گے تو اور پھنستے جاؤ گے۔'' وہ مسکرانے لگا۔

اتنے میں ایک سپاہی اندر آیا۔ اس نے سیلوٹ مار کر اطلاع دی کہ روتک گاؤں کا حجام ناجی آپ سے ملنا چاہتا ہے۔ ناجی کا نام سن کر میں چونکا۔ یہ شخص روتک گاؤں میں میرا خاص مخبر تھا۔ اشفاق اور سردار بدروک کی چپقلش شروع ہونے کے بعد میں نے ناجی کو خاص طور پر ہوشیار کر دیا تھا۔ اشفاق کو وہیں چھوڑ کر میں اپنے دفتر پہنچا۔ ناجی منہ سر کمبل میں لپیٹ کر بیٹھا تھا۔ باہر صحن میں اس کا گدھا بندھا ہوا تھا۔ اسی گدھے پر وہ دس میل کا سفر کر کے یہاں پہنچا تھا۔ یقیناً وہ کوئی اہم اطلاع لایا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ ہولے ہولے کانپ رہا ہے۔ یہ کپکپاہٹ سردی سے زیادہ گھبراہٹ کی تھی۔

میں نے کہا۔ ''کیا بات ہے ناجی؟ پریشان لگتے ہو۔''

وہ منہ سے کمبل ہٹا کے بولا۔ ''بات ہی پریشانی کی ہے جناب عالی...... بڑا خطرہ ہو گیا ہے۔''

''کیسا خطرہ؟'' میں نے پوچھا۔

اس کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔ آگے کو جھک کر سرگوشی میں بولا۔ ''اشفاق صاحب کا کچھ کر لیں جناب......ٹمانوں نے انہیں قتل کر دینا ہے۔ آج رات یا کل صبح تک۔''

میرے جسم میں کرنٹ سا دوڑ گیا۔ ''کیا کہہ رہے ہو؟'' میں نے ڈانٹ کر پوچھا۔

اس نے تھوک نگلا۔ ''بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے جناب! کل اشفاق صاحب نے امرتسر میں کسی بندے کو پکڑا ہے اور اسے تھانے میں لے جا کر مارا پیٹا ہے۔ یہ بندہ ٹمانوں کا کوئی خاص آدمی ہے۔ وہ اشفاق صاحب کی اس حرکت پر بہت بھڑک اٹھے ہیں۔ آج سہ پہر سردار بدروک نے کالو سے کہا ہے کہ وہ اشفاق کا قصہ پاک کر دے۔ اشفاق صاحب ابھی گاؤں

واپس نہیں آئے۔ انہیں آج رات یا کل کسی وقت آنا ہے۔ کالو اسلحہ لے کر گاؤں کے ناکے پر بیٹھا ہوا ہے۔ جیسے ہی اشفاق صاحب گاؤں کی حد میں آئے گا ان کو قتل کر دیا جائے گا اور لاش پتھر باندھ کر روہی نالے میں پھینک دی جائے گی۔''

میں نے ناجی سے کہا۔ ''تم اِدھر ہی بیٹھو میں ابھی آتا ہوں۔''

میں دوسرے کمرے میں پہنچا تو اشفاق وہاں موجود نہیں تھا۔ آتش دان کے پاس ایک سپاہی کھڑا ہاتھ تاپ رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''اشفاق کہاں ہے؟''

وہ بولا۔ ''جی وہ ملزم کو لاک اَپ میں بند کر کے چلے گئے ہیں۔ یہ لفافہ یہاں چھوڑ گئے ہیں۔''

میں نے دیکھا وہ بڑا لفافہ تھا۔ اس میں کوئی اونی کپڑا تھا۔ میں نے لفافہ کھولا۔ نیلے رنگ کی ایک جرسی میرے ہاتھوں میں جھولنے لگی۔ اشفاق ایسے تماشے اکثر کرتا رہتا تھا۔ کچھ روز پہلے مجھے کہہ رہا تھا۔ میں اپنی ہونے والی بیوی سے دو جرسیاں بنوا رہا ہوں۔ ایک آپ کے لئے ایک اپنے لئے۔ میں جانتا تھا اس کے دل میں میرے لئے بے پناہ خلوص ہے......بہرحال اس وقت مجھے اس کا یہ پُرخلوص تحفہ بھی اچھا نہیں لگا۔ میں نے جرسی ایک طرف پھینکی اور سخت لہجے میں پوچھا۔ ''کہاں گیا ہے وہ؟''

سپاہی بولا۔ ''پتہ نہیں جی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ان کا گھوڑا گلی سے نکل کر گیا ہے۔''

میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بج اٹھی۔ تقریباً بھاگتا ہوا میں تھانے سے باہر آیا۔ میرے پاس ایک کھٹارہ سی جیپ تھی۔ جیپ لے کر میں روتک جانے والے راستے پر بڑھا۔ اے ایس آئی اشفاق اسی راستے پر گیا تھا۔ اونچے نیچے تاریک راستے پر میں جتنی رفتار اختیار کر سکتا تھا اختیار کی۔ اندازاً دو میل آگے جا کر میں نے اشفاق کو جا لیا۔ اشفاق نے مجھے دیکھ کر گھوڑا روک لیا۔ میں نے اشفاق سے کہا کہ وہ میرے ساتھ واپس چلے۔ میرے فیصلہ کن لہجے پر وہ حیران رہ گیا۔

پوچھنے لگا۔ ''کیا بات ہے نواز صاحب۔ آپ کچھ پریشان ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''میں بہت زیادہ پریشان ہوں۔ تم میرے ساتھ آؤ۔ میں تھانے جا کر تمہیں سب کچھ بتاتا ہوں۔''

مجبوراً اسے میرے ساتھ واپس آنا پڑا۔ راستہ بھر میں خاموش ہی رہا۔ تھانے پہنچ کر میں نے اس سے کہا۔ ''اشفاق، تمہاری جان کو سخت خطرہ ہے۔ تم تھانے سے باہر نہیں جاؤ گے۔ یہ میرا حکم ہے۔''

وہ حیرت سے میرا چہرہ دیکھنے لگا۔ بہرحال اسے اعتراض کی جرأت نہیں ہوئی۔ شاید میرا لہجہ ہی ایسا تھا۔ میں نے باہر نکل کر اپنے سب انسپکٹر کو کچھ ہدایات دیں اور ایک کانسٹیبل کو ساتھ لے کر فوراً روتک گاؤں کی طرف روانہ ہوگیا۔ اس وقت تک رات کا ایک بج چکا تھا۔ تاریک سنسان راستے پر نہایت سرد ہوا چل رہی تھی۔ گیدڑوں اور کتوں کی آوازیں کثرت سے آرہی تھیں۔ ہم نے یہ مشکل سفر قریباً تین گھنٹے میں طے کیا اور صبح چار بجے چوکی پر پہنچ گئے۔ میں نے سیدھا ٹمانوں کی حویلی کا رخ کیا۔

وسیع بیٹھک میں سردار بدروک سے میری ملاقات ہوئی۔ اس کی آنکھیں خمار آلود تھیں۔ معلوم نہیں یہ شراب کا خمار تھا یا ''خواب'' کا۔ وہ مسکرا کر بولا۔

''آؤ جان جی۔ خیر تو ہے؟''

میں نے کہا۔ ''خیر نہیں ہے سردار بدروک اور یہ بات تم بھی جانتے ہو۔''

سردار بدروک کے چہرے پر رنگ سا آکر گزر گیا۔ میں نے اردگرد نگاہ دوڑائی۔ خطرناک صورت اور سرخ انگارہ آنکھوں والا کالو کہیں نظر نہیں آیا، حالانکہ وہ ہروقت سائے کی طرح بدروک کے ساتھ رہتا تھا۔ میں نے گھمبیر لہجے میں کہا۔

''سردار بدروک، مجھے خبر ملی ہے کہ تم نے کالو کو کسی خاص کام سے گاؤں کے ناکے پر بھیج رکھا ہے؟''

سردار کے چہرے پر عجیب سے تاثرات ابھر کر غائب ہوگئے۔ کہنے لگا۔ ''صرف اندازہ لگا رہے ہو یا کسی کے بہکاوے میں آئے ہو۔''

میں نے کہا۔ ''اندازے وہ لگاتے ہیں جنہیں خبر نہ ہو۔ مجھے خبر ہے جو کچھ یہاں ہوتا ہے۔ ایک تھانیدار کو اپنی آنکھیں اور اپنے کان کھلے رکھنے پڑتے ہیں۔''

سردار نے میرے اکھڑے اکھڑے لہجے کو محسوس کرلیا۔ مسکرا کر بولا۔

''کیا بات ہے جان جی۔ کچھ بدلے بدلے نظر آتے ہو۔''

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں اور صاف سیدھے لہجے میں کہا۔ ''دیکھو سردار ٹمانہ! اگر اے ایس آئی اشفاق کو کچھ ہوا تو ایسی آگ لگے گی جو تمہارے بجھائے سے نہ بجھے گی۔ میری بات پورے غور سے سن لو اور سمجھ لو۔ تم اے ایس آئی اشفاق پر حملہ نہیں کرو گے۔ ایسا کرو گے تو مجھ پر حملہ کرو گے، مجھ پر۔''

وہ اپنے ہونٹوں کی زہریلی مسکراہٹ برقرار رکھتے ہوئے بولا۔ ''بڑے تاؤ میں لگتے ہو جان جی۔''

میں نے کہا۔ ''ہاں تاؤ میں ہوں لیکن یہ نہ سمجھنا میرا دماغ خراب ہوگیا ہے۔ میں پوری طرح ہوش میں ہوں۔ میں سب جانتا ہوں جس کے ساتھ بیٹھ کر تم کھانا کھاتے ہو۔ سب کچھ جانتا ہوں میں، لیکن اسے میری دھمکی سمجھ لو، منت سمجھ لو یا درخواست سمجھ لو میرے اے ایس آئی کو کچھ نہیں ہونا چاہئے۔'' میں نے محسوس کیا کہ جذبات کی وجہ سے میرا سارا وجود دھیرے دھیرے لرز رہا ہے۔

سردار بدروک کچھ دیر گہری نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا۔ ان نظروں میں چھپی ہوئی درندگی اور سفاکی کو میں اچھی طرح جانتا تھا۔ ان نگاہوں میں وہ ظلم بھیس بدل کر بیٹھا ہوا تھا جو برنالہ کے ٹمانے نسل در نسل اپنے سے کمزور لوگوں پر ڈھاتے رہے تھے۔

آخر بدروک نے زیرلب مسکرا کر میرا کندھا تھپتھپایا۔ گہری سانس لے کر بولا۔ ''ٹھیک ہے نواز خان...... ٹھیک ہے۔ میں تمہیں ایک موقع اور دیتا ہوں۔ جاؤ...... اس پاگل کے بچے کو سمجھاؤ۔ اسے بتاؤ کہ وہ کس اوکھلی میں سر دے رہا ہے۔ جاؤ میری طرف سے مطمئن ہوکر جاؤ۔ میں کل تک تمہاری کوشش کے نتیجے کا انتظار کروں گا۔''

میں نے آخری نظر بدروک سنگھ پر ڈالی اور بغیر کچھ کہے سنے باہر نکل آیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد میری جیپ کچے راستوں پر اچھلتی ہوئی واپس رنگ کوٹ جارہی تھی۔ اشفاق کا ہنستا مسکراتا چہرہ میری نگاہوں میں گھوم رہا تھا۔ وہ جوان تھا، خوبصورت تھا۔ عنقریب اس کی شادی ہونے والی تھی۔ اس کے بوڑھے والد کا تصور میری سوچوں کو پریشان کرنے لگا۔ ایک طرف وہ بوڑھا بیٹے کے سر پر سہرہ دیکھنے کی آرزو لئے بیٹھا تھا، دوسری طرف ایک خوبصورت لڑکی نے اپنی آنکھوں میں سہاگ کے سپنے سجا رکھے تھے۔ اگر اشفاق کو کچھ ہوجاتا تو کئی دلوں پر قیامت بیت جاتی۔ اشفاق کو کچھ معلوم نہیں تھا وہ کس گھرانے سے ٹکر لے رہا ہے۔ لیکن میں جانتا تھا۔ مجھے معلوم تھا ٹمانوں کے تعلقات ایک ایسے شخص سے ہیں جس کے سامنے پولیس کے چھوٹے بڑے عہدیدار پانی بھرتے ہیں۔ وہ شخص ایک پرچی لکھ کر دیتا ہے اور تھانوں میں تہلکہ مچ جاتا ہے۔

میں غصے میں بھرا ہوا واپس رنگ کوٹ تھانے پہنچا۔ اشفاق اوپری منزل کے ایک کمرے میں لمبی تان کر سو رہا تھا۔ میں نے اسے جھنجھوڑ کر جگایا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ میں نے اسے سامنے بٹھا کر کہا۔

''اشفاق! مجھے ٹھیک ٹھیک بتا۔ کیا چاہتا ہے تُو؟''

''نواز صاحب! میں آپ کی بات نہیں سمجھا۔''

میں نے کہا۔ ''آؤ میرے ساتھ۔ میں سمجھاتا ہوں تجھے۔'' اشفاق کو بازو سے پکڑ کر میں تقریباً کھینچتا ہوا سیڑھیوں تک لے آیا۔ سیڑھیاں اُتر کر ہم نیچے آفس میں پہنچے۔ میں نے دروازہ اندر سے بند کیا اور لوہے کی ایک کہنہ سال الماری کا قفل کھول کر پٹ وا کر دیئے۔ اس الماری میں مختلف کیسوں کی فائلیں تہہ در تہہ رکھی تھیں۔ ایک خانے میں ہسٹری شیٹس تھیں۔ ایک دوسرے خانے میں پرانے کاغذوں کے پلندے رکھے تھے۔ میں نے الماری کے نچلے خانے میں سے ایک گرد آلود فائل نکالی۔ یہ ٹمانوں کی فائل تھی۔ اس فائل میں ٹمانوں کے وہ تمام قانونی اور غیر قانونی کارنامے درج تھے جو وہ اب تک کرتے رہے تھے۔ میں نے فائل کا ایک صفحہ کھول کر اشفاق کے سامنے رکھ دیا۔ وہ صفحے پر جھک کر غور سے پڑھنے لگا۔ آہستہ آہستہ اس کے چہرے پر حیرت کے آثار نمودار ہونے لگے۔ مجھے معلوم تھا اسے حیران ہونا پڑے گا۔ فائل کے اس حصے میں سردار بدروک کے چند کالے کارناموں کی تفصیل تھی۔ ان میں کئی قتل تھے، اس کے علاوہ ناجائز قبضے، اغوا اور آبروریزی کی درجنوں وارداتیں تھیں۔ ان میں دو تین وارداتیں ایسی تھیں جن میں سردار بدروک کے خلاف ٹھوس ثبوت مل گئے تھے اور اس پر مضبوط کیس بن سکتے تھے مگر نامعلوم وجوہ کی بناء پر یہ کیس داخل دفتر کر دیئے گئے تھے۔ اشفاق فائل دیکھ چکا تو میں نے کہا۔

''کہو کچھ تسلی ہوئی ہے۔ تم اپنے آپ کو بڑا باخبر سمجھتے ہو ناں۔ تمہارا خیال ہے کہ سردار بدروک نے گلاباں کو حویلی میں رکھ کر اور اس سے دو بچے پیدا کر کے بہت بڑا جرم کیا ہے۔ اب بتاؤ وہ جرم بڑا ہے یا یہ جرم بڑے ہیں۔ اگر یہ جرم کر کے بھی اس کے ہاتھ ہتھکڑی سے آزاد ہیں تو گلاباں سے بچے پیدا کرنے کا جرم اس کا کیا بگاڑ لے گا۔ بتاؤ کیا کر لو گے تم؟''

وہ بولا۔ ''نواز صاحب! اگر ہم سے پہلے آنے والے تھانیدار سردار بدروک سنگھ کا بت نہیں توڑ سکے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم اسے سجدہ کرنا شروع کر دیں۔ ہم نے حلف اٹھایا ہے......''

''خاک حلف اٹھایا ہے۔'' میں نے اس کی بات کاٹی۔ ''تم فرض شناس نہیں ہو، بیوقوف ہو۔ تم مرنا چاہتے ہو ناں؟ لو...... یہ ریوالور رکھ لو اس کو کنپٹی پر...... کم از کم کتے کی موت مرنے سے تو بچ جاؤ گے ناں۔ لو پکڑو اسے۔'' میں نے ریوالور اشفاق کی گود میں پھینک دیا۔

میرا طیش اغفاق کو ہراساں کر رہا تھا۔ اس نے ریوالور گود سے اٹھایا اور آہستگی سے سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔ کچھ دیر کمرے میں گھمبیر خاموشی طاری رہی۔ ادھ کھلی کھڑکی سے کبھی

کبھی ہوا کا جھونکا آ جاتا تھا۔ ان جھونکوں سے ہمارے درمیان رکھی ہوئی فائل کے ورق پھڑ پھڑا رہے تھے۔ اشفاق نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

''نواز صاحب! آپ ہر لحاظ سے مجھ سے بڑے ہیں۔ میں آپ کی بات رد نہیں کر سکتا۔ بہرحال مجھے سوچنے کے لئے کچھ وقت دیجئے۔'' وہ اٹھ کر خاموشی سے باہر نکل گیا۔ میں نے اسی وقت حوالات میں جا کر گروسنگھ کو رہا کر دیا۔ اسے کھانا وغیرہ کھلایا اور اپنے ایک ہیڈ کانسٹیبل سے کہا کہ اسے جا کر امرتسر چھوڑ آئے۔

☆======☆======☆

تین چار روز گزر گئے۔ اشفاق کا رویہ اب کچھ بدلا بدلا نظر آتا تھا۔ اس نے گروسنگھ کو چھوڑنے پر بھی کوئی خاص اعتراض نہیں کیا۔ شاید اس نے خود بھی اپنی ''تیز رفتاری'' کو محسوس کر لیا تھا۔ وہ ابھی چوکی واپس نہیں گیا تھا۔ وہاں اس کا قائم مقام ایک سکھ حوالدار کام کر رہا تھا۔

ایک دن صبح سویرے میں نے سوچا اشفاق سے اس کا آئندہ کا لائحہ عمل پوچھنا چاہئے۔ اس کی شادی ہونے والی تھی۔ بہتر تھا وہ ایک دو مہینے کی رخصت لے لیتا۔ شادی بھی نبٹ جاتی اور یہ معاملہ بھی ٹھنڈا ہو جاتا۔ میں نے سنتری سے کہا۔

''ذرا اشفاق کو بلاؤ۔ وہ اوپر کمرے میں سو رہا ہوگا۔''

سنتری نے کہا۔ ''نہیں جناب، وہ تو تھوڑی دیر پہلے کنوئیں کی طرف گئے ہیں۔''

میں وہیں کمرے میں بیٹھے بیٹھے اس کا انتظار کرنے لگا۔ دس پندرہ منٹ گزرے تھے کہ ایک سپاہی دھوتی کُرتے میں ملبوس بھاگتا ہوا آیا۔ اس کا رنگ فق ہو رہا تھا۔ آتے ساتھ ہی کہنے لگا۔

''انسپکٹر صاحب! جلدی چلیں اشفاق صاحب زخمی ہو گئے ہیں۔ ٹمانوں کے آدمی انہیں چاقو مار کر بھاگ گئے ہیں۔''

میں ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔ سپاہی کے ساتھ بھاگتا ہوا میں تھانے سے باہر آیا۔ ہم پیدل ہی کھیتوں کی طرف بھاگے۔ کوئی دو فرلانگ آگے اشفاق مکئی کے کٹے ہوئے کھیت میں زخمی پڑا تھا۔ میں لپک کر اس کے پاس پہنچا۔ اس کے دائیں کندھے اور ران پر خنجر کے گہرے گھاؤ نظر آ رہے تھے۔ تیزی سے بہنے والے خون نے اس کے سارے کپڑے بھگو رکھے تھے۔ ایک دو دیہاتی پریشانی کے عالم میں پاس کھڑے تھے۔ میں نے لپک کر اس کا سر اپنے زانو پر رکھا۔ زخم زیادہ سنگین معلوم نہیں ہوتے تھے لیکن اشفاق کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ میں نے

سہارا دے کر اسے بٹھانے کی کوشش کی اور اس وقت میری نگاہ اس کی پشت پر پڑی۔ میری آنکھیں پھٹی رہ گئیں...... اس کی پشت پر خنجر کے کم از کم نصف درجن نہایت گہرے گھاؤ تھے۔ یوں لگتا تھا وحشی قاتلوں نے اسے گھیر کر خنجروں سے چھلنی کر دیا تھا۔

''اشفاق......'' میں نے کراہ کر کہا۔

اس نے ڈوبتی نظروں سے میری طرف دیکھا اور جسم ڈھیلا چھوڑ کر میرے سینے سے آلگا۔ میں وہ منظر کبھی نہیں بھول سکتا۔ وہ میری طرف دیکھ رہا تھا۔ جیسے آنکھوں آنکھوں میں اپنی موت کا اعلان کر رہا ہو اور مجھے خدا حافظ کہہ رہا ہو۔ مجھے لگا جیسے میرا چھوٹا بھائی یا میرا بیٹا میرے سینے سے لگا ہے۔ میں نے اسے بانہوں میں بھینچ لیا۔ اس کا خون میری جرسی کو رنگین کرنے لگا۔ وہی جرسی جس کے ہر دھاگے میں اشفاق کی محبت اور اس کا خلوص گندھا ہوا تھا۔

''آنکھیں کھول اشفاق آنکھیں کھول۔'' میں نے گھبرا کر کہا۔ لیکن اس نے آنکھیں کھولنے کے لئے بند کی نہیں تھیں۔ میں نے اسے جھنجھوڑا، وہ بہت دور جا چکا تھا۔ بہت آگے نکل چکا تھا۔ میرا سینہ غم کی شدت سے پھٹنے لگا۔ ایک آگ سی لپکی اور جسم کے رگ وپے میں پھیل گئی۔ میں نے بڑی آہستگی سے اشفاق کا مردہ جسم کھیت کی مٹی پر رکھ دیا۔

مجھے محسوس ہوا جیسے میرا دل و دماغ میرے قابو میں نہیں رہے گا۔ میں یہاں سے اٹھ کر سیدھا سردار بدروک سنگھ کی کالی حویلی میں پہنچوں گا اور ہر اس شخص کو تہس نہس کر دوں گا جو میرے اور چوہدری کے درمیان آئے گا۔ اس کے بعد اپنے ہاتھوں کو چوہدری کی گردن پر جما دوں گا اور اس وقت پیچھے ہٹوں گا جب وہ کتا اپنی زندگی سے محروم ہو جائے گا۔ مجھے ہر منظر دھندلا دکھائی دے رہا تھا۔ شاید آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ اس دوران پولیس جیپ کی آواز سنائی دی۔ چند لمحے بعد میں نے دیکھا جالندھر کے ڈی ایس پی دلجیت راج صاحب لوگوں کے درمیان سے راستہ بناتے ہوئے موقعہ پر پہنچ گئے۔ ان کے ساتھ عملے کے چند ارکان بھی تھے۔ سب انسپکٹر اشفاق کی لاش دیکھ کر ڈی ایس پی صاحب کی آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئیں۔ وہ چند لمحے بے حرکت کھڑے رہے۔ پھر غمزدہ لہجے میں بولے۔

''یہ سب کیا ہے انسپکٹر؟''

میں نے کہا۔ ''سر! یہ سب انسپکٹر اشفاق کی لاش ہے۔ ناتجربہ کار افسروں کو نئے سٹیشنوں پر بھیجا جائے تو یہی کچھ ہوتا ہے۔''

''لیکن یہ کیا کس نے ہے؟''

میں نے کہا۔ ''سر! میرا خیال ہے آپ کو یہ پوچھنے کی ضرورت نہیں ہونی چاہئے۔ جس

علاقے میں سردار بدروک جیسا زہریلا سانپ موجود ہو وہاں ایسی لاشیں نہیں ملیں گی تو اور کیا ہو گا۔''

ڈی ایس پی صاحب سر سے ٹوپی اتار کر خاموش کھڑے ہو گئے۔ ان کا عملہ خاموش تھا۔ تماشائی خاموش تھے۔ ہر چیز خاموش تھی۔ فضا پر جیسے سکتہ طاری ہو چکا تھا۔ میں نڈھال قدموں سے چلتا تھانے واپس لوٹ آیا۔

قریباً ایک گھنٹے بعد میں اپنے سب انسپکٹر کی لاش کے ساتھ شہر روانہ ہو رہا تھا۔ شہر پہنچ کر اشفاق کے مردہ جسم کو چیر پھاڑ کے لئے ڈاکٹروں کے حوالے کر دیا گیا۔ بعد ازاں اسے اس کے گھر امرتسر لایا گیا۔ یہاں میری ویران آنکھوں نے بے حد رقت آمیز مناظر دیکھے۔ اشفاق کے بوڑھے والد کا پچھاڑیں کھا کر گرنا، اس کی بہنوں کا صدمے سے بار بار بے ہوش ہونا۔ اس کے عزیزوں رشتے داروں کی موسلا دھار برستی آنکھیں ہر چہرہ صدمے کی تصویر تھا۔ ان تصویروں میں ایک تصویر ایسی بھی تھی جسے میں دیکھ نہیں سکتا تھا لیکن اس تصویر کے سارے رنگ میری آنکھوں کے سامنے تھے۔ یہ اس لڑکی کی تصویر تھی جو اشفاق سے پیار کرتی تھی۔ میں جانتا تھا گھر کے اندر میت کے گرد بیٹھی عورتوں میں کہیں یاسمین بھی موجود ہو گی۔ اس کے دل پر کیا بیت رہی ہو گی کوئی نہیں بتا سکتا تھا۔ کوئی بتا ہی نہیں سکتا تھا۔ میرا دل چاہا میں اس لڑکی کو تلاش کروں۔ اسے دلاسہ دوں اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیروں، لیکن میں ایسا نہ کر سکا۔ شاید اس لئے کہ اس وقت مجھے خود دلاسے کی ضرورت تھی۔ میں خود آنسو بہانے کے لئے کوئی تاریک گوشہ ڈھونڈ رہا تھا۔ کوئی ایسا گوشہ جہاں کوئی مجھے اشک بار نہ دیکھ سکے۔ کسی کو معلوم نہ ہو کہ انسپکٹر نواز بھی رویا تھا۔

قدرت کا بھی عجیب نظام ہے۔ کسی منظر کو دیکھنے کے لئے ساری زندگی آنکھیں ترستی رہتی ہیں اور کبھی ایسے منظر بھی دیکھنے پڑتے ہیں جو ساری زندگی آنکھوں میں کانٹے بن کر چبھتے ہیں۔ میں نے اشفاق کو کفن پوش دیکھا۔ اس گھر سے اس کا جنازہ نکلتے دیکھا جہاں سے اس کی بارات نکلنا تھی۔ اسے منوں مٹی کے نیچے چھپتے دیکھا۔ پھر اس کے گھر کی ویرانی دیکھی اور یہ سارے کانٹے اپنی آنکھوں میں چبھو کر میں رنگ کوٹ کے تھانے میں واپس آ گیا۔

میرے واپس پہنچنے تک میرے قائم مقام سب انسپکٹر نے ضروری کارروائی کر لی تھی۔ اس ضروری کارروائی کو رسمی کارروائی ہی کہنا چاہئے۔ اس نے موقعہ واردات کا نقشہ تیار کیا تھا۔ گواہوں کے بیان قلم بند کئے تھے اور اپنی تفتیش کی روداد لکھی تھی۔ اس ساری قلم گھسائی میں کوئی بھی کام کی بات نہیں تھی۔ ہو بھی کیسے سکتی تھی۔ یہ سردار بدروک کا علاقہ تھا۔ یہاں اس

کے خلاف بیان دینا تو در کنار کوئی اس کے خلاف سرگوشی بھی نہیں کر سکتا تھا۔ موقعہ کا اکلوتا گواہ وہ سپاہی تھا جس نے آکر مجھے اشفاق کے زخمی ہونے کی اطلاع دی تھی اور بتایا تھا کہ اسے ٹمانوں نے مار گرایا ہے۔ اس اکیلی گواہی کی اہمیت اس لئے نہیں تھی کہ دوسرے گواہوں نے یہ بتا کر کہ حملہ آوروں نے اپنے چہرے پگڑیوں میں چھپا رکھے تھے، معاملہ الجھا دیا تھا۔

میں اپنے طور پر تفتیش شروع کرنا ہی چاہ رہا تھا کہ امرتسر ہیڈ کوارٹر سے بلاوا آگیا۔ پہلے تو مجھے اس بلاوے کی سمجھ نہیں آئی لیکن جب امرتسر پہنچا تو راز کھلا کہ ڈی ایس پی مجھے ایک اغوا کیس کی تفتیش کے لئے فوری طور پر اجمیر بھیجنا چاہتے ہیں۔ یہ کوئی زمین کا تنازعہ تھا۔ جس میں مخالف فریقوں نے ایک دوسرے کا ایک ایک آدمی اغوا کر لیا تھا۔ میں اس کیس کی تفتیش پر ہرگز جانا نہیں چاہتا تھا۔ میرے دل و دماغ پر اشفاق کی موت کا غم موسلا دھار بارش کی طرح برس رہا تھا لیکن افسروں کے سامنے میری کوئی پیش نہیں گئی۔ خاص طور پر ڈی ایس پی دلجیت راج نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا کہ میں واپس رنگ کوٹ نہ جاؤں۔ دلجیت راج کا ذکر میں نے پہلے بھی ایک دو دفعہ کیا ہے۔ ہندو ہونے کے باوجود وہ ایک اچھا انسان تھا۔ کم از کم میں نے اسے ہمیشہ مخلص پایا۔ اس کی باتوں میں ایک عجیب طرح کی چاشنی ہوتی تھی۔ بہر حال نہ چاہنے کے باوجود مجھے فوری طور پر اجمیر جانا پڑا۔ اجمیر سے مجرموں کا تعاقب کرتے ہوئے ہم جودھ پور جا پہنچے اور وہاں تفتیش کا کام پھیلتا چلا گیا۔ میں نے دو تین بار ٹیلی فون پر دلجیت راج صاحب سے رابطہ کیا اور انہیں صاف لفظوں میں بتایا کہ میں یہ کیس کرنا نہیں چاہتا اور نہ ہی اس میں میرا دل لگ رہا ہے لیکن راج صاحب نے ہر بار یہی ظاہر کیا کہ اس کیس کی تفتیش کے لئے ان کی نظر میں مجھ سے بہتر کوئی آدمی نہیں اور مجھے ہر حال میں یہ اہم ذمے داری پوری کرنی ہے۔ میں صاف طور پر محسوس کر رہا تھا کہ دلجیت راج صاحب مجھے رنگ کوٹ تھانے کی آگ سے بچانا چاہتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے اس سے پہلے میں اشفاق کو اس آگ سے دور رکھنا چاہتا تھا۔ صورتِ حال بالکل وہی تھی صرف سردار بدروک کی زد میں آنے والے شخص کا نام بدل گیا تھا۔ یعنی اس سے پہلے اشفاق نشانے پر تھا تو اب میں۔

اپنی پوری کوشش کے باوجود میں پورے دو ماہ تک اجمیر والے چکر سے باہر نہیں نکل سکا۔ میرے سینے میں بھڑکتی ہوئی آگ ہر گزرنے والے دن کے ساتھ ناقابلِ برداشت ہو رہی تھی۔ آخر دو مہینے بعد ڈی ایس پی صاحب کا تبادلہ مغربی پنجاب میں ہوا تو مجھے موقع مل گیا اور میں اجمیر سے واپس برنالہ چلا گیا۔ تھوڑی سی بھاگ دوڑ کے بعد میں رنگ کوٹ میں اپنے تھانے کا چارج سنبھالنے میں کامیاب ہو گیا۔

میرے تھانے پہنچنے کے دوسرے ہی روز سردار بدروک اپنے ساتھیوں کے ساتھ تھانے میں آدھمکا۔ میں اس کی دیدہ دلیری پر حیران رہ گیا۔ اشفاق کی موت کے بعد میری اور سردار بدروک کی یہ پہلی ملاقات تھی۔ سردار نے گردن جھکائی ہوئی تھی اور چہرہ غمگین کر رکھا تھا۔ وہ اشفاق کا افسوس کرنے آیا تھا۔ کہنے لگا۔

”مجھے بڑا دکھ ہے انسپکٹر نواز۔ یقین نہیں آرہا کہ سب انسپکٹر مارا گیا ہے۔ کیسا گبھرو جوان تھا۔ ہنسنے کھیلنے کے دن تھے۔ سنا ہے شادی بھی ہونے والی تھی۔“

میں نے کہا۔ ”ہاں ہونے والی تھی۔“

سردار بدروک نے گہری ٹھنڈی سانس لی۔ ”ماں باپ کا دل تو ٹکڑے ہو گیا ہوگا۔ کیا کیا ارمان ہوں گے ان کے۔ کیا کیا سوچ رکھا ہوگا۔ سب خاک میں مل گیا۔“

میں نے کہا۔ ”بس، اُوپر والے کی یہی مرضی تھی۔“

کہنے لگا۔ ”اُوپر والے کی مرضی انسان کی مرضی کا سایہ ہوتی ہے جان جی۔ بدنصیبی میں تھوڑا بہت دوش بندے کا اپنا بھی ہوتا ہے۔ اب یہ پولیس کی نوکری ہی لے لو۔ مجھے تو سمجھ نہیں آتی کیوں لوگ یہ نوکری کرتے ہیں۔ دن رات نحوست اور جان کا خطرہ اور اگر طبیعت میں جوش اور غصہ ہو تو پھر کیا ہی کہنے۔ ہر وقت غنڈوں بدمعاشوں سے متھا لگا رہتا ہے جان جی! میں نے تو ایک دن اسے بٹھا کر بڑے پیار محبت سے سمجھایا تھا۔ کہا تھا، میاں اتنا ہی کام کرو جتنے کے پیسے لیتے ہو۔ جان کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ تم دو ٹکوں کی خاطر کیوں سر ہتھیلی پر لئے پھرتے ہو؟ کہنے لگا۔ سردار صاحب بات یہ ہے کہ......“

”بس کرو سردار!“ میں نے تلخی سے اس کی بات کاٹی۔ ”اب یہ ذکر زخموں پر نمک چھڑکتا ہے۔“

وہ گہری نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ نہ جانے کیا سوچ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بڑی تیز چمک تھی۔ اس کا ایک ساتھی بولا۔ ”انسپکٹر صاحب کوئی کھوج ملا؟“

”نہیں ابھی تو کوئی نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔

سردار بدروک بولا۔ ”میں کوئی مدد کر سکتا ہوں؟“

میں نے کہا۔ ”اگر تم واقعی مدد کرنا چاہتے ہو تو پھر پوچھنے کی کیا ضرورت ہے؟“

اس نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا وہ دونوں باہر نکل گئے۔

سردار بدروک نے کہا۔ ”کیا ہم یہاں تسلی سے بات کر سکتے ہیں۔ میرا مطلب ہے یہ جگہ بات کرنے کے لئے محفوظ ہے؟“ میں نے ہاں میں جواب دیا۔

سردار بدروک نے میرے چہرے پر نظریں گاڑ کر کہا۔ ''مجھے تمہاری آنکھوں میں شک نظر آ رہا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''ہو سکتا ہے یہ تمہارے دل کا چور ہو۔''

وہ بے خوفی سے مسکرایا۔ ''انسپکٹر نواز خان، میرا خیال ہے پہلے تم اپنے ذہن کا گند صاف کرلو۔ ورنہ میری بات کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا......اگر تمہارے دل میں یہ شک ہے کہ سب انسپکٹر کو میں نے مروایا ہے تو تم تفتیش کے رستے پر پہلا قدم ہی غلط اٹھا رہے ہو۔ اس کے بعد تم جتنا سفر بھی کرو گے غلط ہوگا۔ انسپکٹر کی موت میں میرا کوئی ہاتھ نہیں۔''

میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''ٹھیک ہے، میں مان لیتا ہوں۔ اب تم بتاؤ کیا کھوج ہے تمہارے پاس؟''

وہ کہنے لگا۔ ''نہیں، تم اوپرے دل سے بات کر رہے ہو۔''

میں نے طنزیہ لہجے میں جواب دیا۔ ''نہیں، میں دل کی تہہ سے بول رہا ہوں۔ تم جو بتانا چاہتے ہو بتاؤ۔''

اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک مڑا تڑا کاغذ نکالا۔ کاغذ مجھے دکھانے سے پہلے بولا۔ ''انسپکٹر مجھ سے وعدہ کرو کہ اس سارے قصے میں میرا نام نہیں آئے گا۔''

میں نے وعدہ کیا کہ اس کی خواہش پوری کروں گا۔ اس نے کاغذ مجھے دیتے ہوئے کہا۔ ''جان جی! اس ایڈریس پر چلے جاؤ۔ لاڈلی نامی ایک عورت تمہیں ملے گی۔ اس عورت سے ملنے کے بعد تمہیں کسی سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔''

میں نے دیکھا کاغذ کے ٹکڑے پر برنالے کے ایک محلے کا ایڈریس تھا۔

''کون عورت ہے یہ؟'' میں نے پوچھا۔

سردار بدروک نے کرسی سے ٹیک لگا کر کہا۔ ''بال کرشن کو جانتے ہو؟ تھانیدار بال کرشن۔''

میں نے ذہن پر زور دیا اور مجھے یاد آیا کہ یہ وہی تھانیدار ہے جس سے کچھ عرصہ پہلے امرتسر میں اشفاق کی ٹکر ہوئی تھی۔ تھانیدار نے کسی دھوبی کو بغیر پرچہ کاٹے تھانے میں رکھا ہوا تھا اور اشفاق نے اس معاملے کی شکایت ڈی آئی جی صاحب سے کر کے تھانیدار کو معطل کرا دیا تھا......لیکن سردار بدروک بال کرشن کا نام کیوں لے رہا تھا یہ بات فوری طور پر میری سمجھ میں نہیں آئی۔ میں نے بدروک کی بات کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

''ہاں، میں جانتا ہوں بال کرشن کو۔ [illegible] اس معاملے سے کیا تعلق ہے؟''

سردار بدروک اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ ''میرا خیال ہے باقی کی باتیں تم لاڈلی سے پوچھنا۔ واپسی پر ملاقات ہوگی۔ میں اب چلتا ہوں رب راکھا۔''

وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا باہر نکل گیا۔

اسی روز شام کو میں برنالے کے ایک گنجان محلے میں ایک دومنزلہ مکان کے دروازے پر دستک رہا تھا۔ اس علاقے میں زیادہ تر سکھوں کے گھر تھے۔ کئی سکھ بچے گلی میں کھیلتے کودتے دکھائی دیئے۔ میں سادہ کپڑوں میں تھا اس لئے کسی نے میری طرف خاص طور پر توجہ نہیں دی۔ میری تیسری دستک پر ایک ننگ دھڑنگ سکھ باہر نکلا۔ میں نے اس سے مکیش کے بارے پوچھا (ایڈریس میں لاڈلی کے پتی کا نام مکیش ہی لکھا تھا) ننگ دھڑنگ سکھ شاید نشے میں تھا۔ اسے میری بات کی سمجھ ہی نہیں آئی یا شاید مکیش کا نام اس کے ذہن سے نکل گیا تھا۔ اس دوران سکھ کا پڑوسی بھی وہاں آ کھڑا ہوا۔ اس نے بھی میرا سوال سن لیا تھا۔ لنگوٹی پوش سکھ کے سر پر دو ہتھڑ مار کر اس نے کہا۔ ''فٹے منہ سردارا تیری یادداشت کا۔ بھائی صاحب تمہارے نئے کرائے دار کے بارے پوچھ رہے ہیں جو پچھلے ہفتے امرتسر سے آیا ہے۔''

ننگ دھڑنگ سکھ کو اب میری بات سمجھ میں آ گئی تھی۔ اس نے دروازے پر لگے ہوئے دو بٹنوں میں سے ایک دبایا۔ بالائی منزل کی ایک کھڑکی کھلی۔ ایک خوبصورت نسوانی چہرہ اپنی جھلک دکھلا کر غائب ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک بادامی رنگ کا گول مٹول شخص سیڑھیوں سے برآمد ہوا۔ مجھے اوپر سے نیچے تک گھورنے کے بعد بولا۔ ''کس سے ملنا ہے؟''

میں نے کہا۔ ''سردار بدروک نے بھیجا ہے۔''

سردار بدروک کا نام سن کر وہ بُری طرح چونکا۔ اس کے ہاتھ خود بخود پرنام کرنے کے لئے اٹھ گئے۔ پھر وہ مجھے لے کر بغلی سیڑھیوں سے اوپر والی منزل پر آ گیا۔ یہاں ایک چندے ماہتاب جیسی عورت جسے تھوڑی سی رعایت کے ساتھ دوشیزہ بھی کہا جا سکتا تھا، ستون کے سہارے کھڑی تھی۔ کلائیوں میں ست رنگی چوڑیاں، گورے پاؤں میں گلابی سینڈل، سر پر لہریے دار دوپٹہ جس نے گردن تک پہنچتے پہنچتے چھوٹے سے گھونگھٹ کی شکل اختیار کر لی تھی۔

گول مٹول چہرے والے مکیش نے عورت سے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

''لاڈلی! یہ انسپکٹر نواز صاحب ہیں جن کے بارے کل سردار صاحب نے بتایا تھا۔''

لاڈلی نے فوراً ماتھے پر لے جا کر سلام کیا۔ اسے دیکھ کر ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ کوئی شریف عورت نہیں۔ اس اندازے کی تصدیق اگلے آدھ گھنٹے میں ہو گئی۔ لاڈلی امرتسر کی ایک مشہور رنڈی تھی۔ اس نے مجھے یہ بتا کر حیران کر دیا تھا کہ تھانیدار بال کرشن کے ساتھ اس کے بہت

پرانے تعلقات ہیں۔ وہ نہ صرف خود اس کے پاس آتا رہتا ہے بلکہ اپنے یاروں دوستوں کو بھی بھیجتا رہا ہے۔

میں نے لاڈلی کو توجہ سے دیکھا۔ اس کی عمر بیس اور پچیس کے درمیان تھی۔ رنگ صاف اور نقش خوبصورت تھے۔ ریشمی لباس میں اس کا جسم چیخ چیخ کر اپنی موجودگی کا اعلان کر رہا تھا۔ اس کے چہرے اور گردن پر مجھے کچھ چوٹوں کے نشان نظر آئے۔ یہ چوٹیں دو تین ہفتے پرانی تھیں۔ میں نے لاڈلی سے کہا کہ وہ جو کچھ بتانا چاہتی ہے کھل کر بتائے۔ میں پوری توجہ سے سن رہا ہوں۔

باتیں شروع ہوئیں تو لاڈلی نے پہلا انکشاف یہ کیا کہ سب انسپکٹر اشفاق کا قاتل کوئی اور نہیں خود بال کرشن ہے۔ مجھے پہلے ہی اس انکشاف کی توقع تھی۔ میں نے اس الزام کی وضاحت چاہی تو لاڈلی یوں گویا ہوئی۔

''انسپکٹر صاحب! سردار بدروک سنگھ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ پولیس مجھے اس کیس میں سلطانی گواہ بنائے گی۔ لہٰذا میں آپ سے کچھ بھی چھپانا نہیں چاہتی۔ حقیقت یہ ہے کہ بال کرشن پولیس کی وردی میں ایک لٹیرا اور ڈاکو ہے۔ میں آپ کو اس کے کون کون سے جرم گنواؤں۔ وہ انسان کہلانے کے لائق ہی نہیں ہے۔ جیسا کہ آپ بھی جانتے ہوں گے سب انسپکٹر اشفاق سے اس کی خاصی دشمنی تھی۔ جس دن سے وہ معطل ہوا اسی دن سے اشفاق کو نقصان پہنچانے کی فکر میں تھا۔ پولیس میں اس کے بہت سے یارانے ہیں۔ انہی یارانوں کی وجہ سے وہ نہ صرف ملازمت پر بحال ہوا بلکہ اس نے اشفاق کا تبادلہ بھی رنگ کوٹ کی دور دراز چوکی میں کرا دیا۔ مگر اس تبادلے سے اس کے سینے کی آگ ٹھنڈی نہیں ہوئی۔ یہ آگ صرف سب انسپکٹر کے خون سے ٹھنڈی ہو سکتی تھی۔ وہ سب انسپکٹر کو جان سے مارنے کا پختہ ارادہ کر چکا تھا اور اس کام کے لئے موقع کی تلاش میں تھا۔ تین چار ماہ پہلے اسے معلوم ہوا کہ روتک کی چوکی میں سب انسپکٹر کا جھگڑا سردار بدروک سے چل نکلا ہے۔ اس نے اس جھگڑے پر گہری نظر رکھنی شروع کر دی۔ روتک میں بال کرشن کا ایک مخبر موجود تھا۔ وہ گاہے بگاہے امرتسر پہنچ کر اسے بتاتا رہتا تھا کہ گاؤں میں سردار بدروک اور اشفاق کی دشمنی کیا رخ اختیار کر رہی ہے۔ انہی دنوں بال کرشن نے ایک خطرناک منصوبہ بنایا۔ یہ منصوبہ چونکہ میرے سامنے بنا تھا اس لئے میں سب کچھ جانتی ہوں۔ بال کرشن نے سوچا کہ اگر روتک چوکی میں اشفاق کو قتل کر دیا جائے تو اس کا الزام لازماً سردار بدروک کے سر آئے گا۔ ایک دن بال کرشن میرے پاس آیا کہنے لگا لاڈلی ایک کام کرو۔ تین ایسے بندوں کا بندوبست کرو جو بر نالے جا کر

سب انسپکٹر اشفاق کو ٹھکانے لگا سکیں۔ بال کرشن کے کہنے پر میں نے بادل سنگھ سے بات کی۔ بادل سنگھ ایک چھٹا ہوا بدمعاش اور قاتل ہے۔ وہ جب امرتسر میں ہوتا ہے تو ہفتے میں کم از کم ایک رات ضرور میرے پاس گزارتا ہے۔ پچھلے دس سال سے اس کا یہی دستور رہا ہے۔ اس ہفتے جب وہ میرے پاس آیا تو میں نے انسپکٹر بال کرشن سے اس کی ملاقات کرا دی۔ میرے کمرے میں ہی بیٹھ کر ان لوگوں نے سارا منصوبہ بنایا۔ انہوں نے طے کیا کہ واردات دیہاتی لباس میں کی جائے گی۔ پستول یا رائفل کی بجائے خنجر سے کام لینے کا فیصلہ کیا گیا کیونکہ سردار بدروک سنگھ کے زیادہ تر کارندوں کے پاس خنجر یا کرپانیں ہوتی ہیں۔''

لاڈلی کی باتیں میرے لئے حیران کن تھیں لیکن ان میں وزن تھا۔ میں نے لاڈلی سے پوچھا۔ ''لاڈلی بائی! تم مجھے یہ سب کچھ کیوں بتا رہی ہو؟''

وہ بولی۔ ''تھانیدار صاحب! میں نے آپ سے وعدہ کیا ہے کہ کچھ نہیں چھپاؤں گی۔ اس لئے وہ کچھ بھی بتا دینا چاہتی ہوں جو کسی کو نہ بتاتی۔ پورے پانچ سال بال کرشن سے میرا معاملہ رہا ہے۔ اس عرصے میں کبھی اسے شکایت کا موقع نہیں دیا۔ ہر کام اس کے لئے کیا ہے۔ بال کرشن نے میرے ذریعے کئی بے گناہوں کو پھنسایا ہے اور کئی بدنصیبوں کی زندگیاں اجیرن کی ہیں۔ وقت آنے پر میں آپ کو ایک ایک بات بتا دوں گی لیکن میری اس وفاداری کا صلہ بال کرشن نے مجھے کیا دیا۔ یہ دیکھئے میری گردن اور میرے چہرے پر آپ کو نشان نظر آ رہے ہوں گے۔ یہ انعام دیا ہے اس نے میری وفاداریوں کا۔'' پھر وہ تیزی سے اٹھی اور ایک صندوق کے اندر سے کوئی کپڑا نکال کر میرے سامنے پھینک دیا۔ یہ ایک زنانہ لباس تھا لیکن اسے لباس کہنا مشکل تھا کیونکہ اسے نہایت بے رحمی سے تار تار کر دیا گیا تھا۔ وہ بولی۔ ''یہ دیکھئے، یہ صلہ دیا بال کرشن نے مجھے تعلق داری کا۔''

میں نے لباس کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور پوچھا۔ ''یہ سب کیا ہے لاڈلی بائی؟''

وہ بولی۔ ''نواز صاحب۔ دو مہینے پہلے کی بات ہے، ایک رات تھانیدار بال کرشن کا ایک شرابی دوست میرے دروازے پر آیا۔ میں نے اس کے لئے اپنا دروازہ نہیں کھولا۔ وجہ بڑی معقول تھی۔ بُرے سے بُرے لوگوں کے بھی کچھ اصول ہوتے ہیں۔ ہمارے گھرانے میں رواج ہے کہ ہم ہر مہینے چاند کی بارہ اور تیرہ تاریخ کو دھندا نہیں کرتے۔ نہ نیا کپڑا پہنا جاتا ہے، نہ ناچ گانا ہوتا ہے اور نہ کوئی اور کام۔ میرے اس اصول کا ہر ایک کو پتہ ہے اور بال کرشن کو بھی پتہ تھا۔ اس کے باوجود اس نے اپنے دوست کو میرے پاس بھیج دیا۔ اس شخص کا نام موہن کمار تھا۔ اسے مودی کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ مودی ایک اکھڑ مزاج زمیندار ہے۔ اسے

میرا انکار ناگوار گزرا۔ شراب اور دولت کے نشے میں اس نے زبردستی میرے گھر میں گھسنا چاہا لیکن میں اس کے راستے کی دیوار بن گئی۔ اس نے مجھے دھکا دیا تو میں نے تھپڑ مار دیا۔ مودی آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑا۔ نشے نے اسے پاگل کر رکھا تھا۔ اس نے گولی چلا کر میرے ایک بندے کو زخمی کر دیا پھر مجھے کھینچ کر بازار میں لے گیا۔ یہ لباس جو آپ دیکھ رہے ہیں اس وقت میرے جسم پر تھا۔ اب آپ خود اندازہ لگا لیں کہ اس نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا ہوگا۔ میرے جسم پر لباس کی ایک دھجی نہیں تھی اور وہ مجھے بالوں سے پکڑ کر سڑک پر گھسیٹ رہا تھا۔ اس کے دو ساتھی مسلسل ہوائی فائرنگ کر رہے تھے۔ شاید وہ شیطان اس سے بھی آگے بڑھ جاتا لیکن بازار کے بڑے بوڑھوں نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر اور اپنے سر کی عزت اس کے پاؤں میں رکھ کر میری جان چھڑائی۔ ٹھیک ہے میں ایک فاحشہ ہوں اور فاحشہ کی کوئی عزت نہیں ہوتی لیکن بے عزتی کی بھی ایک انتہا ہوتی ہے اور میں اس انتہا سے گزر چکی تھی۔ میرا دل چاہا کہ میں خودکشی کر لوں لیکن میری خودکشی سے مودی کا کیا جاتا تھا۔ میں اگلے روز تار تار لباس کے ساتھ بال کرشن کے پاس پہنچی اور اسے ماجرا سنایا۔ بال کرشن نے مجھے جھوٹی تسلیاں دے کر واپس بھیج دیا۔ بال کرشن کے رویے نے مجھے سخت مایوس کیا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ مجھ پر گزرنے والی قیامت کی بال کرشن کو کوئی پرواہ نہیں۔ اگر میرے ساتھ اس سے بھی زیادہ ہو جاتا تو بال کرشن اپنے حال میں مست رہتا۔ میرا دل خون کے آنسو رونے لگا۔ اگلے چند دن میں یہ بات ثابت ہو گئی کہ بال کرشن اس شیطان مودی کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرے گا بلکہ اگر میں نے اس پر زیادہ دباؤ ڈالا تو وہ الٹا مجھ پر چڑھ دوڑے گا۔ میرے سینے میں بال کرشن اور مودی کے خلاف انتقام کی آگ بھڑکنے لگی۔ پچھلے دنوں ایک محفل میں اتفاقاً میری ملاقات سردار بدروک صاحب سے ہو گئی۔ میں نے ان سے اپنا دکھ بیان کیا تو انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ ہر طرح میری مدد کریں گے۔''

میں نے پوری بات سننے کے بعد لاڈلی سے کہا۔ ''دیکھو لاڈلی بائی۔ صرف سلطانی گواہ بن جانا ہی کافی نہیں۔ اگر تم سمجھتی ہو کہ اشفاق کو قتل کرانے والا تھانیدار بال کرشن ہے تو تمہیں ٹھوس ثبوت دینے ہوں گے۔''

وہ اعتماد سے بولی۔ ''میں سارے ثبوت دوں گی تھانیدار صاحب اور صرف اس قتل کے ثبوت ہی نہیں دوں گی، بال کرشن کے بارے اور بھی بہت کچھ بتاؤں گی۔''

☆======☆======☆

لاڈلی سے بات چیت کے بعد میں برنالہ سے رنگ کوٹ کے تھانے واپس آ گیا۔ وہاں

پہلے سے ڈی ایس پی دلجیت کا ایک حوالدار آیا بیٹھا تھا۔ وہ میرے نام امرتسر سے ڈی ایس پی دلجیت کا ایک تفصیلی خط لایا تھا۔ اس خط میں ڈی ایس پی نے لکھا تھا کہ بعض اطلاعات کے مطابق امرتسر کا انسپکٹر بال کرشن اشفاق کے قتل میں ملوث ہے۔ اس سلسلے میں چند ثبوت بھی ہاتھ آ گئے ہیں۔ اندازہ ہوتا ہے کہ بال کرشن نے ایک بدمعاش بادل سنگھ کے ذریعے اشفاق کو قتل کرایا ہے۔ ڈی ایس پی صاحب نے مجھے ہدایت کی تھی کہ میں فوراً امرتسر پہنچوں۔ انہوں نے اپنے خط میں لاڈلی کا ذکر بھی کیا تھا اور کہا تھا کہ یہ عورت اس کیس میں اہم گواہ بن سکتی ہے لہٰذا ہو سکے تو میں اسے بھی ساتھ ہی امرتسر لے آؤں۔

ہدایت کے مطابق میں اگلے روز علی الصبح لاڈلی بائی اور اس کے منہ بولے پتی کے ساتھ امرتسر روانہ ہو گیا۔ جس وقت ہم امرتسر پہنچے پولیس ہیڈکوارٹر میں اعلیٰ افسروں کی میٹنگ ہو رہی تھی۔ مجھے فوراً اس میٹنگ میں طلب کر لیا گیا۔ میٹنگ میں جو بات چیت ہو رہی تھی اس سے میں نے دو باتوں کا اندازہ لگایا۔ ایک تو یہ کہ زیادہ تر پولیس افسر بال کرشن سے نالاں تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ شخص محکمے کی بدنامی کے سوا کوئی کام انجام نہیں دے رہا۔ دوسری بات یہ کہ وہ اس سارے معاملے میں سردار بدروک سے ٹکراؤ کا خطرہ مول لینا نہیں چاہتے تھے۔ دوسرے لفظوں میں کہا جا سکتا ہے کہ تمام افسران کی دلی خواہش تھی کہ انسپکٹر بال کرشن پر جرم ثابت ہو جائے اور یوں پولیس کو سردار بدروک کے ہاتھوں پر سب انسپکٹر اشفاق کا خون تلاش نہ کرنا پڑے۔ وہ مجھے بھی یہی بات سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے کہ میں اپنی تفتیش کا رخ بال کرشن کی طرف موڑ دوں اور سردار بدروک سے الجھنے کی کوشش نہ کروں۔ مجھے اس میں کوئی اعتراض نہیں تھا۔ مجھے تو سب انسپکٹر کا قاتل درکار تھا۔ چاہے وہ روہتک کی کالی حویلی میں ہوتا یا امرتسر کے تھانے میں لیکن ایک بات طے تھی میں سردار بدروک کے خوف سے یا اپنے افسروں کے مجبور کرنے سے کسی بے گناہ کو تختہ دار تک پہنچانے کا جرم نہیں کر سکتا تھا۔ میرے سینے کی آگ اسی وقت بجھ سکتی تھی جب اشفاق کا اصل قاتل کیفر کردار کو پہنچتا۔

امرتسر میں میرا قیام پندرہ بیس روز رہا۔ اس دوران میں نے نہایت خاموشی کے ساتھ بال کرشن کے خلاف تحقیقات کی۔ اس کام میں لاڈلی بائی میرا پورا ساتھ دے رہی تھی۔ اس نے بال کرشن کی زندگی کے بہت سے تاریک گوشے بے نقاب کر دیئے۔ قانون جاننے والے مجرموں میں ایک خاص وصف یہ ہوتا ہے کہ وہ ہر کام ہاتھ پاؤں بچا کر کرتے ہیں۔ ان پر گرفت کرتے ہوئے تفتیشی اہلکار کو دانتوں پسینہ آ جاتا ہے۔ تھانیدار بال کرشن کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا تھا کہ شہر میں کم از کم چار قمار خانے اور

منشیات کے اڈے بال کرشن کی سرپرستی میں چل رہے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ ایک بدنام قحبہ خانہ سے بھی بھتہ وصول کرتا تھا لیکن ان جرائم کا کوئی ثبوت نہیں تھا۔ تھانیدار بال کرشن نے تین شادیاں کر رکھی تھیں۔ اس کی آخری بیوی ایک کم عمر لڑکی تھی۔ تین بیویوں سے اس کے کوئی پندرہ عدد بچے تھے۔ اتنے بڑے گھرانے کے اخراجات پورے کرنے کے لئے بال کرشن ہر ناجائز وغیر قانونی کام کر گزرتا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ چند سال پہلے بال کرشن نے ایک تنازعے کی وجہ سے امرتسر کالج کے دو نوجوانوں کو قتل کیا۔ بعد ازاں انہیں اٹاری بارڈرز کے نزدیک کھیتوں میں پھینک دیا اور کہا کہ یہ ڈاکو تھے، پولیس مقابلے میں ہلاک ہوئے ہیں۔ ایک پولیس والے کی حیثیت سے میں جانتا تھا کہ بال کرشن کے ایسے جرائم کو عدالت میں ثابت کرنا خواب وخیال کی بات ہے۔ اگر بال کرشن کسی جرم میں سزا پا سکتا تھا تو وہ اشفاق کے قتل کا جرم تھا۔ جس کے لئے ایک سلطانی گواہ موجود تھا اور کچھ دوسرے ثبوت بھی مہیا تھے مگر عجیب اور دلچسپ بات یہ تھی کہ اشفاق کو بال کرشن نے قتل نہیں کیا تھا...... یوں ایک طرح سے یہ میری زندگی کا ایک انوکھا کیس بن جاتا ہے۔ یہ میری ملازمت کا واحد کیس ہے جس میں مَیں نے ایک پولیس مین کی بجائے صرف ''مین'' بن کر سوچا اور اس درد کو محسوس کیا جو جرم کی دراز دستی اور قانون کی لاچاری سے جنم لیتا ہے۔ پہلی بار میرے دل میں یہ خواہش جاگی کہ اگر مجھے تھوڑی بہت بے اصولی بھی کرنی پڑے تو میں ایک سکے بند مجرم کو بچ کر نہ جانے دوں۔

امرتسر میں مَیں ڈی ایس پی دلجیت کے دیئے ہوئے ایک مکان میں رہ رہا تھا۔ وہاں لاڈلی اور اس کا پتی بھی میرے ساتھ تھے۔ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ میں امرتسر میں ہوں اور بال کرشن کے خلاف تحقیقات کر رہا ہوں۔ ایک شام میں کمرے میں بیٹھا لاڈلی کے پتی سے بات چیت کر رہا تھا کہ ہیڈکوارٹر سے ڈی ایس پی دلجیت صاحب کا فون آ گیا۔ تفتیش کے بارے پوچھنے لگے۔ وہ ایک روز پہلے تھانیدار بال کرشن اور اس کے کارندے بادل سنگھ کو گرفتار کر چکے تھے۔ اب وہ چاہتے تھے کہ جلد از جلد چالان مکمل کر کے عدالت میں بھیج دیا جائے۔ ان کے لہجے کی بے صبری میں صاف محسوس کر رہا تھا۔ درحقیقت اس بے صبری کے پیچھے بھی سردار بدروک کا خوف چھپا ہوا تھا۔ ڈی ایس پی صاحب چاہتے تھے کہ جلد از جلد یہ معاملہ ختم ہو اور میں خواہ مخواہ خطرہ مول لینے سے بچ جاؤں۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ جسے وہ انجام سمجھ رہے ہیں وہ آغاز ہے اور میں وہی کچھ کرنے والا ہوں جس کا اندیشہ انہیں بے چین رکھتا ہے۔

ڈی ایس پی سے گفتگو ختم کرنے کے بعد میں نے لاڈلی بائی سے کھل کر بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں جانتا تھا وہ مجھے اور قانون کو دھوکا دے رہی ہے۔ اشفاق کیس کے بارے میں اس نے جو کچھ بتایا ہے وہ جھوٹ کا پلندہ ہے۔ میں اس سے اس جھوٹ کا اعتراف کرانا چاہتا تھا۔ اعتراف کرانے کا ایک طریقہ تو یہ تھا کہ لاڈلی بائی کو آڑے ہاتھوں لیا جاتا مگر اس میں خطرات پوشیدہ تھے۔ دوسرا راستہ نرم رویہ اختیار کرنے کا تھا۔ میں نے یہی راستہ اپنایا۔ شام سے تھوڑی دیر پہلے میں نے لاڈلی کے منہ بولے پتی کو ایک ضروری کام سے کمپنی باغ بھیج دیا۔ کام ایسا تھا کہ وہ رات گیارہ بارہ بجے سے پہلے لوٹ نہیں سکتا تھا۔ وہ چلا گیا تو میں نے لاڈلی بائی کو بالائی منزل پر اپنے کمرے میں بلا لیا۔ ہمیں اس مکان میں ایک ساتھ رہتے قریباً تین ہفتے ہو چکے تھے۔ وہ اب مجھ سے کافی بے تکلف تھی۔ کبھی کبھی مجھے اس کی آنکھوں میں پسندیدگی کی ہلکی سی جھلک بھی نظر آ جاتی تھی۔ پیشہ ور ہونے کے باوجود وہ بڑی بھرپور اور شاداب صورت تھی۔ اس کا جسم ہر وقت لباس سے برسرپیکار نظر آتا تھا۔ ایک ایسے قیدی کی طرح جسے ایک پل دیواروں کے پیچھے رہنا قبول نہ ہو۔ اگر بلال شاہ ان دنوں میرے ساتھ ہوتا تو ضرور کوئی نہ کوئی پھڈا ہو جاتا۔ اسے یہ ہرگز پسند نہیں تھا کہ کوئی عورت کسی بھی وجہ سے میری طرف متوجہ ہو۔ ایسے معاملوں میں اس کا کردار سڑیل مزاج شکی بیوی کا سا ہو جاتا تھا۔

اپنے مطلب کے لئے میں نے لاڈلی سے لگاوٹ کی باتیں کیں۔ وہ کچھ ڈانواں ڈول نظر آنے لگی۔ جلد ہی میں اسے اپنے ڈھب پر لے آیا۔ اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے میں نے کہا۔

''لاڈلی، ایک بات بتاؤ۔ تم بال کرشن کے خلاف سلطانی گواہ کیوں بنی ہو؟''

وہ بولی۔ ''کئی بار تو بتا چکی ہوں بال کرشن نے میرے ساتھ غداری کی۔ اس کے یار نے میرے کپڑے پھاڑے، مجھے گلیوں میں گھسیٹا اور بال کرشن چپ رہا۔ یہ کوئی چھوٹی بات تو نہیں ہے۔''

میں نے کہا۔ ''واقعی چھوٹی بات نہیں ہے۔ بال کرشن کو سزا ملنی چاہئے تھی اور اب وہ مل کر رہے گی۔ پھانسی سے بچ بھی گیا تو ساری عمر کے لئے جیل کی سلاخیں اس کا مقدر ہیں لیکن کیا تم چاہو گی کہ تمہارا مجرم تو سزا پا جائے لیکن میرا مجرم بچا رہے اور آزادی سے زمین پر دندناتا رہے۔''

اس نے پوچھا۔ ''کون ہے تمہارا مجرم؟''

میں نے کہا۔ ''اشفاق کا قاتل۔''

وہ بولی۔ ''اشفاق کا قاتل بال کرشن ہے۔''

''نہیں لاڈلی۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اشفاق کا قاتل بال کرشن نہیں ہے اور یہ تم بھی اچھی طرح جانتی ہو۔''

لاڈلی کے چہرے پر رنگ سا آکر گزر گیا۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''لاڈلی! گھبراؤ مت۔ بال کرشن سزا ضرور پائے گا۔ یہ تم سے میرا وعدہ ہے لیکن تمہیں مجھے سب کچھ بتانا ہوگا۔ ایسا نہ کرو گی تو کیس پر ہماری گرفت نہیں رہے گی اور بال کرشن کسی بھی موقع پر بچ نکلے گا۔ تم اچھی طرح جانتی ہو پولیس میں اس کی بہت سی دوستیاں ہیں اور یہ دوستیاں اسے کسی بھی وقت فائدہ پہنچا سکتی ہیں۔''

میں کافی دیر لاڈلی سے مغز کھپاتا رہا آخر وہ میری خواہش کے مطابق بولنے پر رضامند ہوگئی۔ اس نے ڈیڑھ دو گھنٹے میں مجھے جو کچھ بتایا اس کا مختصر ترین خاکہ میرے الفاظ میں یہ ہے۔

تھانیدار بال کرشن کے دوست نے واقعی لاڈلی کے ساتھ بہت بُرا سلوک کیا تھا۔ لاڈلی کو اس بات کا بہت رنج تھا لیکن وہ بال کرشن سے ٹکر لینے کی ہمت نہیں رکھتی تھی۔ انہی دنوں لاڈلی کی ملاقات ایک محفل میں سردار بدروک سے ہوگئی۔ سردار کو لاڈلی کا ناچ گانا بہت پسند آیا۔ لاڈلی نے سردار بدروک کے سامنے اپنا رونا رویا اور بال کرشن کا ذکر بُرے لفظوں میں کیا۔ سردار بدروک نے اپنے طور پر بال کرشن کا پتہ کرایا تو اسے معلوم ہوا کہ یہی وہ تھانیدار ہے جس نے عداوت کی وجہ سے سب انسپکٹر اشفاق کا تبادلہ روتک چوکی میں کروایا تھا۔ یہ بات معلوم ہونے کے بعد سردار بدروک نے لاڈلی سے ملاقات کی اور اسے بتایا کہ اس کا مسئلہ حل ہوگیا ہے۔ اس نے کہا کہ تین ماہ پہلے اشفاق نامی ایک سب انسپکٹر قتل ہوا تھا۔ اگر لاڈلی سلطانی گواہ کا پارٹ ادا کرے تو اس قتل کا الزام تھانیدار بال کرشن کے سر آسکتا ہے۔ بدلے کی آگ میں تپتی ہوئی لاڈلی نے یہ شرط قبول کر لی اور بال کرشن کے خلاف گواہی دینے پر آمادہ ہوگئی۔

بعد کے واقعات مجھے معلوم ہی تھے (قارئین بھی جانتے ہیں) ایک طرح سے اس داستان کا ایک باب یہاں ختم ہو جاتا ہے۔ بال کرشن کو قدرت سزا دے رہی تھی۔ ایک بُرے شخص کی کوششوں سے ایک بُرے شخص کا خاتمہ ہو رہا تھا۔ نہ صرف قانونی طور پر بال کرشن کی سزا کا راستہ ہموار نظر آتا تھا بلکہ ماحول بھی ایسا بن گیا تھا کہ ہر کوئی بال کرشن کو عدالت کے کٹہرے میں دیکھنا چاہتا تھا۔ یہ عملِ مکافات تھا۔ میں اس کے راستے میں آنے والا کون تھا۔

جس روز میں نے بال کرشن اور اس کے ساتھی بادل سنگھ کا چالان مکمل کر کے عدالت میں پیش کیا اسی روز مجھے یقین ہوگیا کہ وہ دونوں عمر قید سے بچ نہیں سکیں گے۔ میری نگاہوں میں ہنستے مسکراتے اشفاق کی شبیہہ گھومنے لگی۔ میں نے تصور ہی تصور میں اس شبیہہ کو مخاطب کیا اور کہا۔ ''اشفاق! میں نے تجھے موت کے منہ میں دھکیلنے والے شخص کو آہنی سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیا ہے۔ اب تمہارے قاتل کی باری ہے۔''

☆======☆======☆

میں رنگ کوٹ کے تھانے میں بیٹھا اس پرانی فائل پر سے گرد جھاڑ رہا تھا۔ جو تین ماہ پہلے میں نے سب انسپکٹر اشفاق کو دکھائی تھی اور اسے بتایا تھا کہ ماضی میں ٹمانوں کی کارگزاریاں کیا رہی ہیں۔ تین ماہ پہلے میں نے اس فائل کے ذریعے اشفاق کی سرکشی کو لگام ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ آج اسی فائل کو کھول کر میں خود سرکشی کی راہ اختیار کر رہا تھا۔ میں نے کئی بار اس فائل کا بغور معائنہ کیا تھا۔ یوں تو اس میں کئی کیس تھے لیکن ایک کیس ایسا تھا جسے ہمت کر کے دوبارہ کھولا جاتا اور اس پر تھوڑی سی محنت کی جاتی تو ٹمانوں کو دن میں تارے نظر آسکتے تھے۔ کتنی عجیب بات تھی میں اشفاق کے قاتل کو انجام تک پہنچانا چاہتا تھا مگر اس کے لئے مجھے ایک ایسے کیس کو ''ری اوپن'' کرنا پڑ رہا تھا جس کا اشفاق یا اس کے قتل سے دور کا تعلق بھی نہیں تھا۔ یہ قانونی مجبوری تھی جسے صرف میں سمجھ سکتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اشفاق قتل کیس میں ٹمانوں نے کوئی اہم ثبوت نہیں چھوڑا اور اگر میں نے اس کیس کی تفتیش شروع کی تو ناکامی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔ تو پھر کیوں نہ دشمن سے دو دو ہاتھ کرنے کے لئے اپنی پسند کا میدان چنا جاتا۔ یہ ٹمانوں کے ساتھ میری کھلی جنگ تھی اور جنگ میں ہر حربہ آزمایا جاتا ہے۔ میں بہت پہلے فیصلہ کر چکا تھا کہ مجھے بدروک سنگھ ٹمانہ کو کس میدان میں للکارنا ہے۔ جو کیس میں ''ری اوپن'' کرنے جا رہا تھا وہ قریباً تین سال پہلے رجسٹر ہوا تھا۔ رجسٹر کرنے والے انسپکٹر کا نام راجپال سنگھ تھا۔ مجھے کچھ کچھ یاد آ رہا تھا کہ میں اس نام کے ایک ہوشیار پوری انسپکٹر کو پہلے سے جانتا ہوں۔ تین سال پہلے 30 دسمبر کی رات کو ساڑھے گیارہ بجے جو ایف آئی آر لکھی گئی وہ ایک انگریز خاتون مسز ماریا ڈوگلس کی طرف سے تھی۔ ماریا ڈوگلس ڈاکٹر تھی اور رفاہی جذبے سے دور دراز دیہاتی علاقوں میں لوگوں کی خدمت کر رہی تھی۔ 30 دسمبر کی رات دس بجے کے قریب یہ انگلش لیڈی رنگ کوٹ کے نواحی گاؤں میں ایک مریض کو دیکھنے کے بعد واپس برنالہ جا رہی تھی۔ وہ ذاتی گھوڑا گاڑی میں سوار تھی۔ اس کے ساتھ ایک کوچوان تھا۔ ابھی ان کی گاڑی برنالہ جانے والی پختہ سڑک سے چند فرلانگ دور تھی کہ منز

ماریا کو چند نیم پختہ جھونپڑے نظر آئے۔ یہ کھیت مزدوروں کی بستی تھی۔ یہاں کوئی ہنگامہ ہو رہا تھا۔ لالٹینوں کی روشنی میں درجنوں افراد یہاں وہاں کھڑے تھے۔ دو گھڑ سوار ایک نوجوان کو رائفلوں کے کندوں سے بُری طرح مار رہے تھے۔ نوجوان گڑگڑا رہا تھا اور رحم کی بھیک مانگ رہا تھا لیکن گھڑسواروں کے ہاتھ رکنے میں نہیں آ رہے تھے۔ یہ منظر دیکھ کر مسز ماریا گاڑی سے اُتری اور غریب مزارعہ کی مدد کو لپکی لیکن اس کے پہنچنے سے پہلے ہی اونچی پگڑی والے ایک گھڑسوار نے اپنی رائفل کی نال غریب مزارعے کے منہ میں گھسیڑ کر لبلبی دبا دی۔ بدنصیب شخص موقع پر ہی ٹھنڈا ہو گیا۔ مسز ماریا نے قاتل کو پہچان لیا۔ وہ روتک کا معروف چوہدری سردار بدروک سنگھ تھا۔ مسز ماریا ایک دفعہ اس کی حاملہ بیوی کا علاج کر چکی تھی۔ مسز ماریا نے سردار بدروک کا گریبان پکڑ لیا اور چیخ کر کہا کہ وہ قاتل ہے۔ وہ اس کے خلاف رپورٹ درج کرائے گی اور عدالت میں گواہی دے گی اور واقعی اس نے ایسا کر دکھایا۔ وہ واپس رنگ کوٹ تھانے پہنچی اور قتل کی رپورٹ کردی۔ اس نے کہا کہ وہ چشم دید گواہ ہے اور جب بھی اس کی ضرورت ہوگی وہ گواہی دینے کے لئے حاضر ہو جائے گی۔ اس نے برنالے میں اپنا ایڈریس بھی لکھوایا...... لیکن جب پندرہ روز بعد پولیس اس کے دیئے ہوئے ایڈریس پر پہنچی تو معلوم ہوا کہ وہ برنالے سے نقل مکانی کر کے دہلی جا چکی ہے۔ دہلی میں اس کا ایڈریس ڈھونڈا گیا لیکن ناکامی ہوئی۔ صرف اتنا معلوم ہوا کہ وہ دہلی پہنچی تھی۔ تفتیش کرنے والے انسپکٹر نے یہ نتیجہ نکالا کہ مسز ماریا نے جوش میں آ کر گواہی دینے کا اعلان تو کیا تھا لیکن پھر وہ اپنے ارادے پر قائم نہ رہ سکی۔ خواہ مخواہ کی دشمنیاں مول لینے کی بجائے اس نے اس معاملے سے کنارہ کشی بہتر سمجھی۔ سردار بدروک کے خلاف اور بھی کوئی گواہی نہیں مل سکی تھی لہٰذا کیس میں جان نہ پڑ سکی۔ انسپکٹر راجپال سنگھ نے چند ہفتوں کی بے مقصد تفتیش کے بعد کیس داخل دفتر کر دیا۔ یاد رہے کہ بے رحمانہ قتل کی یہ واردات درجنوں افراد کی موجودگی میں ہوئی تھی اس کے باوجود سردار بدروک کی دہشت نے کسی گواہ کو سامنے نہیں آنے دیا۔

اس کیس کا مکمل مطالعہ کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ مجھے کسی طرح انسپکٹر راجپال سنگھ سے ملنا چاہئے۔ اس واردات کی سب سے اہم اور اکلوتی گواہ مسز ماریا تھی۔ وہ ایک انگریز ڈاکٹر تھی اور ان دنوں انگریز کی گواہی کو بے حد اہمیت حاصل ہوتی تھی۔ اگر یہ گواہ عدالت تک پہنچ جاتی تو بدروک سنگھ کو اپنی گردن بچانا مشکل ہو جاتی۔ اس گواہ کا غائب ہونا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ عین ممکن تھا کہ مسز ماریا کو جان بوجھ کر منظر سے ہٹایا گیا ہو۔ بدروک سنگھ جیسے شخص کے لئے کوئی کام بھی ناممکن نہیں تھا۔ اس سلسلے میں وہ انسپکٹر راجپال کو

بھی اپنا آلہ کار بنا سکتا تھا۔

میں نے اپنے طور پر انسپکٹر راجپال کا کھوج لگایا۔ یہ جان کر مجھے خوشی ہوئی کہ وہ اسی ضلع کے ایک تھانے میں ہے۔ یہ تھانہ برنالہ کے نواح میں واقع تھا۔ اگلے روز میں نے پانچ چھ گھنٹے کا وقت نکالا اور جیپ لے کر راجپال سنگھ کے پاس جا پہنچا۔ راجپال سنگھ مجھے دیکھتے ہی پہچان گیا۔ ایک زمانے میں ہم اکٹھے کام کرتے رہے تھے اور خاصے بے تکلف تھے۔ راجپال نے خوب آؤ بھگت کی۔ پہلے دودھ مٹھائی سے تواضع کی پھر لمبا چوڑا دسترخوان لگوا دیا۔ ساتھ ساتھ باتوں کا سلسلہ بھی چلتا رہا۔ جب میں نے راجپال کو بتایا کہ میں نے بدروک کے خلاف ایک تین برس پرانے کیس کو دوبارہ کھولا ہے تو وہ خوفزدہ نظر آنے لگا۔ میں نے اسے پوری تفصیل بتائی کہ یہ کیس مجھے کیوں اور کیسے کھولنا پڑا۔ میں نے راجپال سنگھ سے مسز ماریا والے چکر کے بارے پوچھا تو اس نے پرانی دوستی کا بھرم رکھتے ہوئے سب کچھ سچائی اور سادگی سے بتا دیا۔ کہنے لگا۔

"نواز یار! تمہیں پتہ ہی ہے دریا میں رہ کر مگرمچھ سے بیر نہیں رکھا جا سکتا اور یہ ٹمانے تو جب چاہیں تھانیدار کی وردی اُتروا کر ہاتھ میں پکڑا سکتے ہیں۔ میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ بدروک سنگھ کے دباؤ میں آ کر میں نے اس وقت ٹمانوں کی سائیڈ لی تھی۔ میرے خیال میں میری جگہ کوئی بھی تھانیدار ہوتا یہی کرتا۔ جس روز انگریز لیڈی نے انجیل پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی تھی کہ وہ گواہی ضرور دے گی، بدروک سنگھ صاحب کو دن میں تارے نظر آ گئے تھے۔ مجھ سے کہنے لگا......"

میں نے کہا۔ "راجپال یار! مجھے شروع سے بتا یہ کیا قصہ ہے؟"

وہ بولا۔ "زیادہ لمبا قصہ نہیں ہے۔ پہلے کی باتیں تو تُو جانتا ہی ہے۔ بدروک سنگھ کو جب یہ پتہ چلا کہ مسز ماریا نے اس کے خلاف رپورٹ درج کرائی ہے اور عدالت میں بھی گواہی دینے کا اعلان کیا ہے تو اس نے مجھے حویلی میں بلایا کہ مسز ماریا کو رام کرنے کی کوشش کروں اور اسے سمجھاؤں کہ گواہی دینے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ بدروک سنگھ کی ہدایت پر میں تین دفعہ برنالے گیا لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ مسز ماریا اپنے فیصلے پر اٹل تھیں۔ تیسری دفعہ جب میں گیا تو مسز ماریا نے اس مقدس کتاب پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی کہ وہ گواہی دینے سے پیچھے نہیں ہٹے گی چاہے اس کی جان بھی چلی جائے۔ میں نے یہ سب کچھ جا کر بدروک سنگھ کو بتایا۔ بدروک سنگھ نے اسی وقت اپنے خونخوار کارندے کالو کو ساتھ لیا اور مسز ماریا کی طرف روانہ ہوا۔ بدروک کے پاس نوٹوں سے بھرا ہوا ایک تھیلا تھا اور کالو کے پاس گولیوں سے بھرا

ہوا پستول۔ وہ یہ دونوں چیزیں ماریا کے لئے لے کر جا رہے تھے۔ ان کا ارادہ تھا کہ پہلے انگلش لیڈی کو نوٹوں سے بھرا ہوا تھیلا پیش کریں گے اور اگر وہ اسے قبول نہ ہوا تو پھر پستول کی زبان میں بات کریں گے لیکن وہ اپنے منصوبے پر پوری طرح عمل نہ کر سکے۔ ان کے برنالے پہنچنے سے پہلے ہی مسز ماریا اپنے ملازم اور باورچن کے ساتھ برنالے سے دہلی روانہ ہو چکی تھی۔ غالباً اس نے محسوس کر لیا تھا کہ یہاں اس کی جان کو خطرہ ہے اور وہ دہلی جا کر بدروک سنگھ کے شر سے محفوظ رہے گی۔''

یہاں تک بتا کر راجپال سنگھ خاموش ہو گیا۔ میری سوالیہ نظریں اس کے چہرے پر جمی تھیں۔ وہ کچھ دیر اپنی داڑھی کھجاتا رہا پھر گہری سانس لے کر بولا۔ ''نواز یار! اس کے بعد مجھے معلوم نہیں کہ کیا ہوا۔ میں نے ایک دو مرتبہ پوچھنے کی کوشش کی تھی لیکن بدروک سنگھ ہنس کر ٹال گیا اور جب وہ سؤر کوئی بات چھپانا چاہتا ہے تو پھر اس سے پوچھنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ میرے خیال میں تین صورتیں ہو سکتی ہیں۔ پہلی یہ کہ مسز ماریا کی قسمت نے یاوری کی ہو اور وہ واقعی بدروک سنگھ اور کالو سے بچ کر نکل گئی ہو۔ دوسری صورت (جس کا زیادہ امکان ہے) یہ ہے کہ بدروک سنگھ اور کالو نے اسے راستے میں جا لیا ہو اور ملازموں سمیت قتل کر کے لاشیں غائب کر دی ہوں۔ تیسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ اسے مارا نہ گیا ہو بلکہ اغوا کر لیا گیا ہو اور وہ اب بھی کہیں بدروک سنگھ کی تحویل میں ہو۔''

مجھے معلوم تھا راجپال سنگھ مجھ سے جھوٹ نہیں بول رہا اور جو کچھ بھی اسے معلوم ہے اس نے بتا دیا ہے۔ اس تعاون پر میں نے راجپال کا شکریہ ادا کیا اور اس سے وعدہ کیا کہ یہاں ہونے والی باتیں ہم دونوں کے درمیان ہی رہیں گی۔

☆======☆======☆

راجپال سے ملنے کے بعد یہ بات ثابت ہو گئی کہ مسز ماریا نے آخر وقت تک گواہی دینے کا ارادہ نہیں بدلا تھا اور وہ غائب نہیں ہوئی بلکہ اسے غائب کیا گیا ہے۔ میں نے پورے زور و شور سے مسز ماریا کی تلاش شروع کرائی۔ سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ مقامی لوگوں نے ٹمانوں کے خلاف بیان نہ دینے کی قسم کھا رکھی تھی۔ وہ سب کچھ دیکھ کر طوطے کی طرح آنکھیں بند کر لیتے تھے۔ وہ سب جانتے تھے کہ گلاباں کو دو برس سے حویلی میں قید ہے اور اس کا بوڑھا باپ بابا میدا گلیوں میں دیوانہ پھرتا ہے لیکن جب ان سے کچھ پوچھ لیا جاتا تھا تو وہ بالکل لاعلم بن جاتے تھے۔ ان میں سے زیادہ تر لوگوں کا خیال یہی تھا کہ پولیس یہاں چند روز کی مہمان ہے۔ بہت جلد یہ وردیوں والے واپس چلے جائیں گے اور ان پر پھر ٹمانوں کی حکومت بحال

ہو جائے گی۔ ''چند روز کے مہمانوں'' کے لئے وہ اپنے آقاؤں سے دشمنی مول لینا نہیں چاہتے تھے۔ اشفاق کے قتل کے بعد تو ان کا رویہ اور بھی بدل گیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ جو پولیس اپنی حفاظت نہیں کر سکتی وہ ان کی کیا کرے گی...... مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ اگر میں ٹمانوں کے بارے میں کچھ جاننا چاہتا ہوں تو اس کے لئے باہر کے آدمیوں سے کام لینا پڑے گا۔ میں نے جالندھر جا کر تین ہوشیار مخبروں کا انتظام کیا۔ ان میں سے ایک مرد اور عورت کو میں نے ملنگ اور ملنگنی کا روپ دیا جب کہ ایک نوجوان کو پولیس کے خوف سے بھاگا ہوا مجرم بنا دیا۔ یہ تینوں افراد مختلف طریقے سے رنگ کوٹ کے علاقے میں داخل ہوئے اور اپنے کام میں لگ گئے۔ اس بات کی رپورٹ مجھے چوتھے روز ہی مل گئی کہ مسز ماریا یا اس کی باورچن ٹمانوں کی حویلی میں نہیں ہیں۔ ٹمانوں کے بڑے ڈیرے سے بھی ان کا کھوج نہیں ملا۔ برنالہ شہر اور دہلی میں بھی میرے دو دو مخبر کام کر رہے تھے۔ ایک ہفتے کے دوران ان کی جانب سے بھی کوئی حوصلہ افزا رپورٹ نہیں ملی۔ صرف مسز ماریا کے بارے اتنا پتہ چل سکا کہ اس کا خاوند برطانیہ میں ہے۔ وہ بے اولاد تھی۔ وہ ہندوستان کے مختلف علاقوں میں گھوم پھر کر کام کرتی تھی اور بعض اوقات کئی کئی مہینوں تک اس کا کوئی پتہ نہیں چلتا تھا۔

یہ بات اب کوئی ڈھکی چھپی نہیں رہی تھی کہ میں وہ کیس دوبارہ کھول چکا ہوں جو بدروک سنگھ کے خلاف تین برس پہلے درج ہوا تھا اور اس کیس کی سب سے اہم گواہ مسز ماریا کو تلاش کرتا پھر رہا ہوں۔ ایک طرح سے یہ ٹمانوں کے خلاف اعلانِ جنگ تھا لیکن وہ بڑے ٹھنڈے مزاج کے لوگ تھے۔ اس اعلان پر انہوں نے کسی طرح کی برہمی کا اظہار نہیں کیا اور یوں بنے رہے جیسے کچھ معلوم ہی نہیں۔

اس سلسلے میں بدروک سنگھ سے میری پہلی بات چیت ٹمانوں کے ایک ڈیرے پر ہوئی۔ یہ ڈیرہ روتک گاؤں سے کوئی دو میل شمال میں ایک گھنے باغ کے اندر تھا۔ یہاں ایک چھوٹا کنواں اور تین چار کچے مکان بنے ہوئے تھے۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ بدروک سنگھ یہاں کبھی کبھار جاتا ہے۔ پرندوں کے شکار کے دوران یہ ڈیرہ بدروک سنگھ کے ریسٹ ہاؤس کا کام دیتا تھا۔ مجھے شک سا تھا کہ ممکن ہے مسز ماریا کو کسی ایسے ہی ڈیرے پر رکھا گیا ہو۔ اس رات میں اپنے دو کانسٹیبلوں کے ساتھ بہانے سے اس ڈیرے پر جا اُترا۔ میرا ارادہ تھا کہ ڈیرے دار سے کہیں گے، ہم تفتیش پر نکلے ہوئے تھے رات ہو گئی ہے اس لئے یہاں رکنا چاہتے ہیں لیکن ڈیرے پر پہنچے تو وہاں دوسرا ہی منظر نظر آیا۔ ڈیرے کی کشادہ عمارت کے سامنے چولہوں پر دو تین دیگیں رکھی تھیں۔ یہاں وہاں درختوں پر بہت سے گھوڑے بندھے تھے اور ٹمانوں

کے کارندے ٹہل رہے تھے۔ مجھے فوراً اندازہ ہوا کہ بدروک ٹمانہ یہاں آیا ہوا ہے لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ چپ چاپ واپس چلے جانا ممکن نہیں تھا۔ مجبوراً ہم آگے بڑھے۔ بدروک کے کارندوں نے بدروک کو ہماری آمد کی اطلاع دی۔ وہ اپنے چھوٹے بھائی پرنام سنگھ کے ساتھ ہمارے استقبال کو باہر نکل آیا۔ بڑی گرم جوشی سے ملا۔ مصنوعی احترام اور عزت کے ساتھ ہمیں ڈیرے میں لے آیا۔

''سناؤ جان جی، کیسے آئے ہو؟'' وہ گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر بولا۔

''بس...... بائی دی وے نوابی گاؤں میں تفتیش کے لئے گئے ہوئے تھے رات پڑ گئی ہے۔ سوچا سردار جی کے ڈیرے میں رات بسر کر لیں۔''

وہ دلیری سے مسکرایا۔ ''جان جی، ہم سے صاف سیدھی بات کیا کرو۔ یہ کیوں نہیں کہتے کسی میم شیم کی تلاش میں آئے تھے۔'' اس کا اشارہ صاف طور پر مسز ماریا کی طرف تھا۔

میں نے بھی بے باکی سے اس کی آنکھوں میں جھانک کر کہا۔ ''اگر آیا تھا تو پھر۔''

وہ شراب کا گھونٹ بھر کر بولا۔ ''جان جی غصہ تھوک دو...... تھوک دو غصہ۔ یہ بڑی بُری بلا ہے۔ نیلی آگ کی طرح ہوتا ہے۔ ہر طرح کی لکڑی کو کھا جاتا ہے۔ یہ دنیا اتنی بُری شے نہیں کہ اسے اتنی جلدی چھوڑ دیا جائے۔ کیوں اتنے بے زار نظر آ رہے ہو؟ اپنے اردگرد دیکھو۔ زندہ رہنے کے کتنے بہانے ہیں۔ کھاؤ پیو عیش کرو اور عیش کرتے چلے جاؤ۔''

میں نے کہا۔ ''ہاں سردار! واقعی دنیا بُری شے نہیں لیکن کچھ بُرے لوگوں نے اسے بہت بُرا بنا دیا ہے۔ یہاں گلاباں جیسی لڑکیوں کو زبردستی بستر کی زینت بنایا جاتا ہے اور اشفاق جیسے بے قصور نوجوانوں کو مار کر قبر کی تاریکی میں پہنچا دیا جاتا ہے۔''

وہ کھلکھلا کر ہنسا۔ دیر تک ہنستا رہا۔ پھر نشیلے لہجے میں بولا۔

''اوئے کالو! یہ ہمارے پرونے ہیں۔ انہیں بڑا غصہ آیا ہوا ہے ان کے غصہ تھوکنے کا انتظام کر۔'' قوی الجثہ کالو مسکراتا ہوا اندر گیا اور اپنے ساتھ چار بازاری عورتیں لے آیا۔ انہوں نے زرق برق کپڑے پہن رکھے تھے اور چہروں پر سُرخی پاؤڈر کی مصنوعی بہار تھی۔ ایک عورت نے دونوں کانسٹیبلوں کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور دو نسبتاً جوان لڑکیاں میرے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئیں۔ ان کا انداز ناقابلِ برداشت تھا...... میرا سارا صبر و تحمل دھرے کا دھرا رہ گیا۔ دماغ بھنا اٹھا۔ میں نے دونوں عورتوں کو دھکا دیا اور وہ چیختی ہوئی دور جا گریں۔ کالو کے جسم میں جیسے کرنٹ دوڑ گیا۔ وہ تڑپ کر میرے سامنے آیا۔ شاید سوچ رہا تھا کہ مجھ پر ہاتھ اٹھائے یا نہ...... لیکن اس کے کچھ کرنے سے پہلے ہی میرا داہنا ہاتھ گھوما اور

پوری قوت سے کالو کے جبڑے پر پڑا۔ یہ کافی زوردار مکہ تھا۔ کسی عام شخص کو لگتا تو شاید تیورا کر گر جاتا۔ مگر کالو پر کچھ خاص اثر نہیں ہوا۔ وہ ذرا سا لڑکھڑایا اور سنبھل کر پوری قوت سے میرے ساتھ چمٹ گیا۔ اس کے جسم میں مست گینڈے جیسی قوت تھی۔ اس کے ساتھ بھڑتے ہی میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میرے ذہن میں آیا کہ یہی وہ شخص ہے جس کے ذریعے بدروک نے اشفاق کو قتل کرایا تھا۔ یہی وحشی بازو تھے جنہوں نے اشفاق کے جسم کو زندگی سے محروم کیا تھا۔ مجھے خود پر بالکل قابو نہیں رہا۔ شاید تھوڑی دیر کے لئے میں اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھا تھا۔ میرے ذہن میں صرف ایک ہی سوچ سمائی ہوئی تھی۔ میرے سامنے اشفاق کا قاتل ہے اور میں نے اسے ادھیڑ کر رکھ دینا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ کالو مجھ سے زورآور تھا۔ اسے لڑائی بھڑائی کا تجربہ بھی بہت تھا لیکن مجھ پر ایسی وحشت سوار ہوئی کہ میں نے ایک آدھ منٹ میں اسے لہولہان کر دیا۔ اس نے بھی مجھے چند شدید چوٹیں لگائیں لیکن میرے مقابلے میں اس کا جسمانی نقصان بہت زیادہ تھا۔ سردار بدروک نے اپنے کارندوں کو حکم دے دیا تھا کہ کوئی اس لڑائی میں دخل اندازی نہ کرے، لہٰذا سب خاموش کھڑے ہماری خونی کشتی دیکھ رہے تھے۔ دو منٹ بعد ہمارے لباس تار تار اور جسم خون اور مٹی میں لت پت ہو گئے۔ آخر سردار بدروک کے اشارے پر دو تین پہلوان نما افراد آگے بڑھے اور انہوں نے مجھے اور کالو کو کھینچ کر علیحدہ کر دیا۔ میرے ناک اور منہ سے خون رس رہا تھا لیکن کالو کے پورے چہرے پر سرخ نقشہ بنا ہوا تھا۔ اس کا نچلا ہونٹ کٹ کر لٹک گیا تھا اور پیشانی سے مسلسل خون بہہ رہا تھا۔ اس کی طاقت اور دہشت کے بت میں ناقابلِ مرمت دراڑیں پڑ چکی تھیں۔ سردار بدروک نے اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے تالی بجائی اور خوش دلی سے بولا۔ ''بہت اچھے انسپکٹر نواز! بالکل شکاری کتے کی طرح لڑائی کی ہے تم نے، شاباش۔''

وہ خود کو پُرسکون ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جیسے اسے میری اور میرے غصے کی بالکل پرواہ نہیں ہے لیکن اندر سے وہ ہل چکا تھا۔ اس کے انداز میں بناوٹ صاف طور پر محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے اپنے پھٹے ہوئے سویٹر کو اتار کر پھینکا۔ زمین پر گرا ہوا مفلر اٹھا کر اس سے اپنے ہونٹوں کا خون پونچھا اور ایک قہر آلود نگاہ بدروک سنگھ پر ڈال کر اپنے گھوڑے کی طرف بڑھ گیا۔

''کہاں جا رہے ہو جان جی؟'' بدروک سنگھ نے اپنے مخصوص انداز میں پوچھا۔

میں نے کہا۔ ''گھبراؤ مت۔ جالندھر واپس نہیں جا رہا۔ یہیں پر ہوں۔ اگر یہاں سے گیا تو تمہیں لے کر جاؤں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔''

بدروک سنگھ کے ایک رشتے دار نے غصے سے میری طرف جھپٹنا چاہا لیکن بدروک سنگھ نے ہاتھ بڑھا کر اسے روک دیا۔ میں اپنے دونوں کانسٹیبلوں کے ساتھ چلتا ہوا ڈیرے کی حد سے باہر آیا اور اپنے گھوڑے پر آ بیٹھا۔

☆======☆======☆

اس واقعے کے ٹھیک تین دن بعد کی بات ہے۔ رنگ کوٹ تھانے کے پتے پر مجھے ایک خط موصول ہوا۔ میں اس وقت چونکہ روتک چوکی میں تھا اس لئے یہ خط ایک کانسٹیبل نے مجھ تک پہنچایا۔ خط ڈاک کے ذریعے آیا تھا اور اس پر روتک ہی کی مہر لگی ہوئی تھی۔ میں نے لفافہ چاک کیا۔ اندر سے کاپی سائز کے تین چار ورق برآمد ہوئے۔ میں یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ یہ خط بابے میدے کی اغوا شدہ لڑکی گلاباں کور کی طرف سے ہے۔ اس نے لکھا تھا:

”تھانیدار صاحب! میں آپ کی باتیں سنتی رہتی ہوں۔ پتہ نہیں آپ کس مٹی کے بنے ہوئے ہیں جو اپنی جان کی پرواہ کئے بغیر ٹمانوں سے ٹکر لے رہے ہیں۔ کل جب آپ باغ والے ڈیرے پر آئے اور وہاں شرابی کالو سے آپ کی لڑائی ہوئی۔ کچھ دوسری عورتوں کے ساتھ میں بھی یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ آپ کی ہمت دیکھ کر آج مجھے بھی خط لکھنے کا حوصلہ ہوا ہے۔ ورنہ میں ٹمانوں کے جال میں پھنسی ہوئی ایک ایسی عورت ہوں جس کے لئے خط لکھنا تو بہت دور کی بات ہے، ہونٹ کھولنا بھی آسان نہیں ہے۔ اتنے پہرے ہیں کہ نہ میں بتا سکتی ہوں اور نہ آپ سوچ سکتے ہیں۔ مجھ پر یہاں جو ظلم ہوا ہے اسے لکھنے بیٹھوں تو پتہ نہیں کتنے کاغذ کالے ہو جائیں۔ ایک عورت کے لئے ایسی باتیں زبان پر لانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ بدروک انسان نہیں شیطان ہے۔ میں اس کے لئے صرف بددعا ہی کر سکتی ہوں۔ دو برس ہونے کو آئے ہیں جب بدروک کے کارندے مجھے زبردستی اٹھا کر حویلی میں لائے تھے۔ اب میں بدروک کے دو بچوں کی ماں ہوں۔ اس ذلت کی زندگی سے بھاگنا چاہوں تو بھی نہیں بھاگ سکتی لیکن دل میں ایک تمنا ضرور ہے کہ بدروک سنگھ کو اس کے کئے کی سزا ملے...... میں یہ ساری باتیں آپ کو اس وقت بھی بتا سکتی تھی جب آپ حویلی میں آئے تھے اور اکیلے میں آپ نے مجھ سے حال پوچھا لیکن اس وقت مجھے آپ کے بارے کچھ پتہ نہیں تھا۔ میرا خیال تھا کہ اگر آپ بدروک سنگھ کے مخالف بن کر ہمارے علاقے میں آئے ہیں تو زیادہ دیر یہاں نہیں رہ سکیں گے لیکن اب مجھے اندازہ ہوا ہے کہ آپ ٹمانوں کے سامنے ڈٹ گئے ہیں۔ سچ بات یہ ہے کہ کل والے واقعے کے بعد مجھے یقین ہو گیا ہے کہ اگر کوئی شخص ہم بدنصیبوں کو ٹمانوں کے چنگل سے نکال سکتا ہے تو وہ آپ ہیں۔ میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ نہ صرف

میں بلکہ علاقے کے سارے لوگ دل و جان سے آپ کے ساتھ ہیں...... مجھے پتہ چلا ہے کہ آپ کسی انگریز عورت کی تلاش میں ہیں جس نے بدروک سنگھ کے خلاف گواہی دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ مجھے معلوم نہیں وہ عورت کون تھی اور نہ ہی میں نے اسے دیکھا ہے لیکن میں ایک بات جانتی ہوں۔ یہ بات میری طرح حویلی کے اور بھی بہت سے لوگ جانتے ہوں گے لیکن ان میں سے کوئی اس بارے میں زبان نہیں کھول سکتا۔ وہ بات یہ ہے کہ قریباً دو برس پہلے جب میں اس حویلی میں آئی تو یہاں ایک انگریز عورت موجود تھی۔ اس کی عمر پچیس اور تیس سال کے درمیان تھی لیکن وہ اپنی عمر سے کم دکھائی دیتی تھی۔ اس کا رنگ صاف اور شکل اچھی تھی۔ میں نے اسے جب بھی دیکھا روتے ہوئے پایا۔ اس پر اس حویلی میں بہت ظلم ہو رہا تھا۔ شاید آپ کو معلوم نہ ہو حویلی کے گودام والے حصے میں دو کولہو لگے ہوئے ہیں۔ ایک چھوٹا ہے اور دوسرا بڑا۔ یہ کولہو بنولے، سرسوں اور دوسرے بیجوں کا تیل نکالنے کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ چھوٹے کولہو پر ایک عورت مائی پٹھانی کام کرتی ہے۔ یہ بڑی ظالم اور کرخت عورت مشہور ہے۔ بدروک سنگھ نے اس انگریز عورت کو مائی پٹھانی کے حوالے کر رکھا تھا۔ میں نے دیکھا نہیں لیکن سنا ہے کہ مائی پٹھانی صبح سے دوپہر تک انگریز میم سے کولہو چلواتی تھی اور جب وہ تھک جاتی تھی تو اس کو چمڑے کے جوتے سے مارتی تھی۔ ایک روز بدروک سنگھ مجھے اپنا گودام دکھانے لے گیا تھا۔ گودام میں مجھے لرزہ خیز چیخیں سنائی دی تھیں۔ میں نے بدروک سے پوچھا۔ ”یہ کیسی آوازیں ہیں؟“ اس نے کہا تھا۔ ”یہ ایک کتیا...... ٹیڑھے لوگوں کا اس حویلی میں یہی انجام ہوتا ہے۔“ بدروک نے بتایا نہیں تھا لیکن میں پہچان گئی تھی کہ یہ اسی انگریز عورت کی آوازیں ہیں۔ اس واقعے کے بعد ایک مہینے کے اندر وہ انگریز عورت دو یا تین مرتبہ نظر آئی۔ پھر اس کا کچھ پتہ نہیں چلا۔ میں سوچتی ہوں ہو سکتا ہے یہ وہی عورت ہو جس کی آپ کو تلاش ہے۔ اگر آپ اس عورت کے بارے میں کچھ جاننا چاہتے ہیں تو پھر اس کا صرف ایک ہی طریقہ ہے آپ مائی پٹھانی سے بات کریں۔ یوں تو مائی پٹھانی حویلی میں رہتی ہے لیکن مہینے میں دو بار وہ اپنے بھائی بازنگ خان سے ملنے رنگ کوٹ جاتی ہے۔ رنگ کوٹ میں آپ اس سے با آسانی مل سکتے ہیں۔

تھانیدار صاحب! یہ خط میں نے اپنی جان پر کھیل کر لکھا ہے۔ آپ کو اندازہ نہیں کہ میں نے اپنے اور اپنے بچوں کے لئے کتنا بڑا خطرہ مول لیا ہے۔ رب کرے یہ خط اپنے ٹھکانے پر پہنچ جائے۔ اگر ایسا ہو گیا تو میرے باپو کو میری طرف سے پرنام دینا۔ اس سے کہنا بابے میدے تیری بیٹی کے پاس جتنے آنسو تھے وہ سارے اس نے تیری یاد میں بہا دیئے ہیں۔ وہ

حویلی کی اونچی دیواروں سے باہر نہیں آسکتی لیکن اس کا دل ہر وقت تیرے ساتھ رہتا ہے۔
اس سے یہ بھی کہنا کہ وہ خواہ مخواہ گلیوں میں اپنی مٹی خراب نہ کرے۔ مکان بیچ ڈالے اور جو
پیسے ملیں انہیں لے کر دربار صاحب چلا جائے۔ دربار صاحب میں اس کے من کو شانتی ملے گی
اور جب اسے شانتی ملے گی تو اس کی بیٹی کا غم بھی ہلکا ہو جائے گا۔"

کسی اختتامی اعلان کے بغیر یہ خط اچانک ہی ختم کر دیا گیا تھا۔ میں اپنی جگہ بے حرکت
بیٹھا خط کے صفحات کو گھورتا رہا۔ یہ تحریر نہیں تھی۔ اس لڑکی کی پہلی اور آخری چیخ تھی جو دو برس
قبل بدروک کی کالی حویلی میں زندہ چن دی گئی تھی۔ لکھنے والی معمولی پڑھی ہوئی تھی۔ تحریر میں
جا بجا گرائمر اور املاء کی غلطیاں تھیں۔ فقروں پر بھی عبور حاصل نہیں تھا۔ یہی دکھ اگر کسی شاعر یا
ادیب نے بیان کیا ہوتا تو یقیناً پڑھنے والی آنکھیں خون رونے لگتیں۔ اس خط کو المیہ ادب کا
شہ پارہ قرار دے کر ہمیشہ کے لئے کتابوں میں محفوظ کر لیا جاتا۔ اس خط کو اس کا پورا احترام
دیتے ہوئے میں نے ایک بار پھر غور سے پڑھا اور احتیاط سے تہہ کر کے جیب میں رکھ لیا۔

اب میری توجہ کا مرکز مائی پٹھانی تھی۔ مائی پٹھانی کے بھائی کا نام بازنگ خان تھا اور
بازنگ خان کا نام پڑھتے ہی میرے دماغ میں پھلجڑی سی چھوٹ گئی تھی۔ میں نے آپ کو
شروع میں بتایا تھا کہ رنگ کوٹ تھانہ ایک خستہ حال عمارت میں تھا۔ اسی عمارت کے ایک
حصے میں لکڑی کا ٹال تھا۔ بازنگ خان اس ٹال کا مالک تھا۔ میرا کام اور آسان ہو گیا تھا۔
بازنگ خان کا پتہ ڈھونڈنے کی ضرورت بھی نہیں رہی تھی۔

☆======☆======☆

ٹھیک تین روز بعد ایک ٹھٹھرتی ہوئی سرمئی شام کو میں اپنے ایک ہٹے کٹے کانسٹیبل کے
ساتھ تھانے کی چھت پر آیا۔ بازنگ خان کا مکان ٹال کے ساتھ ہی تھا اور مکان کی چھت
تھانے کی چھت سے ملی ہوئی تھی۔ اندھیرا اب پھیل چکا تھا لہٰذا کسی نے ہمیں تھانے کی چھت
سے بازنگ کے مکان کی سیڑھیاں اُترتے نہیں دیکھا۔ مجھے معلوم تھا بازنگ اس وقت قصبے
کے بازار میں گیا ہوا ہے اور مائی پٹھانی گھر میں اکیلی ہے۔ میں مائی پٹھانی کو باضابطہ گرفتار کرنا
نہیں چاہتا تھا بلکہ ایسے طریقے سے تھانے میں لانا چاہتا تھا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔

سیڑھیاں اُتر کر ہم صحن میں پہنچے اور برآمدہ پار کر کے کمرے میں چلے گئے۔ سامنے
لکڑی کے ایک سبز تخت پوش پر مائی پٹھانی پھیل کر لیٹی ہوئی تھی۔ وہ عورت کم اور پہلوان زیادہ
نظر آتی تھی۔ وہ سوئی ہوئی تھی اور سانس کے زیر و بم سے پیٹ ہل رہا تھا۔ میں نے اسے
جگایا، وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی اور گھور گھور کر مجھے دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھیں بادامی، چہرہ بے حد

چوڑا، جبڑے مضبوط اور عمر پینتالیس کے لگ بھگ تھی۔ اسے دیکھ کر ہی کہا جا سکتا تھا کہ وہ بے
حد سخت گیر اور اذیت پسند عورت ہے۔ میں یہ جان کر حیران رہ گیا کہ وہ روانی سے پنجابی بولتی
ہے۔ اس نے نہایت کڑوے لہجے میں دریافت کیا کہ ہم یہاں کیا کرنے آئے ہیں۔ جواب
میں میں نے اسے بتایا کہ بازنگ خان کسی کی گولی سے زخمی ہو گیا ہے اور تھانے میں ہے۔ وہ
ایک دم گھبرا گئی اور دروازے کی طرف گئی۔ میں نے اسے روک لیا۔

"نہیں مائی! ادھر سے جانا ٹھیک نہیں، ہو سکتا ہے باہر بھی کوئی چھپا ہوا ہے۔ ہم خود
چھت پر سے آئے ہیں۔"

ایک لمحے کے لئے اس کی آنکھوں میں شک نمودار ہوا۔ اس نے ٹٹولنے والی نظروں
سے مجھے دیکھا لیکن پھر فوراً ہی بازنگ خان کا خیال اس کے شک پر غالب آ گیا۔ وہ ہمارے
ساتھ سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر آئی اور تھانے میں اُتر گئی...... تھانے میں آ کر اسے ہماری
چال کا علم ہوا تو بُری طرح چیخنے چلانے لگی۔ اس کے منہ سے گندی گالیاں مشین گن کی طرح
نکل رہی تھیں۔ گالیوں کے اس طوفان کو روکنے کے لئے میرے ایک حوالدار نے اس کے
بھاڑ جیسے منہ میں رومال ٹھونس کر اوپر سے مفلر باندھ دیا۔ اب وہ پوری طرح ہمارے قابو میں
تھی۔

اسی شام میں نے مائی پٹھانی سے پوچھ گچھ شروع کر دی۔ وہ بیس برس میں میرے
سامنے آنے والے سخت ترین ملزمان میں سے تھی۔ کسی بات کسی دھمکی کا اس پر اثر ہی نہیں ہوتا
تھا۔ بس یہی رٹ لگا رہی تھی کہ سردار بدروک سنگھ کو پتہ چلے گا تو وہ ہماری سات پشتوں کو جہنم
رسید کر دے گا۔ اس پیش گوئی کے ساتھ وہ بے دریغ گالیاں بھی بک رہی تھی۔ مصیبت یہ تھی
کہ وہ عورت تھی ہم اس پر سختی بھی نہیں کر سکتے تھے۔ کم از کم میں تو نہیں کر سکتا تھا۔ وہ میری اس
کمزوری کا بھرپور فائدہ اٹھا رہی تھی۔

اگلے روز صبح تک مجھے یقین ہو گیا کہ مائی پٹھانی ایک ٹیڑھی کھیر ہے اور اسے پکانے کے
لئے چولہے کو بھی ٹیڑھا کرنا پڑے گا...... لہٰذا میں نے فیصلہ کیا جو شاید عام حالات میں کبھی نہ
کرتا۔ میں جانتا تھا کہ مائی پٹھانی کو تھانے میں لا کر میں اپنے لئے واپسی کے سارے راستے
بند کر چکا ہوں۔ اب فیصلہ صرف تلوار سے ہو گا۔ جنگ کے اس میدان سے میری لاش اٹھے گی
یا سردار بدروک سنگھ ٹمانہ کی۔ جو قدم میں نے اٹھایا تھا اس سے پہلے یہی قدم اشفاق نے
گلاباں کے شوہر کو گرفتار کر کے اٹھایا تھا۔ اس جسارت کی سزا اشفاق کو موت کی صورت میں ملی
تھی۔ اب میری "جسارت" کا انجام نہ جانے کیا ہونا تھا۔ میری جیت کی صرف ایک ہی

صورت تھی۔ میں مائی پٹھانی کی زبان کھلوانے میں کامیاب ہو جاؤں اور مجھے اس انگریز عورت کا پتہ چل جائے جو سردار بدروک کو تختہ دار کا راستہ دکھا سکتی تھی۔

میں نے اپنے مشکل فیصلے پر عمل کرتے ہوئے اپنے سب انسپکٹر کو فوری طور پر امرتسر بھیجا۔ یہ سب انسپکٹر اگلے روز وہاں سے دو خاتون کانسٹیبلوں کو لے آیا۔ محکمے میں ان دونوں ہٹی کٹی عورتوں کی شہرت تھی۔ سخت سے سخت ملزمہ بھی ان کے ہاتھوں میں پہنچ کر پانی ہو جاتی تھی۔ یہ دونوں عورتیں پارسی تھیں۔ ان میں سے ایک کی عمر پینتالیس کے قریب اور دوسری تیس کے پیٹے میں تھی۔ میں نے دونوں کو سمجھا بجھا کر مائی پٹھانی کو ان کے حوالے کر دیا۔ قریباً ایک گھنٹے بعد تھانے کے عقبی حصے سے مائی پٹھانی کی مدھم چیخ و پکار سنائی دینے لگی۔ حوالاتیوں کی چیخ و پکار نے ہمیشہ مجھے افسردہ کیا ہے لیکن اس روز ایسا نہیں ہوا۔ میں بڑے اطمینان سے یہ آوازیں سنتا رہا۔ کتنی عجیب بات تھی۔ جو سفاک عورت کل تک اپنے جیسی دوسری عورتوں کو اذیت پہنچا کر خوش ہوتی تھی آج اس کی اپنی جان پر بنی ہوئی تھی۔ یعنی ایک جلاد کی اپنی پیٹھ پر کوڑے پڑ رہے تھے۔

دونوں کانسٹیبلوں نے مائی پٹھانی پر قریباً چار گھنٹے لگائے اور اسے زبان کھولنے پر مجبور کر دیا۔ مائی پٹھانی کو میرے سامنے پیش کیا گیا تو وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اس کے ہونٹ نیلے ہو رہے تھے اور گندی بکواس کرنے والی زبان بھی رک چکی تھی۔ اس موقعے پر مائی پٹھانی نے جو انکشاف کیا وہ بے حد اہم اور سنسنی خیز تھا۔ اس نے اعتراف کیا کہ قریباً ڈیڑھ برس پہلے تک جو انگریز عورت حویلی میں تھی اس کا نام مسز ماریا تھا اور اس کا گناہ یہ تھا کہ اس نے سردار بدروک کے خلاف گواہی دینے کا پکا ارادہ کر رکھا تھا۔

میں نے مائی پٹھانی سے پوچھا۔ ”اب وہ عورت کہاں ہے؟“

مائی پٹھانی کی بادامی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں لہرائیں۔ اس نے سر جھکایا اور کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔ ”سردار بدروک نے...... اسے قتل کر دیا تھا۔“ ایک لمحے کے لئے میں سناٹے میں رہ گیا۔ ”یہ کب کی بات ہے؟“ میں نے اپنے لہجے کو نارمل رکھتے ہوئے پوچھا۔

”کوئی ڈیڑھ سال پہلے کی۔“ مائی پٹھانی نے جواب دیا۔

”اس کی لاش کہاں ہے؟“

”مجھے نہیں معلوم۔“

”تمہیں معلوم ہے۔“

”مجھے نہیں معلوم۔“

میں نے خاتون کانسٹیبلوں کو اشارہ کیا۔ انہوں نے مائی پٹھانی کو بازوؤں سے پکڑا اور گھسیٹتی ہوئی حوالات کی طرف چلیں۔ پٹھانی نے ایک بار پھر چیخ و پکار شروع کر دی۔ اس دفعہ اس کی واپسی دو منٹ بعد ہی ہو گئی۔ اس نے روتے پیٹتے ہوئے اقرار کیا کہ اب وہ سب کچھ بتا دے گی۔ کچھ نہیں چھپائے گی۔ اس کے لہجے سے سچائی چھلک رہی تھی۔ اپنی جان کو عذاب سے نکالنے کے لئے وہ بدروک سنگھ کا کچا چٹھا کھولنے پر تیار ہو گئی تھی۔ چند گھونٹ پانی پی کر اور اپنے حواس درست کر کے اس نے مسز ماریا اور بدروک سنگھ کے بارے سب کچھ بتا دیا۔ اس نے بتایا کہ ماریا دہلی جانے کے لئے ریلوے سٹیشن روانہ ہوئی تھی لیکن راستے میں ہی بدروک سنگھ اور کالو کے ہتھے چڑھ گئی۔ گھوڑا گاڑی کا کوچوان فرار ہو گیا تھا جب کہ انگریز باورچن موقع پر ہی ہلاک کر دی گئی تھی۔ بدروک سنگھ اور کالو مسز ماریا کو اٹھا کر حویلی میں لے آئے۔ یہاں اس کے ساتھ وہ سب کچھ ہوا جو اس حویلی میں داخل ہونے والی کسی بے کس عورت کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ چند ہفتوں بعد جب بدروک سنگھ کا دل مسز ماریا سے اکتا گیا تو اسے اپنے ایک ادھیڑ عمر تایا زاد کے حوالے کر دیا۔ یہ شخص بھی کچھ عرصہ اسے خراب کرتا رہا۔ بعد ازاں اسے ایک ادنیٰ ملازمہ کی طرح کام پر لگا دیا گیا۔ شومئی قسمت ایک روز مسز ماریا نے حویلی سے فرار ہونے کی کوشش کی۔ سزا کے طور پر اسے مائی پٹھانی کے حوالے کر دیا گیا۔ مائی پٹھانی نے اپنی سفاکی سے اس پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا۔ سردار بدروک مسز ماریا سے بے حد نفرت محسوس کرتا تھا اور اسے سفید کتیا کے نام سے پکارتا تھا۔ اس نے مائی پٹھانی کو ہدایت کر رکھی تھی کہ سفید کتیا سے اتنا کام لو کہ اس کی ہڈیوں سے کھڑ کھڑ کی صدا آنے لگے۔ اسے اس بات کا شدید رنج تھا کہ مسز ماریا نے اس کے خلاف گواہی دینے کا اعلان کیا اور اپنے فیصلے پر ڈٹی رہی اور اب بھی ڈٹی ہوئی تھی۔ کالی حویلی کی کالی دیواروں سے اندر ایک اجلی عورت جو ایک قابلِ احترام ڈاکٹر بھی تھی کولہو کے آگے جتی رہی۔ سچ بولنے کی سزا بھگتتی رہی۔ یہاں تک کہ ایک دن نڈھال ہو کر گر گئی۔ کولہو کھینچ کھینچ کر اس کے دونوں کندھوں اور پیٹ پر گہرے زخم بن گئے تھے جن سے ہر وقت خون رستا رہتا تھا۔ اسے فوری طور پر ہسپتال لے جانے کی ضرورت تھی لیکن بدروک سنگھ نے اس کے لئے ایک دوسرے علاج کا بندوبست کر لیا۔ یہ علاج موت تھا۔ اس نے کراہتی اور آنسو بہاتی نیم بے ہوش ماریا کی پیشانی پر پستول رکھا اور تین گولیاں اس کے سر میں اتار دیں۔ اسی رات حویلی کی بیرونی چار دیواری کے پاس ایک گڑھا کھود کر اسے دفن کر دیا گیا۔ اگلے روز بدروک سنگھ نے اس جگہ پختہ فرش بنوا

دیا۔ بعدازاں اس فرش پر کوڑا پھینکنے کے لئے جگہ بنا دی گئی۔ یہ انجام تھا اس عورت کا جو دکھی انسانیت کی خدمت کا جذبہ لے کر اس دور دراز علاقے میں پہنچی تھی اور جس نے کسی کا کچھ نہیں بگاڑا تھا۔

مائی پٹھانی کی پوری بات سننے کے بعد میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اب میرے لئے ایک لمحہ بھی تھانے میں رکنا ممکن نہیں تھا۔

☆=====☆=====☆

اس رات میں نے جالندھر پہنچ کر ڈی ایس پی دلجیت سے رابطہ قائم کیا۔ وہ اس کیس کے بارے میں خود کو مکمل طور پر باخبر رکھ رہے تھے۔ میں نے ٹمانوں کی حویلی پر چھاپہ مارنے کے لئے دلجیت صاحب سے پولیس فورس طلب کی۔ ٹمانوں کی حویلی پر چھاپہ ایک بہت بڑا رسک تھا۔ خاص طور پر اس وجہ سے کہ بدروک سنگھ کے تعلقات ایک بہت بڑی وی آئی پی شخصیت سے تھے اور اس شخصیت نے کبھی بدروک سنگھ کو اکیلا نہیں چھوڑا تھا۔ میرا خیال ہے دلجیت صاحب کی جگہ کوئی دوسرا پولیس افسر ہوتا تو کبھی میرے مطالبے پر کان نہ دھرتا لیکن دلجیت صاحب جانتے تھے کہ اگر میں دعویٰ کر رہا ہوں تو ضرور حویلی سے کچھ نہ کچھ برآمد بھی کروں گا۔ ان کی مزید تسلی کے لئے میں نے انہیں مائی پٹھانی کے روبرو کرانے کی پیش کش بھی کر دی۔ وہ مطمئن ہو گئے۔ رات رات میں چھاپے کے انتظامات مکمل ہو گئے۔ اگلے روز میں پولیس فورس کے ساتھ رنگ کوٹ تھانے پہنچا۔ ہم نے اندھیرا پھیلنے کا انتظار کیا اور پھر گھوڑوں پر سوار ہو کر دس دس کی تین ٹولیوں میں روتک چوکی کی طرف روانہ ہو گئے۔ دشوار گزار راستے پر سفر کرتے ہوئے ہم نصف شب کے قریب روتک پہنچے۔ ہماری پارٹی میں تین انسپکٹروں اور چار سب انسپکٹروں کے علاوہ ایک فوٹو گرافر اور ایک انگریز افسر بھی تھا۔

ہماری تینوں ٹولیاں روتک گاؤں کے ایک نواحی شمشان گھاٹ میں جمع ہو گئیں۔ چاندنی رات تھی۔ سردی کی وجہ سے سانس دھواں چھوڑ رہے تھے۔ گاؤں کے اندر گلیوں میں ٹھٹھرتے ہوئے کتوں کی آواز بلند ہو رہی تھیں۔ ہماری چھاپہ مار پارٹی نے اپنے گھوڑے شمشان گھاٹ کے اندر ہی باندھے۔ اسلحہ تیار کیا اور حویلی کی طرف قدم بڑھائے۔ اس پارٹی کی قیادت میں کر رہا تھا۔ میری جیب میں حویلی کی تلاشی اور بدروک سنگھ کی گرفتاری کے وارنٹ موجود تھے۔ تاہم یہ امید نہیں تھی کہ بدروک سنگھ ان وارنٹوں کو شرافت سے قبول کر لے گا۔ اس وقت رات کے دو بجے تھے جب ہم نے کالی حویلی کا بلند و بالا دروازہ کھٹکھٹایا۔ دو مسلح چوکیداروں نے حیرت سے ہماری طرف دیکھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے حویلی میں کھلبلی مچ گئی۔ چند منٹ بعد بدروک

سنگھ اور اس کے دو بھائی خود دروازے پر آ گئے۔ بدروک کی خوابیدہ آنکھوں میں شعلے ناچ رہے تھے۔ اس نے غصیلے لہجے میں پوچھا۔ ”نواز خان تم اس وقت یہاں؟“

میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”ہاں بدروک سنگھ۔ تم ٹھیک ہی کہتے ہو، پولیس کی نوکری بڑی بُری چیز ہے۔ دو ٹکے کی خاطر بندے کو رات دن ذلیل ہونا پڑتا ہے۔ اب دیکھو یہ بھی کوئی وقت ہے گھر سے نکلنے کا۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے حویلی کی تلاشی کے وارنٹ اس کے ہاتھ میں تھما دیئے۔ وہ سر تا پیر کانپ گیا۔ ایک لمحے کے لئے محسوس ہوا کہ وہ اپنی قمیص کے نیچے سے پستول نکال کر اندھا دھند فائرنگ شروع کر دے گا۔ مگر پھر اس نے اپنے بے پناہ غصے پر قابو پایا۔

”کیا برآمد کرنا چاہتے ہو میری حویلی سے؟“ اس نے پوچھا۔

”جو برآمد ہو گا تم بھی دیکھ لو گے۔“ میں نے جواب دیا۔

”اور اگر کچھ نہ ہوا تو اس کا انجام جانتے ہو؟“

”بڑی اچھی طرح۔“

میں نے قدم بڑھائے اور بدروک کے مسلح کارندوں کے درمیان سے گزرتا ہوا حویلی میں داخل ہو گیا۔ چھاپہ مار پارٹی بھی میرے پیچھے ہی پیچھے اندر آ گئی۔ میں نے بڑے نرم لہجے میں کہا۔ ”بدروک سنگھ زنانے میں پردہ کرا دو۔“ اس نے ایک آدمی بھیج کر پردہ کرا دیا۔ میں نے ایک سکھ انسپکٹر کو دس آدمی دے کر حویلی کے اندرونی حصے کی تلاشی کے لئے بھیجا اور خود سیدھا حویلی کے پچھواڑے اس صحن میں پہنچا جس کی نشاندہی مائی پٹھانی نے کی تھی۔ یہاں جلد ہی ہمیں مطلوبہ کوڑے دان نظر آ گیا۔ درختوں کے درمیان ایک چھوٹی سی چار دیواری میں گوبر اور کوڑے کرکٹ کا ڈھیر لگا تھا۔ جب میری ہدایت پر عملے کے تین افراد آہنی ہتھوڑے لے کر کوڑے دان کے پختہ فرش کی طرف بڑھے تو میں نے سردار بدروک کے چہرے پر ایک گہرا تاریک سایہ لہراتے دیکھا۔ دفعتاً بدروک کا ایک بھائی بجلی کی سی تیزی سے میرے ہتھوڑا بردار حوالدار کی طرف بڑھا۔ ایک سب انسپکٹر نے پھرتی سے ریوالور نکال کر اس کی گردن پر رکھ دیا۔

”رک جاؤ سردار کوئی غیر قانونی کام نہ کرنا۔“ اس نے سرد لہجے میں وارننگ دی۔ اس وقت تک حویلی کے اندرونی حصے میں جانے والا سکھ انسپکٹر اپنے عملے کے ساتھ حویلی کی چھت پر پوزیشن سنبھال چکا تھا۔ حویلی کا ہر فرد اس کے نشانے پر تھا۔ تلاشی تو صرف بہانہ تھی، میں نے اسے مورچہ جمانے کے لئے بھیجا تھا۔

پولیس کے جوانوں نے پہلے کوڑے دان توڑا۔ پھر کوڑا ہٹا کر فرش اکھاڑا......قریباً ایک

گھنٹے کی مشقت کے بعد وہ فرش کے نیچے سے ایک انسانی پنجر نکالنے میں کامیاب ہو گئے۔ پنجر کے ساتھ سنہری بالوں کے گچھے پڑے تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ یہ کسی انگریز عورت کی لاش ہے۔ ہمارے ساتھ موجود فوٹوگرافر نے دھڑا دھڑ انسانی ڈھانچے کی تصویریں بنالیں۔ مسز ماریا کا بے گوروکفن ڈھانچہ دیکھ کر دل پر ایک بھاری بوجھ سا محسوس ہو رہا تھا۔ یکا یک میری چھٹی حس نے خبردار کیا کہ کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ میں نے چاروں طرف دیکھا سردار بدروک سنگھ کہیں نظر نہیں آیا۔

"سردار بدروک کہاں ہے؟" میں نے چلا کر پوچھا۔

عملے میں کھلبلی مچ گئی۔ سب اِدھر اُدھر بھاگنے لگے لیکن سردار بدروک کہیں دکھائی نہیں دیا۔ بدروک سنگھ کے بھائی بالکل بے فکر نظر آ رہے تھے۔ شاید اب بھی ان کا خیال تھا کہ ٹمانوں کی آن بان پر کوئی حرف نہیں آئے گا۔

☆======☆======☆

ٹمانوں کا خیال غلط تھا کہ وہ اس بار بھی قانون اور انصاف کا مذاق اُڑانے میں کامیاب رہیں گے۔ انہیں ہرگز گمان نہیں تھا کہ مسز ماریا والا کیس سنگین رخ اختیار کر جائے گا۔ مسز ماریا کی لاش کی تصویریں جب اخباروں میں شائع ہوئیں اور اس بدنصیب کی پوری کہانی منظرِ عام پر آئی تو ہر شخص کا دل دہل گیا۔ حکمران انگریز تھے اور وہ اپنی ایک ہم قوم کے ساتھ ایسا بہیمانہ سلوک کیسے برداشت کر سکتے تھے اور واقعی یہ سلوک ناقابلِ برداشت تھا۔ مسز ماریا کا مذہب کوئی ہو وہ ایک ہمدرد انسان تھی اور اس کی دردناک موت نے ہر شخص کا سر شرم سے جھکا دیا تھا۔

بُرے شخص پر جب کڑا وقت آتا ہے تو ہر سہارا ساتھ چھوڑ جاتا ہے۔ بدروک سنگھ کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا۔ اسے سب سے زیادہ مان اسی وی آئی پی شخصیت کا تھا جس کا ذکر میں نے کہانی میں کئی دفعہ کیا ہے۔ لیکن جب ٹمانوں کا جرم ظاہر ہونے پر ان کی مخالفت کا طوفان اٹھا تو یہ وی آئی پی شخص بھی بدروک کا ساتھ چھوڑ گیا اور ایسا ہی ہونا تھا کیونکہ یہ وی آئی پی بھی انگریز تھا۔ اس کی ایک ہم نسل کے ساتھ بدروک سنگھ نے ظلم کی انتہا کی تھی اور وہ اب بھی اس کا ساتھ نہ چھوڑتا تو کب چھوڑتا۔ اس سہارے کا ٹوٹنا تھا کہ ٹمانے بُری طرح بوکھلا گئے۔ بدروک سنگھ کا ایک بھائی تو حویلی سے ویسے ہی غائب ہو گیا جب کہ بدروک سنگھ اور اس کا منجھلا بھائی گرفتاری سے بچنے کے لئے بھاگ دوڑ کرنے لگے۔ گرفتاری کا خوف بڑی بُری بلا ہے۔ میں نے بڑے بڑے پھنے خان لوگوں کو اس خوف سے عاجز آتے دیکھا ہے۔ آدمی کے لئے دن کا چین اور رات کی نیند حرام ہو جاتی ہے۔ ہر دستک پر ڈرتا ہے اور ہر آہٹ پر چونک اٹھتا ہے۔ اس اذیت

ناک کیفیت کا اندازہ کچھ وہی شخص کر سکتا ہے جو اس مصیبت سے گزر رہا ہو۔

قریباً دس پندرہ روز اسی کشمکش میں گزر گئے...... وہ وسط جنوری کی ایک اوس سے بھیگی ہوئی خنک رات تھی۔ میں رنگ کوٹ تھانے میں اپنے کمرے میں لیٹا ہوا تھا۔ آتش دان میں لکڑیاں تڑتڑ کی آواز سے جل رہی تھیں۔ دن بھر کی تھکن نے آنکھیں بوجھل کر دی تھیں۔ میں سونے ہی والا تھا کہ سنتری نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ ایک شخص مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ کہتا ہے کہ ملنا بے حد ضروری ہے۔ میں خود پر جبر کر کے لحاف سے نکل آیا۔ چند منٹ بعد ایک شخص گرم چادر کی بکل مارے اندر آ گیا۔ اس کا چہرہ چادر کی اوٹ میں تھا۔ جب وہ روشنی میں آیا تو میں دنگ رہ گیا۔ وہ خود سردار بدروک سنگھ تھا۔ پہلے تو میرا دھیان اپنے ریوالور کی طرف گیا لیکن جب میں نے غور سے بدروک کی آنکھوں میں دیکھا تو اندازہ ہوا کہ اب مجھے بدروک سنگھ سے کوئی خطرہ نہیں۔ اس کا سارا دم خم نکل چکا ہے اور اب وہ ایک مسکین شخص کی طرح میرے سامنے کھڑا ہے۔ چند ہی روز میں اس کی نوکدار مونچھیں لٹک گئی تھیں اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ شاید قارئین کو بدروک سنگھ ٹمانہ کی یہ تبدیلی حیران کن محسوس ہو لیکن میرے لئے یہ ہرگز حیران کن نہیں تھی۔ پھانسی کا خوف بڑوں بڑوں کا پتہ پانی کر دیتا ہے۔ میں نے ایسے بہت سے منظر دیکھے ہیں...... بدروک سنگھ نے چہرے پر پھیکی سی مسکراہٹ سجائی اور میری دعوت کے بغیر ہی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس رات میرے اور بدروک کے درمیان جو گفتگو ہوئی وہ خاصی طویل تھی۔ اس گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ بدروک سنگھ اپنی زندگی بچانے کے لئے بڑے سے بڑا داؤ کھیلنے کو تیار تھا۔ اس کا خیال تھا کہ میں اس کیس میں سب کچھ کر سکتا ہوں اور اگر میں چاہوں تو تفتیش میں فرق ڈال کر بدروک کی جان بچا سکتا ہوں۔ اس بات چیت کے دوران ایک موقع ایسا بھی آیا جب بدروک سنگھ اس بات پر آمادہ ہو گیا کہ وہ ایک حویلی کے سوا سب کچھ چھوڑنے کو تیار ہے۔ اگر اس کی جان بچ جائے تو وہ خالی ہاتھ یہاں سے چلا جائے گا اور کبھی واپس نہیں آئے گا...... بدروک سنگھ کی حالت دیدنی تھی وہ زندگی کے لئے تڑپ رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔

"سردار بدروک! تم بڑے ہوشیار مجرم رہے ہو۔ اپنے بہت سے دوسرے جرائم کی طرح تم نے اشفاق کے قتل کا کوئی ثبوت بھی نہیں چھوڑا تھا۔ آج جب کہ تم اس جرم کے ثابت ہونے کے بغیر ہی پھانسی کے تختے تک پہنچ گئے ہو۔ کیا تم اعتراف کرو گے کہ اشفاق کو تم نے قتل کرایا تھا؟"

سردار بدروک بالکل بے دست و پا ہو چکا تھا۔ یہ سوچ کر کہ شاید سچ بولنے سے میرے

دل میں اس کے لئے رحم پیدا ہو جائے۔ اس نے اعتراف کر لیا کہ وہ اشفاق کا قاتل ہے اور یہ قتل اس نے کالو کے ذریعے کروایا تھا۔ میں نے کہا۔

"بس بدروک سنگھ! میں تیرے منہ سے یہی سننا چاہتا تھا۔ اب مجھے اطمینان رہے گا کہ میں نے تجھ پر سخت سے سخت کیس بنا کر اور تیری پھانسی کا انتظام کر کے تجھ سے کوئی بے انصافی نہیں کی ہے۔"

صدمے اور خوف سے بدروک سنگھ کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ پھر اس کا سارا وجود لرزنے لگا۔ وہ گھگھیا کر بولا۔

"نواز خان! مجھ پر رحم کرو۔ میں دل کا مریض ہوں، میں یہ ساری مشکلیں برداشت نہیں کر سکوں گا۔ میں...... میں تمہیں منہ مانگی قیمت دے سکتا ہوں۔ بتاؤ...... صرف ایک بار بتاؤ، کیا چاہیے تمہیں؟"

میرا دل چاہا کہ اس ظالم شخص سے کہوں کہ وہ مجھے اشفاق کی چمک دار مسکراہٹ واپس دے دے، اس کی منگیتر یاسمین کی خوشیاں واپس دے دے اور اگر یہ بھی نہیں دے سکتا تو بابے میدے کی بیٹی کی عزت اور اس کا بانکپن واپس دے دے، لیکن مجھے معلوم تھا بدروک سنگھ ان میں سے کوئی چیز دینے کا اہل نہیں ہے۔ لہٰذا میں نے اس سے کچھ نہیں مانگا۔ بس دروازے کی طرف دیکھ کر اشارہ کیا۔ وہاں میرا اسب انسپکٹر موجود تھا۔ وہ بدروک سنگھ کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں تک پہنچا تھا اور میری ہدایت کا انتظار کر رہا تھا۔ میرا اشارہ پاتے ہی اس نے اندر آ کر بدروک سنگھ کو ہتھکڑی لگا دی۔

بدروک سنگھ کی گرفتاری کے بعد اگلے دن جو دن نکلا وہ بڑا چمکیلا اور تر و تازہ تھا۔ ہر شے نکھری نکھری اور جوان نظر آتی تھی۔ روتک پولیس چوکی کے دروازے پر کھڑے ہو کر میں بڑی دیر گلی میں آتے جاتے لوگوں کے چہرے دیکھتا رہا۔ ہر چہرے پر خوشی کی ایک غیر محسوس چمک دکھائی دی۔ ان چہروں میں مجھے بابے میدے اور گلاباں کے چہرے بھی دکھائی دیئے۔ گلاباں کے باپ نے آج بڑے صاف ستھرے کپڑے پہن رکھے تھے۔ اس کے بالوں میں گرد بھی نہیں تھی۔ وہ بیٹی کا سہارا لئے نحیف قدموں سے ایک جانب جا رہا تھا۔ معلوم نہیں کہاں جا رہا تھا اور کیوں جا رہا تھا؟ لیکن وہ خوش دکھائی دیتا تھا...... باپ بیٹی کو دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ میں نے اشفاق کا ادھورا کام انجام دے دیا ہے اور اس کی قربانی کو رائیگاں نہیں جانے دیا۔

☆======☆======☆

دلہن کا سوالی

ایک بدنصیب شخص کی دردناک کہانی۔ ایک چالاک اور بے غیرت شخص نے اس کے جذبات سے کھیل کر اس کا دل توڑ دیا...... اسے محبت کا دھوکا دیا گیا تھا۔ وہ اپنی برباد محبت کا انتقام ہر عورت سے لینا چاہتا تھا۔ اس کا انتقام جنون کی شکل اختیار کر گیا اور پھر......

کہانیاں تو بے شمار ہیں۔ زمینوں کے جھگڑے، وراثت کے تنازعے، دھوکہ دہی، رسہ گیری، ڈاکہ زنی، چوری چکاری...... لیکن میری کوشش ہوتی ہے کہ ان میں سے ایسی کہانیاں آپ تک پہنچاؤں جو مختلف ہوں اور جن میں آپ کی دلچسپی کا زیادہ سامان ہو۔

زیرِ نظر کہانی بھی ذرا مختلف قسم کی ہے اور امید ہے آپ کو پسند آئے گی۔ اس کہانی کا تعلق رام پور سے ہے۔ رام پور کی چند کہانیاں آپ پہلے بھی پڑھ چکے ہیں۔ دہلی سے مشرق کی طرف مراد آباد اور رام پور قریب ترین بڑے شہر ہیں۔ رام پور کا فاصلہ دہلی سے قریباً سوا سو میل ہے۔ اُس زمانے میں گاڑیاں سُست رفتاری سے چلتی تھیں لہٰذا دہلی سے رام پور پہنچتے پہنچتے قریباً پانچ گھنٹے لگ جاتے تھے۔

میں رام پور کے کرشن ٹاؤن تھانے میں تھا۔ بلال شاہ حسبِ معمول میرے ساتھ تھا۔ بظاہر اس کا میرے ساتھ کوئی رابطہ نہیں تھا۔ اس نے جب مجھے کوئی خبر پہنچانی ہوتی تو رات کو میرے گھر آتا تھا۔ ایک روز وہ صبح سویرے آدھمکا۔ اس کی زبانی پتہ چلا کہ اکبر ٹاؤن کی نازش اسٹریٹ میں ایک سنگین واردات ہوگئی ہے۔ تفصیل بتاتے ہوئے اس نے کہا کہ دیوندر نامی ایک شخص کے گھر رات چور گھس آئے ہیں۔ انہوں نے نہ صرف گھر کا صفایا کر دیا ہے بلکہ جاتے جاتے دیوندر کی بیوی پر تیزاب بھی پھینک گئے ہیں اس کا چہرہ جھلس گیا ہے اور وہ اس وقت اسپتال میں ہے۔

میں نے بلال شاہ سے دیوندر کے بارے میں پوچھا تو وہ بولا۔ ”گلی میں پان سگریٹ کی دکان کرتا ہے۔ اچھا آدمی نہیں ہے۔ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ وہ بیوی کی کمائی کھاتا ہے۔ میں نے تو یہاں تک سنا ہے کہ اس کی بیوی خاندانی طوائف ہے۔“

بلال شاہ بولا۔ ”فی الحال یقین سے تو کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن حالات سے اندازہ ہوتا

ہے کہ جھلسنے والی دیوندر کی ”کماؤ بیوی“ ہی ہے۔

بلال شاہ سے بات چیت کے بعد میں تھانے پہنچا تو سائل پہلے سے آئے بیٹھے تھے۔ لمبی مونچھوں والے ایک دبلے پتلے شخص کو دیکھ کر مجھے فوراً اندازہ ہوگیا کہ یہی دیوندر ہے۔ اس کی انگلیاں پان کے پکے رنگ میں رنگی ہوئی تھیں۔ اس کے ساتھ ایک موٹا تازہ شخص تھا۔ وہ شکل صورت سے کوئی خرانٹ ساہوکار نظر آتا تھا اور عینک کے پیچھے سے مجھے یوں گھور رہا تھا جیسے اس واردات کا اصل ذمے دار میں ہوں۔ ایک کالا کلوٹا ریلوے انجن جیسا محلّے دار بھی ان دونوں کے ساتھ تھا۔ دیوندر نے گلوگیر لہجے میں مجھے بتایا کہ رات اس کے گھر ڈاکہ پڑا ہے۔ ڈاکو سب کچھ لے گئے ہیں اور جاتے جاتے اس کی بیوی کو شدید زخمی کر گئے ہیں۔ میں نے تفصیل سننے سے پہلے موقعۂ واردات دیکھنا ضروری سمجھا۔ تینوں افراد کے ساتھ میں نازش اسٹریٹ پہنچا۔ یہ سخت سردیوں کے دن تھے۔ نو بجے تھے لیکن دھوپ ابھی منڈیروں سے نیچے نہیں اُتری تھی۔ ایک دو منزلہ مکان کے سامنے لوگوں کا ہجوم تھا۔ رُوئی کی صدریاں پہنے۔ ہاتھ بغلوں میں دیئے محلے دار یہاں وہاں کھڑے چہ مگوئیاں کر رہے تھے۔ ہم مکان کی ڈیوڑھی سے گزر کر ایک دلان میں پہنچے اور پھر ایک کشادہ کمرے میں آگئے۔ یہ ایک خوابگاہ تھی۔ آرائش کے سازوسامان سے اہلِ خانہ کی خوشحالی کا اندازہ ہوتا تھا۔ ایک کونے میں چھپرکٹ والی بڑی شاندار مسہری رکھی تھی۔ فرش پر اُونی دری تھی اور کھڑکیوں پر ریشمی پردے جھول رہے تھے۔ لگتا تھا پان فروش دیوندر کا گھر نہیں لکھنو کے کسی نواب کی رہائش گاہ ہے۔ بلال شاہ کی کہی ہوئی ”کماؤ بیوی“ والی بات سو فی صد درست ثابت ہو رہی تھی۔ یقینی بات تھی کہ دیوندر پان سگریٹ کا دھندہ صرف گاہکوں کو پھانسنے کے لیے کرتا ہے۔ ورنہ اُس کی اصل دکان اس دو منزلہ مکان میں تھی۔

میں نے موقعۂ واردات کا بغور جائزہ لیا۔ مسہری کی چادر کا ایک بڑا حصہ جلا ہوا تھا۔ تکیے کے غلاف پر بھی تیزاب کے چھینٹے تھے۔ کمرے کی چیزوں کو اُلٹ پلٹ کیا گیا تھا۔ ایک بڑا ٹرنک کھلا ہوا تھا اور اس میں سے نکالے جانے والے ریشمی کپڑے اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے۔ دیوندر نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

”رات میری طبیعت خراب تھی اس لیے برآمدے میں سو رہا تھا۔ میری بیوی رجنی اس کمرے میں اکیلی تھی۔ مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔ اس لیے سگریٹ پر سگریٹ پی رہا تھا۔ کوئی گیارہ بجے کا وقت تھا جب مجھے اندر سے کھٹ پٹ کی آواز آئی۔ میں نے سمجھا شاید رجنی کسی کام سے اٹھی ہے۔ تھوڑی دیر بعد رجنی بڑے زور سے چلائی۔ میری چارپائی دروازے کے

پاس ہی تھی۔ میں دروازہ کھول کر اندر گیا تو رجنی چارپائی سے نیچے گری ہوئی بُری طرح تڑپ رہی تھی۔ میں نے لائٹ جلا کر اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ چہرہ ہاتھوں میں دبائے چیخ رہی تھی "ہائے میری آنکھیں...... میری آنکھیں" میں نے دیکھا کمرے میں زبردست افراتفری مچی ہوئی ہے اور سرہانے کی طرف ایک کھڑکی جو شام کو میں نے خود اندر سے بند کی تھی کھلی ہوئی ہے۔ میں بھاگ کر کھڑکی میں پہنچا، باہر نظر دوڑائی لیکن گلی میں کوئی نہیں تھا۔ رجنی کی چیخیں سن کر ہمارے پڑوسی بھی جاگ اٹھے تھے۔ تھوڑی دیر میں کئی افراد اکٹھے ہو گئے اور ہم رجنی کو تانگے میں ڈال کر اسپتال لے گئے۔ راستے میں رجنی سے پوچھتا رہا کہ یہ کیسے ہو گیا لیکن وہ کچھ نہ بتا سکی۔ بس یہ کہتی رہی کہ وہ سوئی ہوئی تھی اسے کچھ پتہ نہیں ہے۔"

دیوندر کی بات سننے کے بعد میں نے اس سے پوچھا۔ "تمہارا کیا خیال ہے اگر کھڑکیاں اندر سے بند تھیں اور دروازے پر تم نے چارپائی ڈال رکھی تھی تو خوابگاہ میں کوئی کیسے گھسا؟"

دیوندر کی نظریں خود بخود روشندان کی طرف اُٹھ گئیں۔ وہ بولا۔ "مجھے خود سمجھ نہیں آ رہی جناب۔ وہ دیکھیں، وہ روشندان کی جالی اُکھڑی ہوئی ہے لیکن یہاں سے کوئی کیسے اندر آ سکتا ہے۔"

دیوندر کی بات ٹھیک تھی۔ روشندان مخروطی شکل میں تھا یعنی باہر سے کھلا اور اندر کی جانب سے تنگ تھا۔ ایسے روشندان اُن دنوں اکثر بنائے جاتے تھے۔ یہ بات ماننے والی نہیں تھی کہ اس تنگ روزن میں سے کوئی شخص کمرے میں گھس سکتا ہے۔

مجرم یا مجرمان کو باہر کی جالی اکھاڑنے کے بعد یقیناً مایوسی ہوئی ہوگی اور انہوں نے کمرے میں داخل ہونے کے لیے کوئی اور راستہ اختیار کیا ہوگا...... لیکن اور راستہ کون سا تھا؟ میں نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ اب دو ہی صورتیں ہو سکتی تھی۔ دیوندر جھوٹ بول رہا تھا یا پھر وہ بھول رہا تھا کہ اس نے گلی میں کھلنے والی کھڑکی اندر سے بند کر دی تھی۔ عین ممکن تھا کہ کھڑکی کھلی رہ گئی ہو یا اس کی چٹخنی صحیح طور پر نہ لگ سکی ہو اور مجرم یا مجرمان کو اندر گھسنے کا راستہ مل گیا ہو۔ دری پر قدموں کے نشانات کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ باہر کی گلی بھی پختہ تھی۔ میں نے ساری کھڑکی کھلوا کر کمرے میں اچھی طرح روشنی کی اور ہر چیز کا غور سے جائزہ لیا۔ ساتھ ساتھ میں دیوندر سے سوالات بھی کرتا جا رہا تھا۔ دیوندر نے بتایا کہ چوری ہونے والی چیزوں میں ایک قیمتی گراموفون، ایک کیمرہ اور ریڈیو بھی شامل ہیں۔ اس کے علاوہ رجنی کے قیمتی کپڑے اور میک اپ کا سارا سامان بھی غائب ہے۔ وہ پانچ ہزار

روپے نقد کا دعویٰ بھی کر رہا تھا لیکن میرا خیال تھا کہ اس کی یہ بات صحیح نہیں۔ حیرانی کی ایک بات یہ بھی تھی کہ رجنی کے زیور جو ریشمی کپڑوں کے ساتھ ہی پڑے تھے جانے سے بچ گئے تھے۔ یہ پندرہ بیس تولے سونا تھا۔ معلوم نہیں مجرم کی نگاہ ان پر نہیں پڑ سکی یا پھر کوئی اور بات تھی۔

میں نے موقعہ پر موجود افراد سے تفصیلی بیان لیے اور میرا محرر تیزی سے بیان قلمبند کر کے اُن پر دستخط کرواتا رہا۔ یہ سارے بیان ملتے جلتے ہی تھے۔ واردات کے بعد سب سے پہلے دیوندر خود موقعہ پر پہنچا تھا۔ اس کے بعد دیوندر کا ایک چھوٹا بھائی بھولا آیا تھا پھر پڑوسی خیر دین اور ارجن سنگھ پہنچے تھے۔ اس کے بعد دیگر محلّے دار بھی آ گئے تھے۔ ان سب نے رجنی کو دری پر لوٹ پوٹ ہوتے اور چیختے چلاتے دیکھا تھا۔ کمرے کی ایک کھڑکی کھلی ہوئی تھی اور چیزیں بکھری ہوئی تھیں...... ان بیانات کے بعد رجنی کا بیان لینا بھی ضروری تھا۔ ہم اسپتال پہنچے۔ وہ انتہائی نگہداشت کی وارڈ میں تھی۔ چہرہ اور ایک کندھا پٹیوں میں جکڑا ہوا تھا۔ وہ مسلسل کراہ رہی تھی۔ بڑی دشواری سے میں نے اس کا بیان لیا لیکن اس بیان میں کچھ بھی نہیں تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ کسی نہ کسی پر شک کا اظہار کرے گی مگر یہ خیال غلط ثابت ہوا۔

کراہتے اور سسکتے ہوئے وہ بولی۔ "مجھے کچھ پتہ نہیں میرے ساتھ کیا ہوا اور کس نے کیا ہے۔ میں سوئی ہوئی تھی۔ ایک دم لگا کسی نے آنکھوں میں پسی ہوئی مرچیں ڈال دی ہیں۔ میں آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر چیخنے چلانے لگی۔ دروازہ کھلا اور میرا شوہر دیوندر اندر آ گیا۔ تھوڑی دیر بعد لوگ مجھے تانگے میں ڈال کر یہاں لے آئے۔"

مضروبہ کا بیان لے کر ہم تھانے لوٹ آئے۔ تھانے میں میرے اے ایس آئی نے دو کام کے بندوں کو بلا کے بٹھا رکھا تھا۔ یہ دونوں نازش اسٹریٹ کے معززین تھے۔ ایک تو وہی خیر دین تھا جو دیوندر کا پڑوسی بھی تھا۔ اس کے علاوہ ایک قریبی مندر کا پجاری رام داس بیٹا تھا۔ ان دونوں نے تنہائی میں مجھ سے کھل کر بات کی۔ ایک طرح اُن دونوں کی رائے پورے محلّے کی رائے تھی۔ اس رائے کے مطابق رجنی اوّل درجے کی فاحشہ اور دیوندر پرلے درجے کا بے غیرت تھا۔ دونوں نے محلے داروں کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ بڑے دھڑلے کے ساتھ شریفوں کی آبادی میں کنجر خانہ کھولے ہوئے تھے۔ انہیں بہت دفعہ منع کیا گیا لیکن ایک سُود خور سیٹھ "بھاگل بھائی" اُن کی پشت پناہی کر رہا تھا۔ لہٰذا وہ اب تک محلے میں ٹکے ہوئے تھے (یہ بھاگل بھائی وہی شخص تھا جو تھانے میں دیوندر کے ساتھ رپورٹ لکھوانے آیا تھا)

یہ کوئی پیچیدہ واردات نظر نہیں آتی تھی۔ زیادہ امکان اس بات کا تھا کہ رجنی کے کسی دل

جلے عاشق نے اس سے کوئی پرانا بدلہ چکایا ہے۔ عین ممکن تھا کہ گھر میں گھسنے والے افراد ایک سے زیادہ ہوں۔ پہلے انہوں نے کمرے کا قیمتی سامان گھر سے باہر پہنچایا پھر سوئے پڑے فتنے کو تیزاب سے داغدار کیا اور نکل گئے۔ میرے خیال میں مجرم تک پہنچنا کچھ زیادہ مشکل نہیں تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ ابھی تک رجنی یا اس کے شوہر نے کسی پر شک کا اظہار نہیں کیا تھا۔ شاید وہ اپنا شک بتانے سے پہلے کچھ سوچنا سمجھنا چاہتے تھے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ محلے ہی کے کسی شخص پر شک کا اظہار کرنا چاہتے ہوں۔

بہر حال جو کچھ بھی تھا ایک دو دن میں سامنے آنے والا تھا۔ میں نے کچی رپورٹ درج کرنے کے بعد تفتیش اپنے سب انسپکٹر کے سپرد کر دی اور اسے کہا کہ وہ پوری احتیاط سے چھان بین کرے۔

دو دن بعد ایک اور واقعہ رُونما ہوا اور اس کے ساتھ ہی اس کیس نے ایک بالکل نیا رخ اختیار کر لیا۔ معاملہ ایک دم اتنا الجھ گیا کہ مجھے دوسرے کام چھوڑ کر ساری توجہ اس طرف دینی پڑی...... یہ واقعہ بھی تیزاب پھینکے جانے کا تھا۔ نشانہ ایک بیس اکیس سالہ لڑکی بنی تھی۔ لڑکی کا نام شمائلہ تھا اور وہ کالج اسٹوڈنٹ تھی۔ یہ واردات میرے تھانے کی آخری حدود میں ہوئی۔ یہ ایک فیشن ایبل آبادی تھی۔ چھوٹی بڑی کوٹھیاں بنی ہوئی تھیں۔ مسلمان یہاں زیادہ تعداد میں تھے۔ اس واردات کی اطلاع صبح نو بجے تھانے پہنچی۔ میں بھاگم بھاگ موقعہ پر آیا۔ یہ واردات بھی خوابگاہ میں ہوئی تھی۔ ملزم خوابیدہ لڑکی پر تیزاب پھینک کر نکل بھاگا تھا۔ شمائلہ کے والد عطا محمد صاحب ریلوے میں اعلیٰ افسر تھے۔ گھر میں سات آٹھ افراد کے علاوہ ایک چوکیدار اور تین ملازم بھی تھے لیکن ان میں سے کوئی بھی مجرم کو کوٹھی میں داخل ہوتے یا باہر نکلتے دیکھ نہیں سکا تھا۔ واردات علی الصبح تین اور چار بجے کے درمیان ہوئی۔ شمائلہ اپنے چھوٹے بھائی رضوان کے ساتھ گیلری میں سوئی ہوئی تھی۔ رات سوتے وقت وہ دروازے اور کھڑکیاں بند کر لیتے تھے، لیکن رات کسی وقت رضوان پیشاب کے لیے اٹھا اور اس کو دروازہ بند کرنا یاد نہیں رہا۔ تقریباً ساڑھے تین کا وقت تھا۔ شمائلہ کے والد مارننگ واک کے لیے بیدار ہو چکے تھے۔ اچانک انہیں گیلری کی طرف سے چیخوں کی آواز آئی۔ وہ بھاگم بھاگ اوپر پہنچے۔ دروازہ چوپٹ کھلا تھا۔ بتی جل رہی تھی۔ شمائلہ فرش پر بیٹھی چیخ رہی تھی اور رضوان اسے سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ خوش قسمتی سے لڑکی کا چہرہ بچ گیا تھا۔ تاہم کندھا اور ایک پہلو بُری طرح جل گئے تھے۔ وہ اس وقت اسپتال میں نیم بے ہوش پڑی تھی۔ عطا صاحب اور اُن کے اہلِ خانہ نے عقلمندی کا ثبوت دیتے ہوئے موقعے کی گواہیوں کو ملیامیٹ نہیں کیا تھا۔

میں نے اپنے سامنے گیلری کا دروازہ کھلوایا اور اندر داخل ہوا۔ جلے ہوئے چمڑے اور تیزاب کی بُو کمرے میں بھری تھی۔ مختلف چیزیں اِدھر اُدھر بکھری تھیں۔ ایک طرف انگریزی فلمی رسالہ پڑا تھا۔ اس کے آدھے صفحے جلے ہوئے تھے۔ پاس ہی ٹینس بال اور ریکٹ وغیرہ پڑے تھے۔ کمرے میں آویزاں ایک تصویر سے اندازہ ہوتا تھا کہ شمائلہ اور اس کا چھوٹا بھائی دونوں ٹینس کھیلتے ہیں۔ سفید نیکر میں شمائلہ کی سڈول ٹانگیں پھنسی پھنسی نظر آ رہی تھیں۔ وہ بڑی بے تکلفی سے بھائی کے گلے میں بانہیں ڈالے کھڑی تھی۔ کمرے میں نظر آنے والا تقریباً تمام سامان قیمتی تھا لیکن اس سامان کو دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہاں سے کوئی چیز چرائی نہیں گئی۔ اس لحاظ سے یہ واردات طوائف رجنی والی واردات سے مختلف ہو جاتی تھی...... موقعۂ واردات کا معائنہ کرتے ہوئے مجھے ایک خاص نشان نظر آیا جو میں نے ذہن میں محفوظ کر لیا اور شمائلہ کے والد عطا محمد کو لے کر گھر کے ڈرائینگ روم میں آ گیا۔ عطا صاحب بہت پریشان اور آزردہ نظر آتے تھے۔ تنہائی میں مَیں نے ان سے پہلا سوال یہ کیا کہ انہیں کس پر شک ہے۔

وہ بولے ''انسپکٹر! میرا تو دماغ سُن ہو گیا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا...... ایک منٹ ٹھہریئے۔ میں آپ کو ایک چیز دکھاتا ہوں۔''

وہ اٹھ کر گئے اور کسی دوسرے کمرے سے ایک لفافہ لے آئے۔ یہ لفافہ انہوں نے میرے سامنے میز پر ڈال دیا۔ اس میں ڈاک کے تین چار چھوٹے لفافے تھے۔ لفافوں پر اسی کوٹھی کا ایڈریس تھا اور مہریں لگی ہوئی تھیں۔ عطا صاحب نے ایک لفافہ کھول کر خط نکالا اور بولے ''دیکھئے انسپکٹر صاحب! یہ پڑھیے۔''

لکھا تھا۔ ''مس شمائلہ عطا۔ یہ میرا تیسرا خط ہے میں تمہیں آخری وارننگ دے رہا ہوں۔ فیشن پرستی چھوڑ دو۔ پردہ دار عورت بنو۔ برقعے میں نکلو۔ راہ چلتے ہوئے اپنی نگاہ نیچے رکھو۔ غیر مردوں سے بات نہ کرو۔ ریڈیو مت سنو۔ اتوار کے روز سے تم نے پھر ٹینس کھیلنا شروع کر دیا ہے۔ تم جان بوجھ کر مصیبت کو دعوت دے رہی ہو۔ یاد رکھو، میں تمہیں بہت سخت سزا دوں گا۔ فقط تمہارا خیر خواہ ب ب۔''

میں نے جلدی جلدی دوسرے خط بھی پڑھے۔ ان کا مضمون بھی کچھ اسی قسم کا تھا۔ یوں لگتا تھا کسی مذہبی جماعت کے جوشیلے کارکن نے اپنے طور پر عورتوں کو نیکوکار بنانے کا بیڑا اٹھا لیا ہے۔ میرا دھیان فوراً رجنی والی واردات کی طرف چلا گیا۔ رجنی ایک بدکار عورت تھی اور مردوں کو اپنی زیب و زینت سے رجھاتی تھی۔ شمائلہ ایسی تو نہیں تھی لیکن فیشن پرستی کی حد تک

وہ بھی یہی کام کرتی تھی۔ اس کا مطلب تھا ان دونوں وارداتوں میں قیمتی چیزوں کی طرف کچھ زیادہ رغبت ظاہر نہیں کی تھی۔ رجنی کے گھر وہ کئی تولے جوں کا توں چھوڑ گیا تھا جبکہ شمائلہ کی خوابگاہ میں اُس نے کسی قیمتی چیز کو ہاتھ ہی نہیں لگایا تھا۔

یہ معاملہ سنگین ہونے کے علاوہ دلچسپ بھی ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے خط احتیاط سے اپنے پاس رکھ لیے اور شمائلہ کے والد کے ساتھ دوبارہ موقعۂ واردات پر پہنچا۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے میں ایک زمینی شہادت ڈھونڈنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اس مرتبہ میں نے خوب دھیان سے اس نشان کو دیکھا۔ یہ کسی بچے کے جوتے کا نشان تھا۔ ایک نشان میز کی سطح پر تھا اور دوسرا شمائلہ کے بیڈ کے پاس۔ یہ نشان ایسے واضح تو نہیں تھے لیکن بارک بینی سے دیکھا جاتا تو کسی کو بھی نظر آ سکتے تھے۔ گیلری کے عقب میں پانی کا پائپ تھا۔ کمرے میں داخل ہونے والا یقیناً اسی پائپ سے اوپر آیا تھا اور عقبی کھڑکی کھول کر یا چھت پر سے ہو کر گیلری میں داخل ہو گیا تھا۔ میں نے نیچے جا کر پائپ کے اِردگرد کی زمین کو دیکھا۔ یہ جگہ کوٹھی کے عقبی باغ سے ملتی تھی اس لیے کچی تھی۔ اس کچی زمین پر مجھے دو تین جگہ وہی پاؤں نظر آئے۔ یہ نشان پائپ کے بالکل قریب بھی موجود تھے۔ بڑی عجیب سی بات لگ رہی تھی۔ پاؤں کا نشان دس بارہ سال کے بچے کا تھا۔ تو کیا کل رات شمائلہ کی خوابگاہ میں داخل ہونے والا دس بارہ سالہ بچہ تھا۔ بات ذہن میں نہیں آتی تھی لیکن اسے جھٹلایا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ پاؤں کا نشان پائپ کے نزدیک اور کمرے میں دونوں جگہ موجود تھا اور یہ نشان گھر کے کسی فرد کا نہیں تھا۔ شمائلہ کا چھوٹا بھائی بھی موقعہ پر موجود تھا۔ اس کی عمر سولہ سترہ سال تھی۔ میں نے اس کے پاؤں دیکھے۔ وہ ایک مرد کے پاؤں سے کچھ ہی چھوٹے ہوں گے۔ پھر یہ بچکانہ پاؤں کس کے تھے؟ دفعتاً میرا دھیان رجنی والی واردات کی طرف چلا گیا۔ ایک دم دماغ میں روشنی سی بھرنے لگی۔ وہاں ایک تنگ روشندان ہمارے لیے اُلجھن کا باعث بنا تھا لیکن اگر مجرم واقعی ''ایک بچہ'' تھا تو پھر وہ اُس روشندان میں سے بھی باآسانی گزر سکتا تھا۔

اب یہ معاملہ ایک بالکل نیا رخ اختیار کر رہا تھا۔ دونوں وارداتوں میں کافی حد تک مشابہت پائی جاتی تھی۔ ذہن میں خود بخود یہ بات آ رہی تھی کہ ہو سکتا ہے رجنی کو بھی اس طرح کے خطوط لکھے گئے ہوں...... اگر ایسے خطوط لکھے گئے تھے تو پھر اُن لوگوں نے یہ بات چھپائی کیوں تھی؟ کیا وہ کسی سے خوفزدہ تھے یا پھر...... کوئی اور بات تھی؟

عطا محمد صاحب کے گھر ضروری کارروائی کے بعد ہم واپس تھانے پہنچ گئے۔ میں نے فوراً دو کانسٹیبل بھیجے اور طوائف رجنی کے مبینہ شوہر دیوندر کو تھانے بلا بھیجا۔ وہ خاصا پریشان

نظر آتا تھا۔ ظاہر ہے بیوی کے بدصورت ہونے سے اُس کا روزگار چھن گیا تھا۔ بیوی کے علاج معالجے پر پیسے الگ خرچ ہو رہے ہوں گے۔ اس نے منہ بسورتے ہوئے مجھے یہ اطلاع بھی دی کہ رجنی کی دونوں آنکھیں ضائع ہو گئی ہیں اور چہرہ بری طرح بگڑ گیا ہے۔ چند رسمی باتوں کے بعد میں اصل موضوع پر آ گیا۔ میں نے دیوندر کو سمجھایا کہ اگر وہ اپنی بیوی پر ظلم ڈھانے والے کو قانون کی گرفت میں دیکھنا چاہتا ہے تو کوئی بات چھپائے مت۔

وہ بولا۔ ''کیا آپ سمجھ رہے ہیں کہ میں کچھ چھپا رہا ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''مجھے نہیں معلوم کون چھپا رہا ہے، لیکن مجھ سے کچھ چھپایا ضرور جا رہا ہے۔''

''آخر کس قسم کا شک ہے آپ کو؟'' دیوندر نے پوچھا۔

جواب میں مَیں نے اسے نئی واردات کی ساری تفصیل بتا دی اور یہ بھی بتا دیا کہ اس واردات میں مجرم نے لڑکی کو وارننگ کے کئی خطوط لکھے ہیں۔ خطوط کے ذکر پر دیوندر بُری طرح چونک گیا۔ میں نے اس کے چہرے کو رنگ بدلتے دیکھا اور سمجھ گیا کہ میرا تیر نشانے پر لگا ہے۔ دیوندر نے کچھ دیر اِدھر اُدھر کی ہانکی پھر سیدھے راستے پر آ گیا۔ اس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے یہ اعتراف کر لیا کہ ایسے ہی رقعے واردات سے پہلے اُن کو بھی ملے ہیں...... دیوندر کے اس اعتراف کے بعد یہ معاملہ بالکل صاف ہو گیا۔ یہ دونوں وارداتیں ایک ہی مجرم نے کی تھیں۔

میں نے فوراً دیوندر کو بھیجا کہ وہ رقعے لے کر آئے۔ دیوندر کانسٹیبل کے ساتھ گیا اور آدھ پون گھنٹے بعد رقعے لے آیا۔ لفافے دیکھتے ہی میں سمجھ گیا کہ شمائلہ اور رجنی کو لکھنے والے خطوط ایک ہی شخص نے لکھے ہیں۔ ان دونوں کا مضمون بھی قریباً قریباً وہی تھا۔ رجنی کو دھمکایا گیا تھا کہ وہ بے حیائی اور فیشن پرستی چھوڑ کر سیدھے راستے پر آ جائے ورنہ اُس سے بُرا سلوک کیا جائے گا۔ خطوں کے نیچے وہی ''ب ب'' کے الفاظ تھے۔ بالکل فلموں ناولوں جیسا چکر تھا۔

میں نے دیوندر سے پوچھا کہ اس نے یہ خطوط پوشیدہ رکھنے کی کوشش کیوں کی۔ جواب میں دیوندر نے کہا۔ ''جناب! یہ خط میں ہی وصول کرتا رہا ہوں۔ مجھے ڈر تھا کہ میں نے ان کے بارے میں رجنی کو بتایا تو وہ پریشان ہو گی۔ لہٰذا بات اپنے تک ہی رکھی۔''

میں پوری بات سمجھ گیا۔ دیوندر پرلے درجے کا خودغرض اور بے غیرت شخص تھا۔ بیوی کے ذریعے ہر ماہ اسے ''معقول'' آمدن ہوتی تھی۔ وہ کسی چکر میں پڑ کر اس آمدن سے ہاتھ

دھونا نہیں چاہتا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ اس نے ان خطوط کے بارے میں رجنی کو بتایا تو وہ خوفزدہ ہو جائے گی۔ لہٰذا وہ خطوط اپنے پاس ہی جمع کرتا رہا۔ بعد میں جب خط لکھنے والے نے اپنی دھمکیوں کو سچ کر دکھایا تو دیوندر کو ہوش آیا لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔

میں نے دیوندر کو بُرا بھلا کہا۔ وہ خاموشی سے سنتا رہا۔ اسے بھی یہ احساس تھا کہ رجنی سے خطوط چھپا کر اس نے اپنے اور رجنی کے حق میں برا کیا ہے۔ میں نے اس سے کہا۔

''واردات ہوئے چار روز ہو چکے ہیں۔ کیا کسی نتیجے پر پہنچے ہو تم؟'' میرا مطلب تھا کہ اس نے کسی پر شک ظاہر کرنا ہے یا نہیں۔

دیوندر کی آنکھیں گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ دائیں ہاتھ کے انگوٹھے سے ٹھوڑی کھجا کر بولا۔ ''تھانیدار صاحب! اب تک تو میں کسی خاص بندے پر شک نہیں کر سکا تھا لیکن اب آپ کی بات سن کر دماغ میں ایک خیال آ رہا ہے۔ آپ نے کہا ہے کہ اس واردات میں کسی بچے کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔ بچے کی بات سے میرے دماغ میں یوسف خاں کے بیٹے نکے خاں کا خیال آ رہا ہے۔ نکے خاں کو جانتے ہیں آپ؟'' میں نے نفی میں جواب دیا۔ دیوندر بولا۔ ''بڑا اکھڑ منڈا ہے جی۔ بلکہ منڈا تو لگتا ہی نہیں پورا بدمعاش لگتا ہے۔ بارہ سال کی عمر میں دو دفعہ جیل کی ہوا کھا آیا ہے۔ اس کا ایک چاچا شوکی خاں اس کا بیڑا غرق کر رہا ہے۔ کہہ رہا ہے میں نکے خاں کو اس کے باپ کی طرح اول درجے کا بدمعاش بناؤں گا۔ اپنے ساتھ اسے جوئے خانے میں لے جاتا ہے اور شراب پلاتا ہے۔''

میں یہ باتیں سن کر حیران ہوا۔ یوسف خاں کا نام تو میں نے اچھی طرح سنا ہوا تھا۔ دو برس پہلے تک وہ علاقے کا سب سے نامی گرامی بدمعاش تھا لیکن پھر ایک لڑائی میں اُس کے سر پر کلہاڑی لگی جس کے نتیجے میں وہ پہلے اسپتال اور پھر قبر میں پہنچ گیا۔ چند روز بعد اس کی بیوی بھی صدمے سے چل بسی۔ یوسف کے بھائی شوکی خاں کو بھی میں اچھی طرح جانتا تھا۔ بھائی کی طرح وہ بھی نامی گرامی بدمعاش تھا۔ اب دیوندر نے بتایا تھا کہ وہ اپنے کم عمر بھتیجے کو بدمعاشی کے گُر سکھانے میں مصروف ہے۔

میں نے دیوندر سے پوچھا۔ ''تمہارے دماغ میں نکّے خاں کا نام کیسے آ گیا ہے۔''

وہ گہری سانس لے کر بولا۔ ''بات تو بڑی عجیب سی ہے لیکن آپ اس کی تصدیق محلے داروں سے بھی کر سکتے ہیں۔ شوکی خاں نکّے کو کم عمر میں ہی مکمل بدمعاش بنا دینا چاہتا ہے۔ اس چکر میں وہ ہر اُلٹے سے اُلٹا کام کر گزرتا ہے۔ میں نے تو یہاں تک سنا ہے کہ وہ نکّے کو طوائفوں کے کوٹھوں پر لے جاتا ہے اور......بس اب آپ کو کیا بتاؤں میں۔ نکّے خاں چھوٹی

عمر میں ہی پکا مرد بنا ہوا ہے۔ آپ اسے دیکھیں گے تو حیران رہ جائیں گے۔ دو تین ماہ پہلے اس نے رجنی کو کہیں بازار میں دیکھ لیا۔ بس وہیں سے اُس کے پیچھے لگ گیا۔ رجنی کہتی ہے کہ وہ اس کے پیچھے گھر تک آیا۔ سارے راستے میں سگریٹ پیتا رہا اور مردوں کی طرح رجنی پر آوازیں کستا رہا۔ اس کے بعد میں نے دو تین مرتبہ اسے اپنے گھر کے پاس منڈلاتے دیکھا۔ اُسے دیکھ کر غصہ بھی آتا تھا اور حیرانی بھی ہوتی تھی۔ اتنی سی عمر میں وہ پکا لوفر بن چکا ہے۔ بچوں کی شکایت بڑوں سے کی جاتی ہے لیکن میں اس کی شکایت کس سے کرتا۔ چاچا ہی اس کا سب سے معتبر بزرگ ہے اور وہ اسے بدمعاشی کے داؤ پیچ سکھا رہا ہے......اب آپ نے بچے کی بات کی ہے تو میری آنکھوں میں مسلسل نکّے خاں کی شکل گھوم رہی ہے۔''

میں نے محسوس کیا کہ دیوندر کے لہجے میں دبا دبا جوش اور غصہ ہے۔ اتنے میں میرا ایک اے ایس آئی بھی آ گیا۔ وہ شوکی خاں کے علاقے کا ہی رہنے والا تھا۔ میں نے اس سے نکے خاں اور اس کے چچا شوکی خاں کے بارے میں پوچھا۔ نکے خاں کا نام سن کر اے ایس آئی بھی کانوں کو ہاتھ لگانے لگا بولا۔ ''جناب! وہ تو ایک آفت کا گھر ہے۔ پوری بستی کا ناک میں دم کر رکھا ہے اس نے۔ رمضان کے پہلے روز سے جیب کاٹتے ہوئے پکڑا گیا تھا۔ تین مہینے جیل کی ہوا کھا کر بقر عید پر واپس آیا ہے۔ اس سے پہلے ایک ہم عمر لڑکے کی آنکھ نکال دی تھی اس نے۔ ہر روز کوئی نہ کوئی کارنامہ انجام دیتا ہے۔ بس کچھ نہ پوچھئے اس کا۔ اپنے باپ کے ''کام'' کو بڑی ترقی دے گا۔''

اب اس لڑکے اور اس کے چاچے سے ملاقات ضروری ہو گئی تھی۔ لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ اگر فرض کر لیا جاتا کہ دونوں وارداتوں میں کمرے میں گھس کر تیزاب پھینکنے والا یہ نکے خاں تھا تو خط کس نے لکھے تھے۔ نکے خاں، اس کے چاچے یا کسی اور کو کیا ضرورت تھی ایسے دینداری کے خط لکھنے کی۔ وہ تو لوفروں کی منڈلی تھی۔ ایسے لوگ عورتوں کو پردے کی نصیحت کرنے والے خط نہیں لکھتے۔ صرف محبت نامے لکھتے ہیں یا بلیک میل کرتے ہیں۔ بہرحال رجنی کا شوہر لڑکے پر شک کا اظہار کر رہا تھا میں نے ضروری سمجھا کہ ایک بار اس فتنے کی صورت دیکھ لی جائے۔

جیسا کہ میں نے بتایا ہے وہ شہر کا جنوبی تھانہ تھا۔ میں نے متعلقہ تھانیدار سے رابطہ قائم کیا اور نکے خاں کو اس کے چاچے سمیت تھانے بلا لیا۔ نکے خاں کا چاچا مجھے تھوڑا بہت جانتا تھا لہٰذا میرے بلاوے پر وہ بغیر کسی اعتراض کے آ گیا۔ نکے خاں بھی اس کے ساتھ تھا۔ وہ بارہ تیرہ سال کا ایک گورا چٹا لڑکا تھا۔ آنکھیں چینیوں جیسی اور ناک کافی پھولی ہوئی تھی۔ وہ

دیکھنے میں ہی جھگڑالو نظر آتا تھا۔ چاچے کی طرح اس نے بھی دو گھوڑا بوسکی کا لمبا کرتہ اور تلے دار گول ٹوپی پہن رکھی تھی۔ ان دنوں علاقے میں یہ بدمعاشوں کا خاص لباس تھا۔ چاچے بھتیجے نے ''بڑے پھنے خانی'' انداز میں سلام کیا اور مونڈھے گھسیٹ کر بیٹھ گئے۔ میں دلچسپی سے اس نومولود بدمعاش کو دیکھنے لگا۔ وہ ذرا بھی گھبرایا ہوا نہیں تھا۔

شوکی خاں نے بے تکلفی سے کہا۔ ''ہاں صاحب جی! کس طرح یاد کیا ہم نوکروں کو؟''

میں نے کہا۔ ''تمہارے اس شاگرد کی بڑی مشہوری سن رہا تھا۔ سوچا ذرا دیدار ہی کر لوں۔''

شوکی خاں مسکرانے لگا۔ کان سے سگریٹ نکال کر سلگایا اور دھواں چھوڑتے ہوئے بولا۔ ''آپ اصل بات بتائیں صاحب جی۔ ہماری فکر نہ کریں۔ ہم تو گھر سے ہر مصیبت کے لیے تیار ہو کر آئے ہیں۔''

''یعنی تمہارا مطلب ہے میں تمہیں گرفتار کرلوں گا؟''

وہ بولا۔ ''ہمارا آپ کا یہی تو ایک رشتہ ہے جی۔ ورنہ ہماری شکل دیکھنا کون گوارا کرتا ہے۔'' ایک لمبا کش لینے کے لیے وہ رُکا پھر مسکرا کر بولا۔ ''میرا خیال ہے اس دلّے نے کافی کان بھرے ہیں آپ کے۔ ویسے بائی دی وے...... کیا کہتا ہے وہ خنزیر کا بچہ؟''

میں سمجھ گیا کہ وہ رجنی کے شوہر دیوندر کا ذکر خیر کر رہا ہے۔ وہ تھا بھی ان گالیوں کے قابل۔ میں نے شوکی خاں سے کہا۔ ''یہ تو چور کی ڈاڑھی میں تنکے والی بات ہے۔ تم نے کیسے اندازہ لگایا کہ میں تم سے دیوندر کے بارے میں بات کروں گا۔''

وہ بولا۔ ''اس بات کو جانے دیں جی آپ۔ ہمیں بھی کئی پشتیں ہوگئی ہیں بدمعاشی میں پیر رکھے ہوئے، پتہ چل جاتا ہے کہ سرکاری گھر میں طلبی کیوں ہوتی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''اگر سمجھ ہی گئے ہو تو پھر کچھ بتا بھی دو۔''

وہ بولا۔ ''اس حرامی نے آپ کو کیا بتایا ہے؟''

میں نے کہا۔ ''اس نے تو کچھ نہیں بتایا، ہاں مجھے اپنے طور پر پتہ چلا ہے کہ تمہارا یہ دو دانت کا بدمعاش دیوندر کے گھر کے پھیرے لگاتا رہا ہے۔ بازار میں اعلانیہ کہتا تھا کہ میں ''رجنی کوٹھے والی'' کو اغوا کر کے لے جاؤں گا۔''

''تو آپ کا خیال ہے کہ اس نے رجنی کے گھر میں گھس کر اس پر تیزاب پھینکا ہے؟''

میں نے کہا۔ ''یہ کوئی ایسی نہ ہونے والی بات بھی نہیں ہے۔ تم اس کو جو اعلیٰ تربیت دے رہے ہو یہ کوئی بھی کارنامہ انجام دے سکتا ہے۔ کل کلاں یہ تمہیں بھی قتل کر ڈالے تو مجھے

کوئی حیرانی نہیں ہوگی۔''

لڑکا خود اعتمادی سے ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے بیٹھا تھا اور اپنی سلیم شاہی جوتی کو مسلسل حرکت دے رہا تھا۔ یوں لگتا تھا وہ ہماری باتوں کو کوئی خاص اہمیت نہیں دے رہا۔ شوکی خاں لاپرواہی سے بولا۔ ''آپ تو بادشاہوں والی بات کرتے ہیں جی۔ اتنے سے بچے پر اتنا بڑا الزام لگا رہے ہیں۔ کوئی سنے گا بھی تو ہنسے گا۔''

میں نے کہا۔ ''ہنسے گا نہیں روئے گا تمہاری عقل پر۔ تم نے اس بچے کو بچہ نہیں رہنے دیا ہے۔ اس پر کسی وقت کوئی بھی الزام لگ سکتا ہے اور میں جو الزام لگا رہا ہوں وہ بے وجہ نہیں ہے۔ میں نے موقعۂ واردات سے ثبوت اٹھائے ہیں...... رجنی کے گھر میں روشندان سے مجرم اندر داخل ہوا وہ اتنا چھوٹا ہے کہ اس عمر کا بچہ ہی اس میں سے گزر سکتا ہے۔ اب جو تازہ واردات ہوئی ہے اس میں مجرم کا کھرا ملا ہے اور وہ کھرا ننگے خاں کی عمر کے بچے کا ہے۔''

گفتگو کے دوران میری نگاہیں مسلسل ننگے خاں کا چہرہ دیکھ رہی تھیں۔ کچھ بھی تھا بہرحال وہ بچہ تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بہت کچھ بتا سکتے تھے۔ شوکی خاں نے میری بات کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''تو آپ کہنا چاہتے ہیں کہ دیوندر کے گھر گھسنے والا ایک بچہ ننگے کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتا۔''

میں نے کہا۔ ''فی الحال تو مجھے یہی محسوس ہو رہا ہے۔''

وہ بولا۔ ''لیکن مجھے کچھ اور محسوس ہو رہا ہے۔ میرا خیال ہے آپ کو اپنے تھانے کے حالات کا کچھ زیادہ پتہ نہیں۔ شاید آپ کا متعلقہ مخبر بوٹی وغیرہ پیتا ہے...... اگر آپ کو کسی بچے پر ہی شبہ ہے تو پھر اس سے پہلے آپ کو حافظ انیس احمد کی خبر لینی چاہیے تھی۔''

''یہ حافظ انیس احمد کون ہے؟'' میں نے پوچھا۔

وہ بولا۔ ''اس لیے تو میں کہتا ہوں کہ آپ کو اپنے تھانے کے ''خاص'' بندوں کا کچھ پتہ نہیں۔ حافظ انیس اس مسجد کا امام ہے جو نازش اسٹریٹ کے کمیٹی چوک والے سرے کی طرف ہے......''

میں نے پوچھا۔ ''حافظ انیس کو تم اس معاملے میں کیوں گھسیٹ رہے ہو؟''

شوکی خاں نے جواب دیا۔ ''اس لیے کہ وہ رجنی اور اس کے فرضی شوہر کو نازش اسٹریٹ میں ایک پل بھی دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔''

''یعنی تم کہنا چاہ رہے ہو کہ حافظ انیس نے اپنے کسی شاگرد کے ذریعے رجنی پر تیزاب پھینکوایا تاکہ وہ جسم فروشی نہ کر سکے۔''

"بالکل" شوکی خاں نے سر ہلایا۔ "حافظ انیس مسجد میں ایک دینی مدرسہ بھی چلاتا ہے۔ ڈیرہ غازی خاں، پشاور، چکوال، میانوالی، اور کئی دوسرے علاقوں کے سوڈیڑھ سو لڑکے حافظ کے پاس پڑھتے ہیں۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر رجنی پر کسی بچے نے تیزاب پھینکا ہے تو وہ حافظ انیس کے شاگردوں میں سے ہوگا۔"

میں نے کہا۔ "لیکن ابھی تک کسی شخص نے مجھ سے ایسی بات نہیں کی۔ یہاں تک کہ رجنی اور دیوندر نے بھی حافظ انیس کا ذکر نہیں کیا۔"

اس نے کہا۔ "وجہ یہ ہے جناب کہ حافظ انیس نے سینے تک لمبی ڈاڑھی رکھی ہوئی ہے ماتھے پر محراب ہے اور ہونٹوں پر ہر وقت اللہ اللہ رہتا ہے۔ ہم بدمعاش لوگ ہیں۔ کریں تب بھی پکڑے جاتے ہیں نہ کریں تب بھی۔ حافظ انیس جیسے لوگوں پر کوئی شبہ نہیں کرتا۔"

میں نے جواب دیا۔ "کچھ بھی ہے۔ دیوندر اور رجنی کو تو اُس پر شک ہونا چاہیے تھا۔"

"کیسے ہوتا شک؟" شوکی خاں نے کہا۔ "وہ میٹھی چھری ہے اور میٹھی چھری کس کو بُری لگتی ہے۔ وہ ایسا بھلا مانس بندہ ہے کہ آپ کے سامنے کسی کو قتل کر ڈالے تو آپ کہیں گے کہ نہیں میری آنکھوں کو دھوکا ہوا ہے۔ آپ نازش اسٹریٹ کے سارے شریفوں سے پوچھ لیں۔ کوئی یہ نہیں کہے گا کہ حافظ انیس ایسا کام کر سکتا ہے لیکن میں بدمعاش ہوں اس لیے پورے یقین سے یہ بات کہتا ہوں کہ اگر یہ واردات کسی بچے کے ذریعے ہوئی ہے تو پھر وہ حافظ انیس کے مدرسے کا بچہ ہے۔"

نہ جانے کیوں مجھے شوکی خاں کی بات میں وزن محسوس ہو رہا تھا۔ وہ خط جو رجنی اور شائلہ کے گھروں سے برآمد ہوئے تھے انہیں پڑھ کر شبہ ہوتا تھا کہ وہ کسی کٹر مذہبی شخص نے لکھے ہیں۔ وہ عورتوں کی فیشن پرستی اور بے راہ روی سے سخت جھلایا ہوا ہے اور انہیں راہِ راست پر لانا چاہتا ہے۔ یہ ناممکن نہیں تھا کہ وہ شخص حافظ انیس یا اس کا کوئی سینئر شاگرد ہو۔ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ دینی مدارس میں تعلیم پانے والے بچے مذہب کے معاملے میں بے پناہ جوش و خروش کے مالک ہوتے ہیں۔ اگر ایک قابل استاد اُن کے جوش و خروش اور والہانہ پن کو سلیقے سے استعمال کرے تو بڑے سے بڑا کام لے سکتا ہے لیکن اگر انہیں تنگ نظری اور فرقہ واریت کی راہ پر ڈال دیا جائے تو خطرناک صورتِ حال پیدا ہو جاتی ہے۔

شوکی خاں نے بڑی ہوشیاری سے میرے ذہن میں شک کا بیج بو دیا تھا۔ اب میں جب تک اس شک کو رفع نہ کر لیتا تفتیش کا آگے بڑھنا ممکن نہیں تھا۔ میں نے شوکی خاں اور اس کے بھتیجے کو واپس بھیجنے کا فیصلہ کیا لیکن اس سے پہلے میں نکے سے تنہائی میں چند سوال کرنا چاہتا

تھا۔ میں نے شوکی خاں سے باہر جانے کو کہا۔ میرا خیال تھا وہ پس و پیش کرے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ وہ فوراً اُٹھ کر چل دیا...... بچہ کتنا بھی پکا ہو بچہ ہی ہوتا ہے۔ پولیس کی ڈانٹ ڈپٹ پر وہ رونے لگتا ہے یا سب کچھ صاف صاف بتا دیتا ہے۔ میں نے نکے خاں سے پوچھ گچھ شروع کی۔ شکل کی طرح اس خبیث کی گفتگو بھی افلاطونی تھی۔ یہ گفتگو کچھ اس طرح تھی۔

میں نے پوچھا۔ "تیرا نام کیا ہے بچے؟"

کہنے لگا۔ "صاحب جی! ماں نے تو ادریس خاں رکھا تھا۔ اب یار بیلی نکے خاں کہتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "نکے خاں! یہ مت سمجھو کہ مجھے کچھ پتہ نہیں۔ میں صرف تمہارے چاچے کا دل دیکھ رہا تھا۔ پچھلے جمعے نازش اسٹریٹ میں جو کچھ ہوا مجھے سب پتہ ہے۔ یہ بھی پتہ ہے کہ تیزاب کون لایا تھا۔ رجنی کے گھر کی دیوار کس نے پھلانگی تھی اور اب چوری کا مال تم لوگوں نے کہاں چھپا رکھا ہے اور اگر تم اپنی اور چاچے کی خیریت چاہتے ہو تو سب کچھ صاف صاف بتا دو۔ ورنہ آج تمہیں یہاں بچانے کوئی نہیں آنے والا۔"

لڑکے کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے خوف کے سائے لہرائے پھر وہ گردن اکڑا کر بولا۔ "صاحب جی! میرا جواب وہی ہے جو میرے چاچے کا تھا۔ تم نے مجھے ہاتھ لگایا تو پھر لمبی دشمنی شروع ہو جائے گی اور یہ مت سمجھنا کہ میں مار سے ڈر کر جھوٹا الزام اپنے سر لے لوں گا۔ جوان مار سے نہیں ڈرا کرتے اور جو ڈر جائے وہ جوان نہیں ہوتا۔" اس نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے اصیل مرغ کی طرح سینہ تان لیا۔

کتنا بھی تیز طرار تھا لیکن تھا تو بچہ ہی۔ اس کی اتنی سی بات سے مجھے سو فیصد یقین ہو گیا کہ تیزاب پھینکنے کی وارداتوں میں نکے خاں یا شوکی خاں کا کوئی ہاتھ نہیں۔ میں نے نکے خاں کو گھورتے ہوئے کہا۔

"تو تم اپنے جرم سے انکار کرتے ہو؟"

"میں نے کوئی جرم نہیں کیا صاحب بہادر!" وہ گردن کی رگیں پھلا کر بولا۔ لگتا تھا کہ ایک آدھ اور بڑھک مارے گا لیکن پھر ایک دم ارادہ بدل کر بولا! "بس تم میرے چاچے کو بلا دو۔"

"اگر نہ بلاؤں تو؟"

"تو...... تو تمہاری مرضی ہے۔ تم مائی باپ ہو۔ پر صاحب بہادر۔ میں یوسف خاں کا پتر ہوں اور سارا جگ جانتا ہے۔ یوسف خاں اپنا بدلہ نہیں چھوڑتا تھا۔"

"تو تم مجھ سے بدلہ لو گے؟" میں اس کی حیران کن باتوں میں دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

"بس جی! تم میرے چاچے کو بلاؤ۔ خواہ مخواہ بچوں سے متھا نہ لگاؤ۔ بڑوں سے بات کرو۔"

میں نے کہا۔ "ابھی تو تم کہہ رہے تھے میں جوان ہوں اور لوگ بھی یہ کہتے ہیں کہ تم جوانوں والی باتیں کرتے ہو۔ سنا ہے تم نے بھرے بازار میں رجنی سے کہا تھا۔ 'کتھے جا رہے او سوہنیو حسن دی خیر تے پاؤ' کہا تھا تم نے؟"

وہ سٹپٹا کر رہ گیا۔ غالباً اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ خود کو جوان بتائے یا بچہ۔ میری بات نے اسے سخت مشکل میں ڈال دیا تھا۔ اسے اس مصیبت سے نکالنے کے لیے میں نے سنتری کو آواز دی اور وہ اس کے چاچے کو اندر لے آیا۔

شوکی خاں اور نکے کو میں نے واپس تو بھیج دیا لیکن اُن کے پیچھے اپنے مخبر بلال شاہ کو بھی لگا دیا۔ میرا خیال تھا کہ شاید اس طرح کوئی کام کی بات معلوم ہو سکے۔ اگلے روز میں نے حافظ انیس سے ملاقات کی ٹھانی۔ اپنے اے ایس آئی کو بھیجا اور اسے کہا کہ اگر حافظ صاحب فارغ ہوں تو انہیں احترام کے ساتھ یہاں لے آئے۔ اے ایس آئی نے آدھ گھنٹے بعد واپس آ کر بتایا کہ حافظ صاحب عصر کے بعد آئیں گے۔

میں انتظار میں تھا۔ عصر کے فوراً بعد حافظ صاحب پہنچ گئے۔ ان کی عمر پینتیس چالیس کے درمیان تھی۔ سر پر چوگوشہ سفید ٹوپی، آنکھوں میں ہلکا سُرمہ، تھوڑے سے فربہ اندام اور خوش پوش شخص تھے۔ ان کے لہجے میں بے حد ملائمت اور روانی تھی۔

میں نے کہا۔ "حافظ صاحب! میں نے آپ کو بہت زحمت دی ہے۔ دراصل مجھے آپ سے پچھلے ہفتے ہونے والی واردات کے بارے میں بات کرنی ہے۔ آپ محلّے کے معزز فرد ہیں۔ میں چاہتا تھا کہ آپ اس معاملے پر کچھ روشنی ڈالیں۔"

اپنے سوال سے میں نے حافظ صاحب کو باور کرایا کہ میں کیس کے بارے میں ان کی رائے لینا چاہتا ہوں۔ وہ دھیمے لہجے میں بات کرنے لگے۔ انہوں نے کہا کہ وہ کام سے کام رکھنے والے بندے ہیں۔ مسجد اور مدرسے سے جو وقت بچتا ہے اس میں بمشکل ضروری حاجات پوری ہوتی ہیں۔ لہٰذا انہیں محلے کی سیاست کا کچھ زیادہ علم نہیں۔ بس یہ معلوم ہے کہ لوگ رجنی اور اس کے شوہر کو اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ ایک ہندو ساہو کار ان کی سائیڈ لیتا تھا اس لیے لوگ انہیں نکال بھی نہیں سکتے تھے...... بس دل مسوس کر رہ جاتے تھے۔"

حافظ صاحب نے اپنی باتوں سے یہ ظاہر کیا کہ اس معاملے میں ان کا کوئی خاص کردار

نہیں۔ عام لوگوں کی طرح وہ بھی دیوندر کو ناپسند کرتے تھے اور رجنی کے اندھے ہونے سے انہیں دکھ ہوا ہے اور نہ خوشی۔ مغرب سے کچھ دیر پہلے تک ہم مصروفِ گفتگو رہے۔ حافظ صاحب کے بولنے کا انداز دلنشیں تھا۔ بات سیدھی دل پر اثر کرتی تھی۔ وہ رخصت ہونے لگے تو میں نے ان سے بلال شاہ کی بیمار بیوی کے لیے ایک تعویذ لکھوالیا۔ حافظ جی کے متعلق مشہور تھا کہ ان کے لکھے ہوئے تعویذ کام کر جاتے ہیں۔

حافظ جی چلے گئے تو میں نے میز کی دراز سے وہ خطوط نکالے جو رجنی اور شائلہ کو لکھے گئے تھے۔ یہ خطوط ایک ہی ہاتھ کے لکھے ہوئے تھے۔ میں نے تعویذ کی تحریر کو ان خطوں کی تحریر سے ملایا۔ میرا شبہ غلط ثابت ہوا۔ خطوط اور تعویذ کی تحریر بالکل مختلف تھی۔ ابھی خطوط میرے ہاتھ میں ہی تھے کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف ایس پی صاحب خود تھے۔ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولے۔ "انسپکٹر نواز! فوراً سیکٹر دو میں پہنچو۔ راکیش پانڈے کی کوٹھی میں کوئی واردات ہوگئی ہے۔ غالباً مجرم ابھی کوٹھی میں ہی ہے۔"

ایسی ایمرجنسی کال پر عملے کو فوراً حرکت میں آنا پڑتا ہے۔ میں جیسے بیٹھا تھا ویسے ہی اُٹھ کر صحن کی طرف لپکا۔ مجھے عُجلت میں دیکھ کر دو کانسٹیبل اور ایک اے ایس آئی خود بخود میرے پیچھے آ گئے۔ ہم جیپ میں سوار ہو کر موقعۂ واردات کی طرف روانہ ہوئے۔ سیکٹر دو تھانے سے بمشکل چھ فرلانگ کے فاصلے پر تھا۔ ہم پانچ منٹ میں وہاں پہنچ گئے۔ یہ شام کے سات ساڑھے سات کا وقت تھا۔ راکیش پانڈے کی کوٹھی ڈھونڈنے میں مجھے بالکل دشواری نہیں ہوئی۔ وہ ایک مشہور شخصیت تھا۔ سماجی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا تھا۔ اس کے علاوہ سیاست میں بھی تھوڑا بہت پاؤں رکھتا تھا۔ اس کی تصویریں اکثر اخباروں میں چھپتی رہتی تھیں۔ پیشے کے لحاظ سے وہ تاجر تھا اور فروٹ مارکیٹ میں اس کا وسیع کاروبار تھا۔ ہماری جیپ راکیش کی دومنزلہ کوٹھی کے سامنے جا رکی۔ نیم پلیٹ پر صدر انجمن تاجرانِ مارکیٹ کے الفاظ تھے۔ کافی بڑی کوٹھی تھی۔ گیٹ پر چوکیدار کے علاوہ سات افراد کھڑے چہ مگوئیاں کر رہے تھے۔

ان لوگوں کی زبانی مجھے پتہ چلا کہ راکیش پانڈے شہر میں نہیں ہے۔ وہ ایک اسپتال کا افتتاح کرنے مراد آباد گیا ہوا تھا۔ گھر میں راکیش کے والد، اس کی بیوی نیلم اور چند نوکر تھے۔ میں کوٹھی میں داخل ہوا۔ موقعۂ واردات کوٹھی کی چھت تھی۔ ایک نوکرانی نے روتے ہوئے بتایا کہ سیڑھیوں کے بالائی دروازے پر کسی نے دستک دی تھی۔ مالکن دیکھنے کے لیے اوپر گئی۔ چھت پر سے کسی نے ان پر حملہ کیا اور زخمی کر کے بھاگ گیا۔ میں سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر

پہنچا۔ یہاں ایک برساتی نما کمرہ تھا۔ گھر کی مالکن پر اسی جگہ حملہ کیا گیا تھا۔ یہاں پہنچتے ہی میرا دماغ سنسنا اٹھا۔ میرے نتھنوں میں تیزاب کی تیز کسیلی بُو گھس رہی تھی۔ میں یہ بُو اس سے پہلے دو دفعہ سونگھ چکا تھا لہٰذا پہچاننے میں غلطی نہیں کرسکتا تھا۔

میں نے نوکرانی سے پوچھا۔ ''کیا ہوا ہے تمہاری مالکن کو؟''

وہ بولی۔ ''کچھ پتہ نہیں جی۔ عید محمد، شکورا اور ڈرائیور موہن انہیں گاڑی میں ڈال کر فوراً اسپتال لے گئے ہیں۔ ہم تو ٹھیک طرح دیکھ بھی نہیں سکے۔ ان کا سر پھٹا ہوا تھا اور چہرہ بھی لہولہان ہو رہا تھا۔ وہ ان چھوٹی سیڑھیوں سے گری ہیں جی...... بالکل بے ہوش پڑی تھیں۔''

نوکرانی بنتو نے برساتی نما کمرے کی سیڑھیوں کی طرف اشارہ کیا۔ برساتی کا فرش چھت سے چند فٹ اونچا تھا اور یہاں تین چار زینے بنے ہوئے تھے۔ راکیش کی بیوی یہیں سے گری تھی۔

میں حیران و پریشان کھڑا تھا...... آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا لیکن موقعے کی شہادتوں کو جھٹلانا بھی ممکن نہیں تھا...... راکیش کی بیوی پر تیزاب پھینکا گیا تھا۔ شدید زخمی ہونے کے بعد وہ بدحواسی میں بھاگی تھی اور برساتی کے زینوں سے گر کر بے ہوش ہوگئی تھی...... یعنی رجنی اور شمائلہ کے بعد ایک اور عورت پُراسرار واردات کا شکار ہو چکی تھی۔ بڑی پریشان کن صورتِ حال تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ گھر والوں کو ابھی تیزاب وغیرہ کے بارے میں کچھ پتہ نہیں۔ وہ یہی سمجھ رہے ہیں کہ کوئی نیلم پر حملہ کر کے بھاگ گیا ہے...... میری اطلاعات کے مطابق راکیش پانڈے کی عمر پینتالیس برس کے قریب تھی۔ اس نے کافی دیر سے شادی کی تھی اور اس کی بیوی اس سے قریباً بیس برس چھوٹی یعنی پچیس سال عمر کی تھی۔ وہ بے حد فیشن ایبل اور ماڈرن لڑکی تھی۔ میں نے اس کی ایک دو تصویریں اخباروں میں دیکھی تھیں۔ کافی خوبصورت تھی۔ اسے دیکھ کر کوئی بھی ٹھنڈی سانسیں بھر سکتا تھا اور راکیش کی قسمت پر رشک کر سکتا تھا۔

میں نے نوکرانی بنتو سے تمام واقعہ تفصیل سے پوچھا تو اس نے بتایا۔ ''میں اُدھر (دوسری منزل پر) باورچی خانے میں رات کا کھانا بنا رہی تھی۔ بی بی اپنے کمرے میں ریڈیو سن رہی تھیں۔ اتنے میں سیڑھیوں کے اوپر والے دروازے پر دستک ہوئی بی بی ریڈیو بند کر کے دیکھنے کے لیے گئیں۔ کافی دیر ان کی واپسی نہیں ہوئی تو مجھے پریشانی ہوئی۔ میں اوپر پہنچی تو سیڑھیوں کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور بی بی چھت پر بے ہوش پڑی تھیں۔ میں چیخنے چلانے لگی۔ بڑے مالک تو بیماری کی وجہ سے ہل جل نہیں سکتے۔ گھر کے نوکر بھاگے ہوئے اوپر آئے اور

سب نے مل جل کر بی بی جی کو اتارا۔''

مجھے بنتو کی باتوں پر شک سا ہو رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ''دروازے پر دستک ہوئی تو تم خود اوپر کیوں نہیں گئیں؟''

''میں...... میں جی ہانڈی پکا رہی تھی۔'' وہ گڑبڑا کر بولی۔

''دوسرے نوکر بھی تو تھے۔ ان میں سے کسی کو آواز دے لی ہوتی۔''

''بس جی...... جلدی میں...... وہ خود ہی چلی گئیں۔''

''تم کتنی دیر بعد چھت پر گئیں؟''

''کک...... کوئی پندرہ منٹ بعد۔'' بنتو نے جواب دیا۔

''یعنی پندرہ منٹ تک تمہیں بالکل خیال نہیں آیا کہ مالکن اوپر چھت پر گئی تھی اور ابھی تک واپس نہیں آئی۔''

''وہ جی...... دراصل پہلے بھی...... میرا مطلب ہے کہ......'' وہ گڑبڑا کر رہ گئی۔ مجھے دال میں کالا نظر آ رہا تھا۔ چھت سے بھی مجھے ایک ایسا ثبوت ملا تھا جو ایک خاص سمت میں اشارہ کر رہا تھا۔ یہ ثبوت ایک تازہ بجھے ہوئے سگریٹ کی صورت میں تھا۔ میں نے یہ سگریٹ نظر بچا کر جیب میں رکھ لیا تھا...... مجھے شک ہو رہا تھا کہ نیلم کسی خاص مقصد سے چھت پر گئی تھی۔ وہ نوجوان تھی، اس کا ادھیڑ عمر شوہر شہر سے باہر تھا۔ عین ممکن تھا کہ اس کی کسی سے شناسائی ہو اور وہ اس سے ملنے کے لیے آیا ہو۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ اکثر ملنے کے لیے آتا رہتا ہو۔ نوکرانی بتا رہی تھی کہ وہ پندرہ بیس منٹ بعد چھت پر گئی تھی۔ یعنی اس کے لیے یہ کوئی عجیب بات نہیں تھی کہ مالکن سخت سردی میں تاریک چھت پر پندرہ بیس منٹ تک اکیلی موجود رہے۔

ایس پی صاحب نے اندیشہ ظاہر کیا تھا کہ ممکن ہے مجرم ابھی تک کوٹھی میں ہی ہو۔ لہٰذا میں نے یہاں پہنچتے ہی عملے کو الرٹ کر دیا تھا اور انہوں نے راکیش کی کوٹھی کو تین اطراف سے گھیرے میں لے لیا تھا۔ بہرحال اب موقعے اور صورتِ حال کا جائزہ لینے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ ہمارے آنے سے پہلے ہی کھیل ختم ہو چکا ہے۔ نیلم پر تیزاب پھینکنے والا بھاگ چکا ہے اور وہ بھی بھاگ چکا ہے جو شب کی تاریکی میں اس سے ملنے آیا تھا۔

پھر ایک اور سوال میرے ذہن میں ابھرا۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ نیلم پر تیزاب پھینکنے والا وہی شخص ہو جو اس سے ملنے کے لیے آیا تھا اور جسے خوش آمدید کہنے کے لیے وہ بے وفا عورت خراماں خراماں اوپر پہنچ گئی تھی۔

میں جتنا سوچ رہا تھا، ذہن اتنا ہی الجھتا جا رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ایس پی صاحب خود بھی موقعے پر پہنچ گئے۔ وہ بے حد سنجیدہ نظر آتے تھے۔ اس سنجیدگی کی وجہ یہ تھی کہ وہ اسپتال سے ہوئے آئے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ مسز راکیش کا چہرہ مکمل طور پر جھلس گیا ہے۔ اگر اس بیچاری نے شیشہ دیکھنے کے بعد خودکشی نہ کر لی تو یہ بڑی ہمت کی بات ہو گی۔ میں اور ایس پی صاحب کافی دیر اس واردات پر تبصرہ کرتے رہے۔ یہ بہت سنگین واردات تھی۔ خاص طور پر اس وجہ سے کہ اس سے پہلے ایسی ہی دو وارداتیں ہو چکی تھیں۔ یقینی بات تھی کہ اب لوگوں میں خوف و ہراس پھیلے گا اور اس خوف و ہراس کی وجہ سے پولیس پر دباؤ بہت زیادہ بڑھ جائے گا......ایس پی صاحب چلے گئے تو میں بھی گواہوں کے بیان قلمبند کروا کے واپس تھانے آ گیا۔

تھانے میں بلال شاہ بیٹھا تھا۔ اس کے ماتھے پر چوٹ کا نشان تھا اور وہ غصے میں کھول رہا تھا۔ ''یا اللہ خیر'' اسے دیکھ کر میرے دل سے دعا نکلی۔ میں نے اسے یوسف خاں اور اس کے ''بدمعاش'' بھتیجے ننکے خاں کی نگرانی پر لگا رکھا تھا۔ معلوم نہیں وہ وہاں سے کیا خبر لے کر آ گیا تھا۔ میں نے پوچھا۔

''بلال! یہ ماتھے پر کیا ہوا؟''

''کھوتی کا سر ہوا ہے۔'' وہ بھنا کر بولا۔ ''آپ بھی مجھے چُن چُن کر کام دیتے ہیں۔ یہ بھی بھلا کوئی کام ہے۔ پالتو بھیڈو کی طرح لوگوں کے پیچھے پیچھے پھرو۔''

''بھئی ہوا کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''بس جی، اب وہ لڑکا میرے ہاتھوں سے نہیں بچے گا۔ اسے اغوا نہ کروا دوں تو میرا نام بلال شاہ نہیں۔ خبیث...... پتہ نہیں کس جن بھوت کی اولاد ہے وہ۔''

میں سمجھ گیا کہ بلال شاہ کا اشارہ ننکے خاں کی طرف ہے۔ میں نے پوچھا۔ ''کہیں اس ننکے خاں سے تو متھا نہیں لگ گیا تمہارا؟''

بلال شاہ فوراً بولا۔ ''میں نے متھا کہاں لگایا ہے اس بلا سے، وہ تو راہ چلتوں کے گریبان پکڑتا ہے۔''

کافی دیر جلی کٹی سنانے اور غصہ دکھانے کے بعد بلال شاہ نے کہا۔ ''آج صبح یوسف خاں مجھے اپنے ڈیرے پر نظر نہیں آیا۔ میں اس حرامی ننکے خاں سے پوچھ بیٹھا۔ وہ ایک ہم عمر لڑکے کے ساتھ کھیتوں کی طرف سے آ رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ''ننکے خاں تمہارا چاچا کہاں ہے؟'' جواب دینے کی بجائے وہ مجھے گھورنے لگا۔ پوچھنے لگا۔ ''تمہارے باپ کا نام کیا ہے

اور کس گاؤں سے آئے ہو؟'' میں نے ٹالنے کی کوشش کی تو وہ ایک دم بھڑک اٹھا۔ کہنے لگا۔ ''میں تمہیں پہچان گیا ہوں تم جہان پور کے چوہدری قلندر سنگھ کے بندے ہو۔ تم میرے چاچے کی سُو لینے یہاں آئے ہوئے ہو۔ تم سے ہماری بڑی پرانی دشمنی ہے۔ تم نے چک ڈھابا سنگھ کی لڑائی میں ہمارے تین بندے مارے تھے۔ ہم نے درشنی میلے میں تمہارے دو بندوں کا جھٹکا کیا تھا۔ ایک بندے کا فرق باقی ہے۔ آج میں یہ حساب برابر کر دوں گا۔'' اس کے بعد اس نے ایک پکی اینٹ اٹھا کر میرے ماتھے پر ماری اور بڑھکیں مارتا ہوا گاؤں کی طرف بھاگ گیا۔ شکر ہے مولا کا میں نے پگڑی باندھی ہوئی تھی ورنہ وہ اینٹ ضرور میرا مغز کھول دیتی۔''

بلال شاہ کی داستانِ غم واقعی ''دردناک'' تھی۔ اس میں قصور میرا ہی تھا۔ مجھے چاہیے تھا کہ اس افلاطون ننکے خاں کے بارے میں بلال شاہ کو پوری تفصیل بتا دیتا۔ بہرحال جو ہونا تھا وہ ہو گیا تھا۔ میں نے سنتری سے کہہ کر بلال شاہ کے ماتھے پر گرما گرم دودھ جلیبی کی ٹکور کروائی۔ دو تین تھیلیاں مصالحے دار نسوار کی منگوا کر دیں اور یوسف خاں سے باز پُرس کرنے کا وعدہ کیا۔ بلال شاہ کی طبیعت ذرا بحال ہوئی تو اس نے بتایا کہ یوسف خاں نو دس بجے گھر واپس آ گیا تھا۔ اس کے بعد وہ محلے میں ہی رہا ہے۔ اب بھی وہ پارسی چوک کے پاس اپنے اڈے پر موجود ہے۔ وہاں ایک آٹو ورکشاپ میں چوسر کی محفل جمی ہوئی ہے اور ٹھرّا وغیرہ پیا جا رہا ہے۔ بلال شاہ کا خیال تھا کہ شاید یہ اطلاع پاتے ہی میں یوسف خاں کے ڈیرے پر چڑھائی کر دوں گا اور آج دوپہر اس کے ماتھے پر جو ''روبڑا'' پڑا ہے اس کا بدلہ اُتر جائے گا لیکن میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ تیزاب والی وارداتوں سے یوسف خاں، ننکے خاں یا ان کے کسی ساتھی کا تعلق ثابت نہیں ہوتا تھا بلکہ بلال شاہ کے بیان سے بات اور واضح ہو گئی تھی۔ یوسف خاں اپنے بھتیجے سمیت دوپہر سے چوسر کی محفل میں بیٹھا ہوا تھا اور اس دوران سیکٹر دو میں ایک اور واردات ہو چکی تھی۔ یوسف خاں کی طرح حافظ انیس صاحب پر بھی شک برقرار رکھنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں ان کے مدرسے کے تقریباً تمام طلباء کو دیکھ چکا تھا۔ ان میں سے کوئی بھی ایسا ہوشیار چالاک نظر نہیں آتا تھا کہ پائپوں کے ذریعے کوٹھیوں میں داخل ہو سکے۔ روشن دانوں سے گزر سکے اور موقعۂ واردات سے ہوا کی طرح غائب ہو جائے۔ یہ اب مجھے کوئی اور ہی چکر دکھائی دے رہا تھا۔

بلال شاہ ابھی رخصت ہوا ہی تھا کہ سب انسپکٹر ریاض اسپتال سے آ گیا۔ میری ہدایت پر وہ نیلم کا بیان لینے گیا ہوا تھا۔ نیلم اب ہوش میں تھی۔ اس نے جو بیان دیا وہ تین صفحوں پر

مشتمل تھا۔ نیچے اس کے دستخط بھی موجود تھے۔ میں نے سارا بیان پڑھا لیکن کوئی خاص بات نظر نہیں آئی۔ نیلم نے بہت کچھ چھپانے کی کوشش کی تھی۔ مثلاً اس نے یہ نہیں بتایا کہ دستک کی آواز پر وہ خود چھت پر کیوں گئی تھی، جبکہ نوکر بھی موجود تھے۔ پھر وہ تاریک برساتی میں کیا لینے گھسی تھی۔ نیلم نے لکھوایا تھا کہ وہ تیزاب پھینکنے والے کا چہرہ نہیں دیکھ سکی۔ بس اچانک اسے ایک سایہ نظر آیا اور ایک سیال اچھل کر اس کے چہرے پر آ گرا۔ نیلم کا بیان پڑھنے کے بعد میں واقعات کی کڑیاں جوڑنے کی کوشش کرنے لگا۔ کمرہ بند تھا اور میں سگریٹ پر سگریٹ پھونک رہا تھا۔ یہ بات میرے دل میں جم چکی تھی کہ نیلم بے وفا عورت ہے اور وہ اپنے کسی شناسا سے ملنے گھر کی چھت پر گئی تھی۔ یقیناً اس سے پہلے بھی وہ چھت پر جاتی تھی اور تاریک برساتی میں کچھ وقت گزارتی تھی...... اگر تیزاب پھینکنے والا اُس کے شناسا کی بجائے کوئی اور شخص تھا تو پھر ایک اور بات بھی ممکن تھی...... ایک نیا خیال میرے ذہن میں آیا اور میں کرسی پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ عین ممکن تھا کہ تیزاب سے نیلم کا شناسا بھی زخمی ہوا ہو۔ ہو سکتا ہے اس پر صرف چھینٹے ہی پڑے ہوں لیکن کچھ نہ کچھ نقصان اس کا ضرور ہوا ہو گا...... اگر وہ زخمی ہوا تھا تو پھر کسی کلینک یا اسپتال میں بھی گیا ہو گا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ شہر کے تین بڑے اسپتالوں میں پتہ کروایا جائے کہ وہاں تیزاب سے زخمی ہونے والا کوئی شخص تو نہیں پہنچا۔ میں نے اسی وقت اے ایس آئی کو بلوایا اور اس سلسلے میں اسے ضروری ہدایات دے کر روانہ کر دیا۔

وہ رات سخت پریشانی کے عالم میں گزری۔ رات بارہ بجے کے قریب اے ایس آئی واپس آیا اور اس نے ناکامی کی اطلاع دی۔ میں نے ہمت نہیں ہاری اور اسے چند پرائیویٹ کلینک کے پتے دے کر روانہ کر دیا۔ اس دوران اخباروں کو بھی واردات کی بُو آ چکی تھی۔ وہ تھانے پہنچ گئے اور بیان حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ میں نے جان چھڑا کر انہیں ایس پی صاحب کی طرف بھیج دیا۔ صبح قریباً چار بجے جب میں پھر ''راکیش لاج'' جانے کی تیاری کر رہا تھا میرا اے ایس آئی پرائیویٹ اسپتالوں کا دورہ کر کے واپس آ گیا۔ اس کے چہرے پر کامیابی کا جوش دیکھ کر میرا دل بھی کھل اٹھا۔ اے ایس آئی نے پُرجوش لہجے میں بتایا کہ ایک نزدیکی کلینک میں مطلوبہ شخص کا سراغ مل گیا ہے۔ یہ پرائیویٹ کلینک ایک انگریز ڈاکٹر رابنسن کا تھا۔ یہاں کل شام سات اور آٹھ بجے کے درمیان راجو نامی ایک نوجوان کو داخل کرایا گیا تھا۔ اس کا ایک کندھا اور ہاتھ تیزاب گرنے سے زخمی ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ پیٹ اور رانوں پر چھینٹے پڑے تھے۔ نوجوان کو اس کے گھر والے اسپتال لائے تھے اور انہوں نے بتایا تھا کہ تیزاب حادثاتی طور پر گرا ہے۔

اے ایس آئی کی اطلاع بے حد اہم تھی۔ میں اسی وقت اس کے ساتھ برانچ روڈ پر واقع رابنسن ہاسپٹل میں پہنچ گیا۔ میں نے متعلقہ ڈاکٹر سے رابطہ قائم کیا اور مریض کا پتہ ٹھکانہ پوچھا۔ ڈاکٹر نے مریض کا جو اتہ پتہ بتایا وہ میرے لیے حیران کن تھا۔ راجندر عرف راجو نامی یہ نوجوان سیکٹر دو کا رہائشی تھا اور اس کا مکان راکیش پانڈے کے مکان سے صرف دو مکانوں کے فاصلے پر تھا۔ دوسرے لفظوں میں راجو، راکیش پانڈے کا ہمسایہ تھا۔ اب شک و شبے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ گئی تھی۔ میرا اندھیرے میں چلایا ہوا تیر عین نشانے پر لگا تھا۔ کل شام نیلم اپنے جس شناسا سے ملنے گھر کی چھت پر گئی تھی وہ راجو ہی تھا۔ اس کے پھینکے ہوئے سگریٹ کا ٹکڑا مجھے برساتی سے ملا تھا۔ اردگرد مکانوں کی چھتیں آپس میں ملی ہوئی تھیں۔ راجو یقیناً چھتیں پھلانگتا ہوا راکیش کے گھر تک پہنچا تھا اور اسی طرح واپس چلا گیا تھا۔ معلوم نہیں اس سے پہلے وہ کتنی مرتبہ اس طرح آ چکا تھا اور کتنی مرتبہ اس تاریک برساتی میں راکیش پانڈے کی عزت کو دھبہ لگایا گیا تھا۔ وہ سماجی کارکن بنا اسپتالوں کے افتتاح کرتا پھرتا تھا اور یہاں اس کی خوبرو بیوی اپنے عاشق کی مرادیں پوری کر رہی تھی۔ یقیناً نوکرانی بنتو اس کی ہمراز تھی اور سب کچھ جانتے بوجھتے بھی زبان بند رکھے ہوئے تھی۔ راجو وارڈ میں پڑا تھا۔ اس کے پاس اس کا والد بھی تھا۔ میں نے ان دونوں پر ظاہر ہونا مناسب نہیں سمجھا اور راجو سے ملے بغیر واپس آ گیا۔

راجو سے میری تفصیلی ملاقات اگلے روز اس کے گھر میں ہوئی۔ وہ اسپتال سے فارغ ہو آیا تھا اور اب گھر میں آرام کر رہا تھا۔ میں رات قریباً بارہ بجے ان کے گھر پہنچا۔ راجو کے والد نے دروازہ کھولا۔ وہ ایک سرکاری ٹھیکیدار تھا۔ بڑے بیٹے ملازمتیں کرتے تھے۔ راجو سب سے چھوٹا تھا اور چند ماہ میں اس کی شادی ہونے والی تھی...... راجو کے والد نے مجھے انسپکٹر کی حیثیت سے نہیں پہچانا، ویسے بھی میں سادہ لباس میں تھا۔ اس نے مجھے سر تا پا گھورتے ہوئے کہا۔

''کیا بات ہے پُتر جی؟''

میں نے کہا۔ ''مجھے راجو کے دفتر سے اس کے انچارج صاحب نے بھیجا ہے۔ حساب میں کچھ فرق آ رہا ہے...... راجو سے ملنا بہت ضروری ہے۔'' راجو بینک میں کام کرتا تھا۔ اس کے بینک سے ضروری معلومات میں پہلے ہی حاصل کر چکا تھا۔ راجو کا والد اندر چلا گیا اور تھوڑی ہی دیر بعد واپس آ کر مجھے اپنے ساتھ راجو کے پاس لے گیا۔ راجو کچی نیند سے بیدار ہوا تھا۔ اب آنکھوں میں سُرخی لیے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے راجو

سے حال احوال دریافت کیا۔

وہ بولا۔ ''آپ کو سیالوی صاحب نے بھیجا ہے؟'' لہجے میں حیرت تھی۔

میں نے کہا۔ ''اس میں اتنا حیران ہونے کی کیا بات ہے۔''

''میرا مطلب ہے میں نے پہلے آپ کو کہیں...... دیکھا نہیں۔''

راجو کا والد اب کمرے سے باہر جا چکا تھا۔ میں نے لہجہ بدلتے ہوئے کہا۔ ''ہاں...... تم ٹھیک سمجھ رہے ہو۔ میں تمہارے دفتر سے نہیں آیا۔''

''تو پھر؟''

''میں تھانے سے آیا ہوں۔ انسپکٹر نواز میرا نام ہے۔ مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ تمہارے گھر والوں کو میری آمد کا پتہ چلے، اس لیے یہ بہانہ کرنا پڑا۔''

ایک لمحے میں راجو کا رنگ زرد ہو گیا۔ وہ ڈری ہوئی نظروں سے میرا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ میں نے اٹھ کر دروازہ بھیڑ دیا اور دھیمے لہجے میں اس سے باتیں کرنے لگا۔ میں نے اسے بتا دیا کہ راکیش کی بیوی سے اس کا تعلق میرے لیے ڈھکا چھپا نہیں رہا۔ پرسوں رات راکیش لاج کی چھت پر جو واقعہ ہوا ہے وہ بھی میرے علم میں ہے۔ وہ میری باتیں سن سن کر خوف سے کانپتا رہا۔ اتنے میں ایک نوکر چائے لے کر آ گیا۔ نوکر کی آمد پر میں خاموش ہو گیا۔

چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے میں نے راجو سے کہا۔ ''دیکھو میاں! میں چاہتا ہوں تم مجھ سے تعاون کرو۔ اس میں تمہاری بھلائی ہے اور تمہاری بچت بھی۔ دوسری صورت میں بدنامی اور مصیبت کے سوا کچھ حاصل نہیں ہو گا۔''

دس پندرہ منٹ کی مغز ماری کے بعد میں راجو کو راہِ راست پر لے آیا۔ میرے سوالوں کے جواب میں اس نے مجھ سے رازداری کی درخواست کی اور پھر جو کچھ بتایا اس کا لبِ لباب یہ ہے۔ ''مسز راکیش یعنی نیلم سے راجو کے تعلقات آٹھ دس ماہ پرانے تھے۔ وہ اکثر رات کے اندھیرے میں اس سے ملنے جاتا رہتا تھا۔ نیلم ایک آزاد خیال جذباتی لڑکی تھی۔ وہ پانی کے ایک ایسے منہ زور دھارے کی طرح تھی جس پر پانڈے ریت کا بند باندھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ آزادانہ گھومتی پھرتی تھی اور ہر قسم کی محفلوں میں حصہ لیتی تھی۔ یہ کوئی پانچ ماہ پہلے کی بات ہے جب نیلم کو ایک گمنام خط ملا۔ اس خط میں نیلم کو دھمکی دی گئی تھی کہ اگر اس نے نت نئے فیشن کرنا اور اخباروں میں تصویریں چھپوانا نہ چھوڑا تو اسے بری طرح پچھتانا پڑے گا۔ نیلم نے اس خط کو کوئی اہمیت نہیں دی اور چند روز میں سب کچھ بھول بھال گئی لیکن اوپر تلے

اسے دو خط اور ملے۔ گمنام شخص نے وارننگ دی کہ اگر وہ اب بُرقعے کے بغیر گھر سے باہر نظر آئی تو آئندہ کسی کو صورت دکھانے کے قابل نہیں رہے گی۔ نیلم نے یہ خط راجو کو بھی دکھائے۔ راجو نے بات ہنسی ہنسی میں ٹال دی۔ نیلم خود بھی ان خطوں کو ''دل لگی'' سے زیادہ اہمیت نہیں دے رہی تھی...... اس کے بعد تین چار ماہ تک کوئی ایسا واقعہ رُونما نہیں ہوا جو نیلم یا راجو کو ان خطوں کی یاد دلاتا۔ یہاں تک کہ پرسوں رات جب نیلم اور راجو برساتی کی تاریکی میں کھڑے تھے اچانک ایک سایہ نمودار ہوا اور نیلم کے چہرے پر تیزاب پھینک کر نکل بھاگا......''

یہاں تک تو راجو کی روئیداد میں نے اطمینان سے سنی لیکن اس کے بعد اس نے جو کچھ بتایا وہ کسی بھی شخص کو بے قرار کر سکتا تھا۔ میں فوری طور پر فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ راجو کی بات پر اعتبار کروں یا نہیں۔ وہ ایک پڑھا لکھا شہری بندہ تھا۔ اپنے پورے ہوش و حواس میں بھی تھا لیکن اُس کی بات بڑی عجیب و غریب تھی۔ اس نے بتایا کہ اس نے تیزاب پھینکنے والے کا ہیولا دیکھا تھا اور چند قدم بھاگ کر اس کے پیچھے بھی گیا تھا۔ اس کا قد ایک دس گیارہ سالہ بچے کے برابر تھا لیکن اس میں انتہا درجے کی پھرتی تھی۔ وہ چھت کی چار انچ چوڑی منڈیر پر یوں بھاگ رہا تھا جیسے سڑک پر بھاگ رہا ہو۔ وہاں سے اُس نے ایک اور جست بھری اور ایک چھجے سے لٹک کر ایک تاریک کھڑکی میں گم ہو گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد راجو نے اُسے ایک پائپ کے ذریعے بندر کی سی پھرتی سے گلی میں اُترتے اور ایک موڑ پر اوجھل ہوتے دیکھا......

راجو نے بتایا کہ وہ اپنی چال ڈھال سے کوئی بونا لگتا تھا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی سرکس کا بونا ہو کیونکہ اس کی پھرتی حیران کن بلکہ نا قابلِ یقین تھی۔

یہ بیان دیتے ہوئے راجو کے چہرے پر حیرانی اور آنکھوں میں خوف سا تھا۔ وہ ایک پڑھا لکھا شخص تھا ورنہ ہو سکتا ہے اس سارے واقعے کو کوئی پُر اسرار رنگ دے دیتا۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ راجو جھوٹ نہیں بول رہا۔ وہ وہی کچھ بتا رہا ہے جو اس نے دیکھا ہے۔ اس کی باتوں میں وزن تھا۔ مجھے حیرانی ہو رہی تھی کہ ہم میں سے کسی کا دھیان پہلے اس طرف کیوں نہیں گیا۔ چھوٹے پاؤں کا نشان کسی بچے کے علاوہ ٹھگنے کا بھی ہو سکتا تھا...... اگر راجو کی بات کو من وعن تسلیم کر لیا جاتا تو اس کا مطلب تھا کہ چھوٹے قد کا ایک نہایت خطرناک نیم پاگل قسم کا شخص شہر میں موجود ہے اور من مانی کارروائیاں کر رہا ہے۔

اگلے روز وہی ہوا جس کا ہمیں ڈر تھا۔ وہ بات جو افواہ کی صورت سیکٹر دو میں گشت کر رہی تھی پورے شہر میں مشہور ہو گئی۔ رہی سہی کسر ایک مقامی اخبار کے نمائندے نے پوری کر

دی۔ اس نے تینوں وارداتوں کو جوڑ کر اور مرچ مصالحہ لگا کر ایک خوفناک خبر بنا دی۔ سُرخی تھی ”خبردار ایک خونی گشت پر ہے“ تفصیل میں تینوں وارداتوں کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ مختلف لوگوں کے بیانات درج تھے۔ ان میں ایک بیان خاصا اہم تھا اور میرے خیال میں یہ بیان درست بھی تھا۔ یہ بیان سیکٹر دو کی ایک رہائشی مسماۃ امینہ بیگم کا تھا۔ امینہ بیگم کا مکان راکیش پانڈے کے حویلی نما مکان سے قریباً سو گز کے فاصلے پر تھا۔ اس نے کہا تھا کہ واردات کی شام سات بجے کے قریب وہ گھر کی چھت سے سوکھے ہوئے کپڑے اتارنے کے لیے گئی۔ اچانک اس کی نظر سامنے سکول کی عمارت پر پڑی۔ ایک چھوٹے قد کا عجیب سا شخص بھاگتا ہوا آیا اور بندر کی طرح چھلانگ لگا کر گندے پانی کے پائپ سے چمٹ گیا۔ پھر وہ اتنی تیزی سے نیچے اُترا کہ وہ حیران رہ گئی۔ اس نے چیخ کر اپنے بیٹے کو آواز دی اور بھاگ کر منڈیر پر پہنچی لیکن اتنی دیر میں وہ چھلاوہ غائب ہو چکا تھا۔ امینہ بیگم کا کہنا تھا کہ ٹھگنے کو دیکھتے ہی اسے یقین ہو گیا تھا کہ یہ راکیش پانڈے صاحب کی حویلی کی طرف سے آیا ہے۔ اگلی صبح پتہ چلا کہ کسی نے پانڈے صاحب کی گھر والی پر تیزاب پھینک دیا ہے۔ امینہ بیگم نے اپنے بیٹوں سے کہا کہ ہو نہ ہو یہ اُسی ٹھگنے کا کام ہے لیکن بیٹوں نے ماں کی بات کو مذاق میں ٹالا اور اسے خاموش رہنے کی ہدایت کی۔

دو ہی دن میں رام پور کے ہر رہائشی کی زبان پر تیزاب پھینکنے والے ٹھگنے کا چرچا ہو گیا۔ میرے تھانے کے علاقے میں خاص طور پر بہت ہراس پایا جاتا تھا۔ وجہ ظاہر تھی کہ تینوں وارداتیں میرے ہی علاقے میں ہوئی تھیں۔ عجیب و غریب افواہیں سننے میں آ رہی تھیں۔ کسی نے کہا یہ ایک بونا نہیں بلکہ بونوں کا گروہ ہے۔ کسی نے اسے حبشی قرار دیا اور کہا کہ اُس کے چہرے پر دو سرخ انگارہ آنکھیں ہیں اور وہ جانوروں کی طرح غرّاتا ہے۔ ایک مرحوم ایس ڈی کی بیوہ نے حلفیہ بیان دیا کہ اس نے بالوں سے بھرے ہوئے جسم والے ایک چار فٹے کو دیکھا ہے جو ان کے صحن کے نلکے پر منہ دھو رہا تھا۔ اس نے چیخ ماری تو وہ جانوروں کی طرح غرایا اور اچانک دیوار پھلانگ کر غائب ہو گیا۔ کچھ کمزور عقیدے کے لوگ اس معاملے کو بالکل مختلف طور پر لے رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ کسی بندے بشر کا کام نہیں ہے۔ کوئی ہوائی شے ہے جو بگڑی تگڑی عورتوں کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئی ہے۔

ان افواہوں کا اثر جو عام لوگوں پر ہو سکتا تھا وہ ہر کوئی تصور کر سکتا ہے۔ دو ہی دنوں میں گلیاں اور بازار ویران نظر آنے لگے۔ لوگوں نے نو عمر بچیوں کو سکول بھیجنا چھوڑ دیا۔ اگر کہیں کوئی عورت نظر بھی آتی تھی تو وہ برقع پوش ہوتی۔ یہ صورتِ حال اصولی طور پر تو اچھی تھی لیکن

قانونی طور پر ہم اسے اچھا نہیں کہہ سکتے تھے۔ ایک شخص نے قانون ہاتھ میں لیا تھا اور ابھی تک آزاد پھر رہا تھا۔ کسی بھی وقت وہ کوئی اور واردات کر سکتا تھا۔ ہم نے پورے زور و شور سے تفتیش شروع کر دی۔ اس تفتیش کے دوران قریبی قصبے شجاع پور سے بھی ایک ملتے جلتے واقعے کی اطلاع ملی۔ یہ واقعہ کوئی چار ماہ پہلے ہوا تھا۔ کوئی شخص رات کو ایک نو بیاہتا جوڑے کے گھر میں داخل ہوا۔ لوہے کی خم دار تار ڈال کر برآمدے کا دروازہ کھولنے کی کوشش کرتا رہا۔ اس دوران اہلِ خانہ جاگ گئے اور وہ ڈر کر بھاگ گیا۔ بند دروازے کے پاس سے کھلے منہ کی ایک بوتل ملی یہ تیزاب سے بھری ہوئی تھی۔ اہلِ خانہ کا یہ بھی کہنا تھا کہ دیوار پھلانگ کر بھاگنے والا شخص مختصر قد کا تھا۔ بہر حال اس واقعے میں خطوط کی کوئی شہادت نہیں ملی۔

میں نے تفتیش کا کام کئی سمتوں میں آگے بڑھایا۔ شہر میں صرف دو ہی ایسی دکانیں تھیں جہاں سے تیزاب مل سکتا تھا۔ ان دکانوں کے مالکوں کو شاملِ تفتیش کیا گیا۔ اس کے علاوہ شہر میں موجود ٹھگنے افراد کا سراغ لگانے کی کوششیں شروع کر دی گئیں۔ اس سلسلے میں ہر محلے کے اندر موجود مقامی مخبروں نے خاصا تعاون کیا۔ آٹھ دس روز یہ تفتیش زور و شور سے جاری رہی اور اس کے ساتھ ساتھ افواہوں کا بازار بھی گرم رہا لیکن ابھی تک افواہوں کا کوئی نتیجہ نکلا تھا اور نہ ہماری تفتیش کا۔

ایک روز دوپہر کے وقت میں تھانے میں موجود تھا کہ ایک کار دروازے پر رکی۔ ایک بنا سنورا دراز قد شخص کار میں سے نکلا اور لمبے ڈگ بھرتا میرے پاس آ گیا۔ اس کے ساتھ شمالی علاقے کا ایک حوالدار بھی تھا۔ حوالدار نے دراز قد شخص کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ”ان کا نام اسمٰعیل ہے۔ یہ اینگلو انڈین سکول کے پرنسپل ہیں۔ ایس ایچ او شنکر وال صاحب نے انہیں آپ کی طرف بھیجا ہے۔“

سلام دعا کے بعد اسمٰعیل صاحب نے کرسی سنبھال لی۔ ان کی عمر پینتیس کے قریب تھی لیکن اچھی صحت کی وجہ سے تیس کے نظر آتے تھے۔ انہوں نے بڑے مہذب لہجے میں گفتگو کا آغاز کیا لیکن پھر آہستہ آہستہ ان کا لب و لہجہ سخت ہوتا چلا گیا۔ انہوں نے کہا۔ ”انسپکٹر صاحب! یہ تو سراسر زیادتی ہے کہ ایک جرائم پیشہ شخص دوسروں پر اپنی مرضی ٹھونستا پھرے اور اسے پوچھنے والا کوئی نہ ہو۔ ہم سب آزاد ہیں، اپنے طور پر رہنے سہنے کا ہمیں پورا حق ہے۔ کسی کو یہ اختیار نہیں کہ پُر امن شہریوں کو خوف و ہراس میں مبتلا کرے اور اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو آپ کی ذمے داری ہے کہ اس کی گردن ناپیں۔“ غصے سے کپکپاتے ہوئے پرنسپل صاحب نے اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور دو لفافے میرے سامنے ڈال دیئے۔ لفافے دیکھ کر

میری آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ یہ وہی دھمکی آمیز خطوط تھے جو اس سے پہلے تین عورتوں کے لیے بربادی کا پیغام بن چکے تھے۔

میں نے ایک لفافہ کھولا، جانی پہچانی تحریر آنکھوں کے سامنے آئی۔ لکھا تھا۔ ''محترمہ کلثوم صاحبہ! تم مجھے شکل سے سمجھ دار نظر آتی ہو۔ اس لیے امید کرتا ہوں کہ میری ہدایت پر عمل کرو گی اور خود کو کسی بڑی مصیبت سے بچا لو گی۔ میں کون ہوں اور کس لیے یہ لکھ رہا ہوں اس بات کو دل سے نکال دو بس جو میں لکھ رہا ہوں اُس پر غور کرو۔ یاد رکھو عورت کی اچھی صورت دیکھ کر مرد کے دل میں شیطان سر اٹھاتا ہے۔ تم بھی اچھی صورت کی مالک ہو۔ اس لیے تمہیں پردے کی ضرورت عام عورتوں سے زیادہ ہے...... میں آئندہ تمہیں چست لباس میں اور ننگے سر نہ دیکھوں ورنہ بہت بری طرح پیش آؤں گا۔ میرے خیال میں تمہیں پتہ ہی ہوگا کہ میں نہ ماننے والیوں کا کیا حشر کرتا ہوں اور جو پولیس میں جانے کی کوشش کرتا ہے اس کا حشر اور بھی خراب ہوتا ہے۔'' فقط تمہارا خیر خواہ ب ب۔

دوسرا خط صرف دو روز پہلے کا تھا۔ اس کا مضمون بھی قریباً یہی تھا لیکن الفاظ پہلے سے سخت تھے۔ میں دونوں خط پڑھ چکا تو اسمٰعیل صاحب جلتی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگے۔ بولے۔ ''یہ خط میری بیوی کو لکھے گئے ہیں۔ وہ ٹیچر ہے اور آریا گرلز کالج میں پڑھاتی ہے۔ آپ سوچیں اگر خدانخواستہ یہ خط آپ کے گھر لکھے جاتے تو آپ کیا کرتے۔ خدا کی قسم، پچھلے ایک ہفتے سے ہم انگاروں پر لوٹ رہے ہیں۔ ہر گھڑی سر پر تلوار لٹک رہی ہے۔ میری بیوی ایک پڑھی لکھی خاتون ہے۔ باہمت اور محنتی ہے۔ اس نے میرا آدھے سے زیادہ بوجھ بانٹ رکھا ہے۔ میں صبح آفس جاتا ہوں تو ٹیوشنز وغیرہ سے فارغ ہو کر رات نو بجے لوٹتا ہوں۔ اس دوران نہ صرف وہ خود ڈیوٹی پر جاتی ہے بلکہ گاڑی پر بچوں کو سکول سے لاتی ہے۔ سودا سلف خریدتی ہے اور دیگر کام نبٹاتی ہے۔ اب پورے سات روز سے ہم میاں بیوی گھر میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ بچے تک سکول نہیں جا رہے۔ آخر کون سا جرم کیا ہے ہم نے جس کی یہ کڑی سزا مل رہی ہے۔ میں تو استعفیٰ دینے کا سوچ رہا ہوں۔ اگر چند روز تک اس مسئلے کا کوئی حل نہ نکلا تو میں تو چلا جاؤں گا یہاں سے۔ کسی اور شہر چلے جائیں گے، کیوں اپنی اور بچوں کی سلامتی خطرے میں ڈالیں۔''

پرنسپل صاحب سخت غصے میں تھے ان کی جگہ کوئی بھی معقول شخص ہوتا اس کی یہی حالت ہوتی۔ بدنامی اور جگ ہنسائی کے ڈر سے میاں بیوی اب تک خاموش رہے تھے لیکن دوسرا خط ملنے کے بعد بات ان کی برداشت سے باہر ہو گئی تھی۔ بہرحال اُن کی جرأت مندی قابلِ

تعریف تھی۔ اگر کوئی ڈرپوک فیملی ہوتی تو اب تک شہر چھوڑ گئی ہوتی۔ میں نے پرنسپل صاحب کی ہمت کی داد دیتے ہوئے کہا۔

''اسمٰعیل صاحب! میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں۔ ان خطوط کے بارے بتا کر آپ نے بہت تعاون کیا ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ بہت جلد مجرم قانون کے شکنجے میں ہوگا لیکن اس سلسلے میں مجھے آپ کا تھوڑا سا تعاون اور درکار ہے۔ مجھے یقین ہے جہاں آپ نے اتنی جرأت کی ہے، وہاں تھوڑی سی جرأت اور کریں گے۔''

پرنسپل صاحب نے کانپتے ہاتھوں سے سگریٹ سلگایا اور سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگے۔ میں نے کہا۔ ''آپ مسلمان ہیں، الحمدللہ میں بھی مسلمان ہوں۔ غیب کا علم تو خدا کے پاس ہے لیکن بندہ ارادے سے جو کام کرے وہ پورا ہوتا ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ پر یا بیگم صاحبہ پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ آپ اپنے روز مرّہ کے کام اسی طرح کرتے رہیں جیسے پہلے ہوتے تھے...... میرا خیال ہے آپ میری بات سمجھ رہے ہیں؟''

وہ سگریٹ کے دو گہرے کش لینے کے بعد بولے۔ ''انسپکٹر صاحب! اگر میری ذات کا معاملہ ہوتو میں قربانی دے سکتا ہوں لیکن اپنی بیوی کے لیے اور اپنے بچوں کی ماں کے لیے میں کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ اگر میری جگہ آپ ہوتے تو میرے خیال میں آپ کا جواب بھی یہی ہوتا۔'' میں نے گہری نظروں سے پرنسپل کی طرف دیکھا۔ وہ بھلے مانس آدمی نظر آتے تھے۔ میری گزارش کے جواب میں وہ یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ میں ان کی بیگم کو چارے کے طور پر استعمال کرنا چاہ رہا ہوں لیکن انہوں نے محتاط لفظوں میں جواب دیا تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ اگر پرنسپل صاحب کے ساتھ ڈھنگ سے بات کی جائے تو وہ ایک قانون پسند شہری کی حیثیت سے یہ معمولی رسک لینے پر تیار ہو جائیں گے۔

میں نے کہا۔ ''اسمٰعیل صاحب، کیوں نہ ہم اس سلسلے میں تھانے سے باہر بیٹھ کر بات کریں۔ میرا مطلب ہے ہوٹل میں چلتے ہیں یا پھر آپ مناسب سمجھیں تو گھر میں بیگم صاحبہ کی موجودگی میں بات کر لیتے ہیں۔ اس سے ان کا خوف بھی کچھ کم ہوگا۔''

اسمٰعیل صاحب نے معمولی تذبذب کے بعد میری یہ بات مان لی۔ اُن کی گاڑی میں ہم ان کی رہائش گاہ کی طرف روانہ ہو گئے۔

میں اسمٰعیل اور بیگم کلثوم اسمٰعیل کو قائل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ پڑھا لکھا سمجھ دار جوڑا تھا۔ ظاہر ہے انہوں نے تھانے میں اطلاع ہی اس لیے دی تھی کہ وہ مجرم کو پکڑوانا چاہتے تھے۔ چوبیس گھنٹے کے اندر اندر سارا پروگرام طے کر لیا گیا۔ پہلی وارداتوں سے یہ

ثابت ہوتا تھا کہ مجرم حملہ کرنے کے لیے گھر میں گھستا ہے اور گھر سے باہر وہ اپنے شکار کو بالکل نظر انداز کیے رکھتا ہے۔ لہٰذا طے ہوا کہ پولیس کا ایک مسلح آدمی سادہ لباس میں چوبیس گھنٹے اسمٰعیل صاحب کے گھر پر موجود رہے گا۔ خاص طور پر رات کو ''صبح تک'' وہ پوری چوکسی سے ڈیوٹی دے گا۔ اصولی طور پر مجھے یہ ڈیوٹی اپنے اے ایس آئی یا سب انسپکٹر کو سونپنی چاہیے تھی لیکن میں اس معاملے میں کوئی رسک لینا نہیں چاہتا ہوں۔ اخلاق کا تقاضا تھا کہ اسمٰعیل صاحب اور ان کی بیگم نے مجھ پر اعتماد کیا ہے اس کو ذرا بھی ٹھیس نہ لگے۔ لہٰذا میں نے یہ ڈیوٹی خود دینے کا فیصلہ کیا۔

ایک شام میں ایک بند اسٹیشن ویگن میں اس خاموشی سے پرنسپل صاحب کے گھر داخل ہوا کہ ان کے ملازموں کو بھی خبر نہ ہو پائی۔ میرے لیے جو کمرہ مخصوص کیا گیا تھا وہ خواب گاہ کے پہلو میں تھا۔ یہاں سے میں خوابگاہ کی پوری طرح نگرانی کر سکتا تھا اور درمیانی دروازے کے ذریعے ایک لمحے میں خوابگاہ کے اندر داخل ہو سکتا تھا۔

گھر کا انتظام تو ہو چکا تھا لیکن گھر سے باہر بھی مجرم کی کسی کارروائی کو یکسر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لہٰذا عارضی طور پر ایک گھریلو ملازم کو چھٹی دے دی گئی اور اس کی جگہ دوسرا ملازم رکھ لیا گیا۔ یہ ایک ہوشیار کانسٹیبل تھا لیکن دیکھنے میں سیدھا سادہ دیہاتی نظر آتا تھا۔ اس کے ذمے یہ کام تھا کہ جب بیگم صاحبہ گاڑی لے کر نکلیں وہ پچھلے سیٹ پر بچوں کو سنبھال کر بیٹھا رہے۔ اپنے اس رول کے لیے ہیڈ کانسٹیبل نذیر بے حد موزوں تھا۔ یہ انتظام ہو چکے تو اسمٰعیل اور مسز اسمٰعیل نے اپنے روزمرّہ کے کام پھر شروع کر دیے۔ مسز کلثوم اسمٰعیل صبح سویرے بچوں اور شوہر کے ساتھ تیار ہو کر نکل جاتی۔ سب سے پہلے وہ لوگ دونوں بچوں کو سکول میں ڈراپ کرتے۔ پھر مسز اسمٰعیل شوہر کو دفتر پہنچاتی اور گاڑی کالج لے جاتی۔ چھوٹا بچہ بھی اس کے ساتھ ہوتا تھا۔ مسز اسمٰعیل اپنے پیریڈ لینے چلی جاتی تو نوکر بچے کو لے کر اِدھر اُدھر گھومتا رہتا یا گاڑی میں بیٹھ جاتا۔ صرف دو گھنٹے میں مسز اسمٰعیل فارغ ہو جاتی۔ روزمرہ کی شاپنگ وغیرہ کرتی ان دوران بچوں کو چھٹی ہو جاتی اور وہ انہیں لے کر گھر واپس آ جاتی۔ میں مچان میں بیٹھے شکاری کی طرح مسلسل گھات میں تھا۔ چوبیس گھنٹے ایک کمرے میں بند رہنا کوئی آسان کام نہیں تھا لیکن یہ معاملہ اتنا اہم ہو چکا تھا کہ ''جان ماری'' کے سوا اب ہمارے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔ ایس پی صاحب کا تو خیال تھا کہ اگر ایک مہینہ بھی اس طرح گھات لگانی پڑے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ میں اس کمرے میں اتنی رازداری سے رہ رہا تھا کہ دونوں بڑے بچوں اور گھر کی ملازمہ کو بھی میری موجودگی کا پتہ نہیں تھا۔ (بعد میں ملازمہ کو تو

پتہ چل گیا لیکن بچے آخر تک بے خبر رہے) میں بھرا ہوا ریوالور اپنے پاس رکھ کر رسالہ وغیرہ پڑھتا یا ریڈیو سنتا رہتا۔ شام ہوتے ہی مجھے پوری طرح چوکس ہونا پڑتا۔ ساری رات آنکھوں میں گزرتی۔ ہر لمحے یہ گمان ہوتا کہ وہ چھلاوہ کہیں سے آ دھمکے گا۔ کسی تاریک کونے سے نکلے گا اور اس مکان کے اندر چکرانے لگے گا۔ اس مکان سے باہر بھی کوتاہ قد مجرم کی تلاش پوری سرگرمی سے جاری تھی۔ چار پانچ روز گزر گئے نہ تو مسز اسمٰعیل کو کوئی خط ملا اور نہ مجرم نے کسی کارروائی کی کوشش کی۔ مجھے شبہ ہونے لگا کہ وہ ہوشیار ہو گیا ہے۔ ایسے وارداتیے جب ہوشیار ہو جائیں تو پھر کئی کئی ماہ کے لیے بالکل خاموش ہو جاتے ہیں۔ شاید رام پور کا ٹھگنا مجرم بھی ایسی ہی خاموشی اختیار کر چکا تھا لیکن میرا یہ اندازہ غلط ثابت ہوا۔ اسی روز رات کو مجرم نے پھر دھماکہ کیا۔ یہ دھماکہ اس کے پہلے تینوں ''دھماکوں'' سے زیادہ شدید اور خوفناک تھا۔ اس واقعے کی اطلاع مجھے رات قریباً دو بجے ملی۔ میں اسمٰعیل صاحب کی کوٹھی میں موجود تھا۔ کوٹھی کے کسی حصے میں فون کی گھنٹی بجی۔ اسمٰعیل صاحب نے اٹھ کر فون سنا پھر میرے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا اور سرگوشی میں اطلاع دی کہ میرا فون ہے۔ ایس پی صاحب بول رہے ہیں۔ گھر میں سب لوگ سوئے ہوئے تھے لہٰذا کمرے سے نکل کر فون سننے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ میں نے فون سنا۔ دوسری طرف ایس پی کی لرزتی کانپتی آواز سنائی دی۔

''نواز خان! جلدی سے عطا صاحب کی کوٹھی پہنچو۔ یہاں قتل ہو گیا ہے۔''

''کون؟'' بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

''عطا صاحب کی چھوٹی بیٹی روزینہ۔ میں ان کے گھر ہی سے بول رہا ہوں۔ تم عملے کو لے کر فوراً پہنچ جاؤ...... یہ وہی تیزاب والی واردات ہے۔ جلدی کرو میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔''

میرا دماغ چکرا کر رہ گیا۔ عطا صاحب وہی ریلوے آفیسر تھے جن کی بیٹی شائلہ چند ہی دن پہلے شدید زخمی ہو کر اسپتال پہنچی تھی۔ یہ واردات مکان کی گیلری میں ہوئی تھی اور یہیں سے مجھے پہلی مرتبہ مجرم کا کھرا ملا تھا۔ اس وقت مجرم گندے پانی کے پائپ کے ذریعے اوپر چڑھا تھا۔ کھلے دروازے سے اندر پہنچا تھا اور چھوٹے بھائی کے قریب کھڑی ہوئی لڑکی پر تیزاب پھینک کر نکل گیا تھا۔ اب ایس پی صاحب اسی گھر میں ایک اور واردات کی اطلاع دے رہے تھے۔

میں نے فوراً ہیڈ کانسٹیبل نذیر کو بلایا۔ اسے پوری طرح ہوشیار رہنے کی ہدایت کی اور اسمٰعیل صاحب کی گاڑی لے کر عطا محمد صاحب کے گھر واقع رنگ کالونی پہنچ گیا۔ یہاں گھر

کے سامنے اہلِ محلہ کا بے پناہ ہجوم تھا۔ پولیس کی دو تین گاڑیاں کھڑی تھیں اور مکان کے اندر سے بلند ہونے والی اہلِ خانہ کی چیخیں دور دور تک گونج رہی تھیں۔ میں ہجوم میں سے راستہ بناتے ہوئے آگے بڑھا تو عطا صاحب نظر آئے وہ گھر کی سیڑھیوں کے پاس بے ہوش پڑے تھے اور کئی افراد انہیں ہوش میں لانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اندر برآمدے میں شمائلہ کا نوجوان بھائی رضوان دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا اور لوگوں کے ہاتھوں سے نکل نکل جا رہا تھا۔ ایک قیامتِ صغریٰ کا منظر تھا۔ یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ چند ہی دنوں میں اس گھر پر دوسری مرتبہ صدمے کا پہاڑ ٹوٹا تھا۔ پہلے بڑی بہن شدید زخمی ہو کر اسپتال پہنچی اور والدین کے لیے شرمندگی کا باعث بنی اب چھوٹی بہن جان سے ہاتھ دھو بیٹھی تھی۔ لوگوں کے درمیان سے راستہ بناتا میں موقعۂ واردات پر پہنچا۔ یہ اندوہناک واقعہ مکان کی دوسری منزل پر پیش آیا تھا۔ پھول دار ٹائلوں کے فرش پر ایک نوعمر لڑکی کروٹ کے بل پڑی تھی۔ اس نے پیلی دھاریوں والی قمیص پہن رکھی تھی۔ یہ قمیص جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی تھی۔ سر کے بال منتشر تھے اور خون میں لتھڑے ہوئے تھے۔ لڑکی کے جسم پر ایک سفید چادر ڈال دی گئی تھی۔ یہ چادر بھی جگہ جگہ خون سے سرخ تھی۔ لڑکی کا چہرہ دیکھنے سے فوراً اندازہ ہو جاتا تھا کہ اس پر تیزاب پھینکا گیا ہے۔ لڑکی کی عمر اٹھارہ برس کے قریب تھی۔ بال بڑی نفاست سے ترشے ہوئے تھے۔ وہ دیکھنے میں ہی ایک کالج گرل لگتی تھی۔ موقعے پر موجود ایک رشتے دار سے معلوم ہوا کہ روزینہ دہلی کے ایک کالج میں پڑھتی تھی اور وہیں ہوسٹل میں رہتی تھی۔ بڑی بہن کے زخمی ہونے کا سن کر وہ رام پور آئی تھی اور پچھلے ایک مہینے سے یہیں تھی۔ انسپکٹر شنکر بھی موقعے پر موجود تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ پاس چلا آیا۔ اس نے بتایا کہ مقتولہ کے عین دل میں چھرا گھونپا گیا ہے، جو اس کی فوری موت کا سبب بنا ہے۔ موقعۂ واردات کا سرسری معائنہ کرنے سے یہی لگتا تھا کہ واردات کے وقت مقتولہ جاگ رہی تھی۔ چہرے پر تیزاب گرنے کے بعد اس نے جرأت کا مظاہرہ کیا اور مجرم کو پکڑنے کی کوشش کی۔ اس کش مکش میں اس کے کپڑے بھی پھٹے۔ جب مجرم نے دیکھا کہ وہ اس سے جان نہیں چھڑا پائے گا تو اس نے مقتولہ کو چھرا گھونپ دیا......

کمرے میں داخل ہوتے ہی جو سب سے پہلی چیز میں نے نوٹ کی وہ مقتولہ روزینہ کے چہرے پر ایک سرخ لکیر تھی۔ یہ موٹی سی لکیر اس کی باچھوں سے شروع ہو کر کان تک چلی گئی تھی۔ غالباً ایسی ہی لکیر اس کے دوسرے رخسار پر بھی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کا چہرہ سیدھا کیا اور میرا اندازہ درست نکلا۔ یہ مدھم لکیر موجود تھی۔ لڑکی کا ایک ہاتھ چادر سے باہر تھا۔ گوری گوری نازک کلائی پر ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کی خراشیں تھیں اس کے علاوہ وہی سرخ لکیر

تھی جو دونوں رخساروں پر دکھائی دیتی تھی۔ میں نے غور سے دیکھا۔ شبے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ یہ لکیر کسی رسی یا آزار بند کی مضبوط بندش کی وجہ سے آئی تھی۔

میں نے انسپکٹر شنکر کی طرف دیکھا۔ وہ میری ہی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں معنی خیز چمک تھی۔ یعنی وہ بھی اس سرخ لکیر کے متعلق جان چکا تھا...... میرا ذہن سنسنا کر رہ گیا۔ اس کا مطلب تھا صورتِ حال وہ نہیں ہے جو نظر آ رہی ہے۔ لڑکی پر باقاعدہ تشدد کرنے کے بعد اسے موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے۔ انسپکٹر شنکر نے کمرے سے ملنے والی ایک رسی میری طرف بڑھا دی۔ یہ رسی دو ٹکڑوں میں تھی ایک ٹکڑا بڑا اور دوسرا چھوٹا تھا۔ چھوٹا ٹکڑا یقیناً منہ بند کرنے کے لیے استعمال کیا گیا تھا۔ منہ میں کوئی کپڑا یا رومال وغیرہ ٹھونس کر اوپر سے رسی کس دی گئی تھی۔ بڑا ٹکڑا ہاتھ باندھنے کے لیے استعمال ہوا تھا۔ انسپکٹر شنکر نے بتایا کہ یہ دونوں ٹکڑے اسے کوٹھی کی بیرونی دیوار کے پاس سے ملے ہیں۔

اس کیس کے سلسلے میں سب سے اہم بیان مقتولہ کے بھائی رضوان کا تھا۔ اس نے مجرم کو آنکھوں سے دیکھا تھا۔ رضوان کا تفصیلی بیان لینے کے لیے ہم اسے علیحدہ کمرے میں لے گئے۔ ایس پی صاحب بھی وہاں موجود تھے۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں۔ رضوان کی عمر سولہ سترہ سال تھی۔ اس سے پہلے جب بڑی بہن نیلم پر تیزاب پھینکا گیا تھا وہ اسی کمرے میں سو رہا تھا۔ وہ ایک وجیہہ ماڈرن لڑکا تھا لیکن اس وقت رو رو کر اس کا برا حال تھا۔ گریبان چاک، بال منتشر اور آنکھیں سرخ انگارہ۔ اس نے آہوں اور سسکیوں کے درمیان ہمیں جو کچھ بتایا اس میں سب سے اہم بات یہ تھی کہ مجرم کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے میں کامیاب رہا تھا۔ واقعے کی تفصیل بتاتے ہوئے اس نے کہا۔

”روزینہ پہلے نچلی منزل پر ماماں کے پاس سوتی تھی۔ پھر ایک ہفتہ پہلے وہ اوپر سونے لگی۔ اسے امتحان کی تیاری کرنا ہوتی تھی اور نیچے شور وغل کی وجہ سے یہ ممکن نہیں تھا۔ میں نے گیلری اس کے حوالے کر دی اور خود نیچے سیڑھیوں کے پاس کامن روم میں سونے لگا۔ آج رات نو بجے روزینہ گیلری میں چلی گئی اور تھوڑی ہی دیر بعد میں بھی سونے کے لیے اپنے کمرے میں آ گیا۔ میرے کمرے یعنی کامن روم سے گیلری کا فاصلہ اتنا کم ہے کہ گیلری میں ہونے والی آہٹ بھی سنائی دے جاتی ہے۔ لہٰذا جب ساڑھے بارہ بجے کے قریب روزینہ نے گیلری میں زور زور سے چیخنا شروع کیا تو فوراً میری آنکھ کھل گئی۔ میری نگاہوں میں ایک ماہ پہلے کا وہی منظر گھوم گیا جب باجی اس طرح تیزاب گرنے سے زخمی ہوئی تھیں اور چیخی چلائی تھیں۔ مجھے لگا جیسے میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ میں نے لائٹ آن کی اور سلیپر گھسیٹتا ہوا

سیڑھیوں پر آیا۔ ساتھ ہی میں نے چوکیدار حسنات خاں کو آواز دی۔ چوکیدار ڈیڈی نے چند ہی
روز ہی پہلے رکھا ہے۔ میں نصف سیڑھیوں پر پہنچا تو میری نظر مجرم پر پڑی۔ اس کا قد بمشکل
چار فٹ رہا ہوگا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی چمکدار چیز تھی۔ وہ پھرتی سے دوزینے پھلانگتا ہوا
چھت پر پہنچا۔ اس دوران چوکیدار حسنات خاں بھی سیڑھیوں کے نچلے سرے پر نمودار ہو چکا
تھا۔ میں ہمت کر کے چھت پر آیا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے ٹھگنے شخص نے ساتھ والی چھت پر
چھلانگ لگائی۔ یہ چھت ہماری چھت سے قریباً دس فٹ نیچی ہے۔ اس چھت پر پہنچتے ہی وہ
غائب ہوگیا۔ میں بھاگتا ہوا واپس گیلری میں پہنچا۔ دروازہ کھلا تھا اور روزینہ اپنے ہی خون
میں لت پت تڑپ رہی تھی......" رضوان ایک بار پھر ہچکیوں سے رونے لگا اور اس کا رنگ
ہلدی کی مانند زرد ہوگیا۔

چوکیدار حسنات خاں کا بیان بھی رضوان کے بیان کی تصدیق کر رہا تھا......رضوان کے
بیان سے یہ بات ظاہر ہوتی تھی کہ جونہی روزینہ نے چیخنا چلانا شروع کیا مجرم نے اسے خنجر
گھونپا اور بھاگ گیا۔ یعنی مجرم نے اندر گھس کر روزینہ پر تیزاب پھینکا۔ جب وہ بھاگنے لگا تو
روزینہ نے جرأت کا مظاہرہ کر کے اسے پکڑ لیا۔ مجرم نے خود کو چھڑانے کی کوشش کی اور جب
ناکام ہوا تو چھرے سے روزینہ پر حملہ کر دیا......لیکن یہ بات تسلیم کر لی جاتی تو پھر مقتولہ کے
ہاتھوں اور چہرے پر رسی کی بندش کا کیا مطلب۔ یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ مجرم نے پہلے لڑکی کو
بے بس کر کے اس کی آبرو لوٹی ہو۔ پھر اسے کھول کر اس پر تیزاب پھینکا ہو اور پھر خنجر سے اس
پر وار کر دیا ہو......یہ بات دل کو نہیں لگتی تھی خاص طور پر اس صورت میں کہ واردات کا ارتکاب
کرنے والا کوئی ہٹا کٹا شخص نہیں ایک چار فٹ کا بونا تھا۔ کسی پہلو سے بھی دیکھا جاتا دوسرا
اندازہ درست محسوس ہوتا تھا۔ یعنی مجرم تیزاب پھینک کر فرار ہونے لگا تو مقتولہ نے اسے
دبوچ لیا اور نتیجے میں اس کے ہاتھوں ماری گئی لیکن اس صورت میں رسی کی بندشوں کا مسئلہ حل
طلب رہ جاتا تھا......اب تک مجرم نے کل چار وارداتیں کی تھیں اور ان میں آخری واردات
سب سے پیچیدہ تھی۔ نہ صرف اس واردات میں قتل کیا گیا تھا بلکہ قتل سے پہلے مقتولہ پر تشدد
بھی ہوا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اس تشدد کا علم ابھی تک ایس پی، انسپکٹر شنکر اور میرے علاوہ کسی
کو نہیں تھا۔

بڑی حیران کن بات تھی۔ مجرم نے ایک ماہ کے اندر اندر ایک گھر میں دوسری واردات
کی تھی۔ مسلح چوکیدار کی موجودگی میں وہ کسی آسیب کی طرح گھر میں داخل ہوا تھا اور واردات
کے بعد دیدہ دلیری سے فرار ہوگیا تھا......تمام تر احتیاطی تدابیر کے باوجود وہ گھر میں کیونکر

داخل ہو سکا تھا۔ یہ بات سمجھ میں آنے والی نہیں تھی۔ دفعتاً میری نگاہ رضوان کے پیچھے ایک
جالی کی طرف اٹھ گئی۔ یہ سیمنٹ کی جالی تھی۔ مجھے یوں لگا کہ جالی کے پیچھے کوئی سرخ لباس
والا شخص چھپا ہوا ہے۔ میں نے غور سے جالی کی طرف دیکھا پھر پُر تجسس انداز میں اس جانب
گیا، اچانک کوئی جالی کے پیچھے سے نکلا اور پوری رفتار سے سیڑھیوں کی طرف بھاگا، وہ
سانولے رنگ کا ایک دُبلا پتلا شخص تھا۔ اسے بھاگتے دیکھ کر عورتوں نے لرزہ خیز چیخیں ماریں۔
اردگرد موجود مرد بھی گھبرا کر پیچھے ہٹ گئے۔ میں نے تیزی سے اس شخص کا پیچھا کیا۔ وہ چھت
پر آیا تو میں اس سے دو گز کے فاصلے پر پہنچ چکا تھا۔ بھاگتے بھاگتے اچانک اس نے میری
طرف رخ پھیرا۔ اس کے ہاتھ میں تیز دھار چھری تھی......چھت پر لگے بلب کی روشنی میں
چھری کا سفید پھل خطرناک انداز میں چمک رہا تھا۔

اس شخص کی عمر تیس سال کے قریب تھی۔ شکل وصورت سے ہی جرائم پیشہ نظر آتا تھا۔
اس کے چھری پکڑنے کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ ایک نڈر شخص ہے اور اگر میں نے اسے
پکڑنے کی کوشش کی تو وہ چھری مارنے سے دریغ نہیں کرے گا۔ اب دو ہی صورتیں تھیں یا تو
میں کھڑا اس کی صورت دیکھتا رہتا اور وہ بھاگ جاتا یا پھر جان کا خطرہ مول لے کر اسے
پکڑنے کی کوشش کرتا۔ اچانک مجھے یہ موقع مل گیا۔ پیچھے ہٹنے کی کوشش میں چھری بردار کو کسی
چیز سے ٹھوکر لگی۔ وہ ذرا سا لڑکھڑایا اور میں نے اس پر حملہ کر دیا۔ میرا بایاں ہاتھ اس کی دائیں
کلائی پر آیا اور دائیں ہاتھ کا زوردار مُکا اس کی ناک پر پڑا۔ میں مُکا پوری قوت سے مارا تھا۔
وہ لڑکھڑا کر گرا لیکن میں نے اس کی کلائی نہیں چھوڑی۔ اس کے گرتے ہی میں نے دونوں
ہاتھوں کا زور لگا کر کلائی مروڑی اور چھری نیچے گرا دی لیکن اسی وقت "چھری بردار" نے جوابی
حملہ کیا۔ اس حملے کی تعریف نہ کرنا زیادتی ہوگی۔ یہ ایک شاندار وار تھا۔ کم از کم مجھے اس شخص
سے اتنی پھرتی کی توقع نہیں تھی۔ شاید گرفتاری کے خوف نے اس کے بدن میں بجلی دوڑا دی
تھی۔ لیٹے لیٹے اس نے اپنی ٹانگیں یوں اوپر اٹھائیں کہ صرف کندھے فرش سے لگے رہ
گئے۔ یہ اٹھی ہوئی ٹانگیں اس نے پوری قوت سے میرے سینے پر دے ماریں۔ کوشش کے
باوجود میں خود کو گرنے سے نہ بچا سکا۔ حملہ آور نے بلا دریغ چھت سے چھلانگ لگا دی۔ میں
نے اس کے گلی میں گرنے اور تکلیف سے کراہنے کی آواز سنی۔ اس دوران انسپکٹر شنکر اور چند
سپاہی چھت پر پہنچ چکے تھے۔ انسپکٹر شنکر نے مجرم کو چھت سے کودتے دیکھا تھا۔ اس نے گلی
میں جھانک کر دو تین فائر کیے تاہم بھاگنے والا گولیوں کی زد سے باہر نکل چکا تھا۔

ایک سب انسپکٹر کو بھاگنے والے کے تعاقب میں روانہ کر دیا گیا۔ میں اور انسپکٹر شنکر

چھت سے نیچے اُتر آئے۔ اہلِ خانہ اس نئے واقعے پر حیران اور ششدر تھے۔ میں نے مقتولہ کے بھائی رضوان سے پوچھا کہ یہ شخص کون ہوسکتا ہے۔ وہ لاعلمی میں سر ہلانے لگا۔ اس نے بتایا کہ واردات کے وقت اس نے صرف ایک شخص کو دیکھا تھا اور یہ وہی چار فٹ کا بونا تھا۔

یہ واردات باقی تینوں وارداتوں سے زیادہ الجھی ہوئی تھی۔ اب اس نئے واقعے نے اور پیچیدگی پیدا کردی تھی۔ ہم نے موقعے پر ضروری کارروائی کی اور مقتولہ روزینہ کی لاش اٹھوا کر پوسٹ مارٹم کے لیے روانہ کردی۔

☆======☆======☆

روزینہ کے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ تیسرے روز کو موصول ہوئی۔ اس رپورٹ سے میرا اور انسپکٹر شنکر کا شک یقین میں بدل گیا۔ قتل سے پہلے مقتولہ سے زیادتی کی گئی تھی۔ اس کی کلائیوں اور خساروں پر نظر آنے والے سرخ نشان یقیناً رسی کے تھے۔ چہرہ تیزاب سے جھلسا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ بھی اس کے جسم پر چوٹوں کے نشان تھے۔ مقتولہ کی موت سینے میں لگنے والے خنجر سے ہوئی تھی۔ موت کا وقت رات بارہ اور ایک بجے کے درمیان تھا۔

علاقے میں پہلے ہی خوف و ہراس پھیلا ہوا تھا۔ اس نئی واردات نے تو لوگوں کو دم بخود کردیا۔ واردات سے صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ مجرم کے حوصلے بلند ہو رہے ہیں۔ پہلے وہ صرف تیزاب پھینک کر بھاگ نکلا تھا مگر اب اس نے بڑے اطمینان سے موقعۂ واردات پر ڈیڑھ دو گھنٹے گزارے تھے۔ اپنے شکار کو بے بس کر کے اسے ہوس کا نشانہ بنایا تھا اور پھر قتل کر کے فرار ہوگیا تھا۔ اس موقعے پر میری نگاہوں میں رہ رہ کر وہ خط گھومنے لگے جو اس سے پہلے مختلف عورتوں کو لکھے گئے تھے۔ ان میں مجرم نے خود کو دین دار اور باحیا ظاہر کیا تھا اور دوسروں کے لیے نصیحتوں کے انبار لگائے تھے لیکن اس واردات میں وہ خود ایک شیطان بلکہ شیطان کا باپ نظر آرہا تھا۔ یہ شخص مقامی پولیس کے لیے اور خاص طور پر میرے لیے اب ایک چیلنج بن گیا تھا۔ اس کی آزادی نہ صرف خطرناک بلکہ میرے لیے شرمندگی کا باعث بھی تھی۔ میرے ہاتھ میں اس وقت صرف ایک چال تھی اور یہ وہ چال تھی جو میں مسٹر اور مسز اسمٰعیل کے گھر میں بیٹھ کر چلنا چاہتا تھا۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں اسمٰعیل صاحب کی وائف کو بھی دھمکی آمیز خط موصول ہو چکے تھے اور میری ہدایت پر وہ ان خطوں کو خاطر میں لائے بغیر اپنے روز مرّہ کے کام جاری رکھے ہوئے تھیں۔ اس بات کی روشن امید تھی کہ جلد یا بدیر مجرم مسز اسمٰعیل تک پہنچے گا اور اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرے گا۔

میں نے اگلے روز اسمٰعیل صاحب سے رابطہ قائم کیا تو دیر تک گھنٹی ہونے کے باوجود کسی نے فون نہیں اٹھایا، مایوس ہو کر میں نے بلال شاہ کو پتہ کرنے بھیجا۔ بلال شاہ کوئی دو گھنٹے بعد واپس آیا اور آکر ایسی خبر سنائی کہ میری ساری امیدوں پر پانی پھر گیا۔ اس نے بتایا' کہ اسمٰعیل صاحب کل دوپہر گھر چھوڑ کر جا چکے ہیں۔ مالک مکان نے بتایا ہے کہ وہ رام پور سے ہی چلے گئے ہیں اور نوکری سے بھی استعفیٰ دے دیا ہے۔

میں یہ سب کچھ سن کر ششدر رہ گیا۔ تین چار روز پہلے تک دونوں میاں بیوی بے حد پُرعزم تھے اور مجرم کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کی باتیں کر رہے تھے اور اب یہ حالت تھی کہ میدان چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ یقینی بات تھی کہ ایسا آخری واردات کی وجہ سے ہوا۔ ملزم کی سفّاکی کا واقعہ سن کر ان کی ہمت جواب دے گئی ہے اور انہوں نے جان بچانے میں ہی عقلمندی سمجھی ہے۔

اس بازی کا بہترین پتہ میرے ہاتھ سے نکل چکا تھا اور اس کے ساتھ ہی نادیدہ مجرم کے خلاف غم و غصّے میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ آخری واردات کے بعد اس نے خود کو بدترین سزا کا مستحق ٹھہرا لیا تھا اور یہ سزا پانے کے لیے وہ جتنی جلدی قانون کے کٹہرے میں پہنچ جاتا بہتر تھا۔

اس وقت تھانے میں میرے پاس راجو بھی بیٹھا تھا۔ راجو وہی نوجوان ہے جس نے راکیش پانڈے کی کم عمر بیوی نیلم سے تعلقات استوار کر رکھے تھے اور جو تیزاب پھینکے جانے کی واردات میں زخمی بھی ہوا تھا۔ میں نے ان دونوں کے تعلقات کا راز کسی پر فاش نہیں ہونے دیا تھا، اس وجہ سے راجو میرا بے حد احسان مند تھا۔ میں نے جب ہیڈ کانسٹیبل کی اطلاع پر مراد آباد جانے کی ٹھانی تو راجو بھی میرے ساتھ چل دیا۔ رام پور سے مراد آباد جانا ایسے ہی ہے جیسے لاہور سے گوجرانوالہ جانا بلکہ اس سے بھی کم فاصلہ ہے۔ ہم ایک ٹیکسی پر سوار شام سے کچھ پہلے مراد آباد پہنچے۔ سرکس ڈھونڈتے ڈھونڈتے ایک گھنٹہ اور لگ گیا۔ یہ سرکس شہر کے نواح میں ایک بڑی گراؤنڈ کے اندر لگا ہوا تھا۔ سرکس کے مالک نے غالباً کارپوریشن والوں سے ملی بھگت کر رکھی تھی ورنہ ایسی جگہ اتنی مدت سے سرکس کا قائم رہنا ممکن نہیں تھا۔ سرکس کا مالک ایک کالا بھجنگ مکرانی تھا۔ اسے دیکھ کر ایک قوی الجثہ افریقی کا تصور ذہن میں آتا تھا۔ اس کا رنگ دار لباس بھی افریقیوں جیسا تھا۔ جب تک وہ بولا نہیں ہم یہی سمجھتے رہے کہ شاید غیر ملکی ہے۔ میں نے اپنا تعارف کرایا تو وہ ٹھٹکا پھر بڑے احترام سے ہمیں اپنی چھولداری میں لے گیا۔ چھولداری اندر سے کسی آراستہ کمرے کی طرح تھی۔ نیچے موٹی دری

بچھی تھی۔ ایک طرف شاندار بیڈ پڑا ہوا تھا۔ کونے میں میز تھی اور اس پر کاغذات کا ڈھیر رکھا تھا۔ دیواروں پر بازی گروں اور شعبدے بازوں کی بہت سے تصویریں لگی تھیں۔ ان میں ڈانسر لڑکیوں اور بونوں کی تصویریں بھی تھیں۔ راجو بونوں کی تصویروں کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ چونک سا گیا ہے۔ ایک تصویر پر جھک کر وہ بڑی باریک بینی سے دیکھنے لگا، پھر میرے قریب ہو کر کانپتی سرگوشی میں بولا۔

''یہی ہے انسپکٹر صاحب! میں نے پہچان لیا ہے۔'' اس نے انگلی ایک بونے کی تصویر پر رکھ دی جو مضحکہ خیز لباس پہنے ایک رسّے پر چلنے کی کوشش کر رہا تھا...... یہاں میں آپ کو بتا دوں کہ صرف راجو ہی وہ شخص تھا جو ابھی تک مجرم کی جھلک دیکھنے میں کامیاب ہوا تھا۔ میں اس کو اپنے ساتھ بھی اسی لیے لایا تھا کہ شاید وہ میری کوئی مدد کر سکے لیکن مجھے یہ امید ہرگز نہیں تھی کہ سرکس میں پاؤں رکھتے ہی وہ ملزم کو پہچان لے گا۔ کالا بھجنگ مکرانی حیرت سے ہم دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ میری نگاہیں تصویر پر مرکوز تھیں۔ بونا گورا چٹا تھا۔ نقوش ایسے ہی تھے جیسے اکثر بونوں کے ہوتے ہیں۔ وہ زیادہ عمر کا نظر نہیں آتا تھا۔

ہم کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ مکرانی نے اپنا نام سیمسن بتایا۔ وہ اس سرکس کا مالک نہیں منیجر تھا۔ چائے کا آرڈر وہ ہمارے آتے ساتھ ہی دے چکا تھا۔ میں نے بونے کی تصویر پر انگلی رکھی اور پوچھا۔ ''یہ کون ہے؟''

سیمسن کے چہرے پر عجیب تاثرات پھیل گئے۔ کہنے لگا۔ ''جناب یہ ''ہے'' نہیں تھا۔ امارے پاس ملازمت کرتا تھا۔ دو برس ہوئے ام نے نکال دیا۔ ایک نمبر کا لوفر پکا بدمعاش تھا۔ آئے دن لفڑا، مار پیٹ، چوری چکاری۔ دفع کر دیا ہم نے۔''

''کیا نام تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''موسیٰ۔ جے پور کا رہنے والا تھا۔''

''کچھ پتہ ٹھکانہ تو ہوگا تمہارے پاس''

''ہاں جی۔ پتہ ٹھکانہ ہے لیکن آپ کو ملے گا نہیں وہاں پر۔ مدت ہوئی گھر کا رخ نہیں کیا اس نے۔ ویسے ام ایک بات پوچھ سکتا ہے جی آپ سے؟''

''پوچھو۔''

''کیا کوئی لمبا ہی لفڑا کیا ہے اس نے؟''

''ہاں لمبا ہی سمجھو...... رام پور میں جو وارداتیں ہوئی ہیں ان کا کوئی پتہ ہے تمہیں۔''

''رام پور...... ہاں...... ہاں جی سنا تو ہے۔ وڑی کوئی لڑکی بھی قتل ہوا ہے، اور......''

دفعتاً سیمسن نے بات ادھوری چھوڑی اور خوفزدہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں خوف کے ساتھ حیرت بھی تھی۔ چند لمحے بعد لرزاں آواز میں بولا۔ ''وڑی، آپ کا مطلب یہ تو نہیں...... کہ اُن وارداتوں میں اس کا ہاتھ ہے...... اوہ فادر...... یہ بات پہلے ہمارے مغز میں کیوں نہ آیا...... اوہ مائی گاڈ!'' اس کے تاریک چہرے پر زلزلے کے آثار تھے۔ وہ جلدی سے چھولداری کے دروازے پر پہنچا اور کسی ''چاند'' نامی شخص کو آوازیں دینے لگا۔ ذرا دیر بعد دو ٹھگنے دروازے پر آن موجود ہوئے۔ سیمسن نے ان دونوں کو اندر بلا لیا۔ دونوں فربہ اندام اور چالاک چست تھے۔ انہیں دیکھ کر حلوائی کے صحت مند لونڈوں کا گمان ہوتا تھا۔ ان میں سے بڑی عمر کے بونے کا نام چاند تھا۔ سیمسن نے دونوں سے ہمارا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ''وڑی! یہ انسپکٹر صاب ہیں۔ رام پور سے آئے ہیں اور موسیٰ کے بارے میں پوچھنا چاہتے ہیں۔''

دونوں بونوں نے بتایا کہ موسیٰ ان کا ساتھی اور دو سال اس سرکس میں کام کرتا رہا ہے۔ شروع میں وہ ہنسی مذاق کے چھوٹے موٹے آئٹم کرتا تھا۔ توپ کے منہ میں سے اُچھلتا تھا اور گھوڑے کی دُم سے لٹکتا تھا لیکن پھر اس نے رسے پر چلنا سیکھ لیا۔ اس مزاحیہ آئٹم میں اسے کافی داد ملنا شروع ہوئی اور اس کے معاوضے میں بھی اضافہ ہو گیا۔ بس یہیں سے اُس کا دماغ خراب ہونا شروع ہوا۔ نشہ کرنے لگا اور پیسے اللوں تللوں میں اڑانے لگا۔ مالک سے بھی آئے دن جھگڑا کرتا تھا۔ یہاں تک کہ چوری چکاری کرنے لگا اور عورتوں پر بُری نظر رکھنے لگا۔ ایک موقع پر تو اس نے حد ہی کر دی۔ شراب پی کر مالک کے خیمے میں گھس گیا۔ مالک شو میں تھا، خیمے میں صرف اُس کی چھوٹی بہن تھی۔ وہ اس سے دست درازی کرنے لگا۔ کہنے لگا تمہارے یہ سارے ٹھاٹ باٹ میرے دم سے ہیں۔ میں نہ کام کروں تو تمہارے بھائی کا سرکس اوندھا ہو جائے۔ مجھ سے شادی کر لو، ورنہ میں تمہارے بھائی کو برباد کر کے چلا جاؤں گا۔ یہ بات مالک کو معلوم ہوئی تو وہ غصے سے آگ بگولا ہو گئے۔ انہوں نے موسیٰ کو بلوا کر بُری طرح پٹوایا پھر دھکے دے کر نکال دیا۔ اس کے بعد چند ماہ تک موسیٰ سرکس کے ارد گرد ہی منڈلاتا رہا۔ یہ بھی سننے میں آیا کہ کوئی موالی اُس کی حمایت کر رہا ہے اور وہ لوگ مالک کو سبق سکھانے کی باتیں کر رہے ہیں، لیکن پھر یہ بات ٹل گئی اور موسیٰ ایک دوسرے سرکس میں شامل ہو کر اڑیسہ چلا گیا۔

سیمسن نے بھی ہمیں موسیٰ کے بارے میں کافی کچھ بتایا۔ اس کی باتوں سے پتہ چلا کہ معاوضہ زیادہ ملنے سے موسیٰ کا دماغ خراب ہو گیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس کی خوشحالی نے

اس کے جسمانی عیب پر پردہ ڈال دیا ہے اور پیسوں کے لالچ میں کوئی بھی لڑکی اُس کی دُلہن بننے پر تیار ہو سکتی ہے۔ یہ گھمنڈ بڑھتے بڑھتے اتنا بڑھ گیا تھا کہ وہ مالک کی بہن پر آنکھ رکھنے لگا تھا۔ موسیٰ کے بارے میں منیجر سیمسن سے رات گئے تک گفتگو ہوتی رہی۔ میں نے اُس سے موسیٰ کا پتہ ٹھکانہ پوچھا اور اس کے ملنے جلنے والوں کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ میں سرکس کے مالک سے بھی ملنا چاہتا تھا لیکن سیمسن نے بتایا کہ سیٹھ صاحب شہر سے باہر ہیں اور تین چار روز سے پہلے نہیں لوٹیں گے۔ سرکس کا دوسرا شو اپنے آخری مرحلوں میں تھا۔ قریبی پنڈال سے بار بار تالیوں کی گونج اور تماشیوں کا شور سنائی دیتا تھا۔ سیمسن ہمیں ایک خاص دروازے سے پنڈال میں لے گیا۔ یہاں سُرخ کپڑوں والے چار ٹرک بازی گر مختلف کرتب دکھانے میں مصروف تھے۔ تین چار مددگار لڑکیاں تیزی سے سٹیج پر آ جا رہی تھیں۔ لڑکیوں کے لباس خوبصورت اور چہرے روشن تھے۔ ان لڑکیوں میں سے ایک غیر ملکی لڑکی کو دیکھ کر میں ٹھٹک گیا۔ میں دھوکا نہیں کھا رہا تھا تو وہ دہلی سے نکلنے والے ایک انگریزی روزنامے کی سٹاف رپورٹر تھی...... اس کا نام مارگوٹ کرسٹی تھا۔ کوئی دو برس پہلے جالندھر میں تو ایک قتل کیس کے سلسلے میں میری اس سے دو تین دفعہ ملاقات ہو چکی تھی۔ وہ بے حد ذہین اور چالاک رپورٹر تھی۔ اسی وجہ سے وہ ابھی تک مجھے یاد بھی تھی۔ میں اُسے اس روپ میں اور اس اسٹیج پر دیکھ کر حیران رہ گیا اور اس کے ساتھ ہی میرے ذہن نے پکار کر اعلان کیا کہ یہ کوئی چکر ہے۔ کرسٹی ایک باعزت ملازمت چھوڑ کر ایسی نوکری کیوں کر سکتی تھی۔ میں نے قریب کھڑے سیمسن سے سرگوشی میں پوچھا۔ ”وہ لڑکی جو لوہے کے رنگ لا رہی ہے کون ہے۔“

سیمسن بولا۔ ”اس کا نام کرسٹی ہے۔ ڈیڑھ دو ماہ پہلے ملازم ہوئی ہے۔ جمناسٹک کا بہت شوق رکھتی ہے لیکن چل نہیں سکے گی۔ دراصل اس کام کے لیے بہت چھوٹی عمر سے آغاز کرنا پڑتا ہے۔ بعد میں کچھ بھی کرتے رہو جسم میں وہ لچک پیدا نہیں ہوتی۔“

میں نے پوچھا۔ ”کیا تنخواہ لے لیتی ہو گی۔“

اُس نے جو تنخواہ بتائی اسے سن کر مجھے یقین ہو گیا کہ کرسٹی یہاں کسی چکر میں ہے۔ میں اُس کے بارے میں زیادہ سوالات پوچھ کر سیمسن کو چوکنا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ پھر بھی باتوں باتوں میں مَیں نے یہ معلوم کر ہی لیا کہ کرسٹی ایک قریبی کالونی میں کرائے کا مکان لے کر رہتی ہے۔ اُس کی خالہ بھی اُس کے ساتھ مقیم ہے۔

بظاہر اس معاملے کا موسیٰ والے معاملے سے کوئی تعلق نظر نہیں آتا تھا لیکن میں نے ضروری سمجھا کہ اس معاملے کی بھی تھوڑی سی چھان بین کر لی جائے۔ ممکن تھا کہ کرسٹی بھی اس

معاملے کی تفتیش میں یہاں پہنچی ہو۔ وہ پچھلے ڈیڑھ دو ماہ سے یہاں موجود تھی جبکہ میں آج پہنچا تھا۔ اگر وہ موسیٰ والے چکر میں تھی تو ہو سکتا تھا کافی آگے نکل چکی ہو اور اگر یہ کوئی دوسرا معاملہ تھا تو بھی مجھے معلوم ہونا چاہیے تھا۔

☆======☆======☆

اس روز تو میں مراد آباد سے واپس آ گیا۔ تاہم اگلے روز رات گیارہ بجے میں اور بلال شاہ ایک پرائیویٹ کار میں مراد آباد پہنچے۔ اس دفعہ سرکس کی جگہ ڈھونڈنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ ہم نے گاڑی سرکس کی پارکنگ میں کھڑی کی اور خاموشی سے شو ٹوٹنے کا انتظار کرنے لگے۔ شو ساڑھے گیارہ بجے ٹوٹا...... ٹھیک بارہ بجے میں نے کرسٹی کو ایک فیشن ایبل لڑکی کے ساتھ باہر آتے اور ایک رکشا میں بیٹھتے دیکھا۔ رکشا روانہ ہوا تو ہم نے احتیاط سے تعاقب شروع کر دیا۔ میرا خیال تھا کہ اتنی رات گئے، کرسٹی سیدھی گھر جائے گی، لیکن یہ اندازہ غلط ثابت ہوا۔ رکشے نے شہر کے ایک بارونق علاقے کا رخ کیا۔ ایک ریستوران کے سامنے دونوں لڑکیاں رکشے سے اُتریں اور ہال کمرے میں آ گئیں۔ نصف شب کو بھی یہاں دن کا سماں تھا۔ اوپر ایک گیلری میں آرکسٹرا بج رہا تھا۔ بیشتر میزوں پر لوگ موجود تھے اور کھا پی رہے تھے۔ کرسٹی اور اس کی ساتھی بھی ایک میز پر جا بیٹھیں۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہو رہا تھا کہ کرسٹی نے اسکرٹ کی بجائے ہندوستانی لباس پہن رکھا ہے۔ پہلے وہ بوائے کٹ تھی، اب اس کے سنہری بال کندھوں پر جھول رہے تھے۔ سر پر دوپٹہ بھی دکھائی دے رہا تھا۔ کرسٹی کی عمر چوبیس پچیس سال تھی تاہم اچھی صحت کی وجہ سے وہ کم عمر نظر آتی تھی۔ نین نقش بھی اچھے ہی تھے۔ میں نے یہ بات نوٹ کی کہ وہ کچھ افسردہ ہے۔ وہ سہیلی کے ساتھ دھیمے لہجے میں باتیں کرتی رہی۔ پھر ویٹر سُوپ لے آیا اور سُوپ کے چمچ جیسے زبردستی حلق سے نیچے اتارنے لگی۔ ہم ایک محفوظ کونے میں بیٹھے تھے۔ امید نہیں تھی کہ اپنے آپ میں کھوئی ہوئی کرسٹی کی نظر ہم پر پڑ سکے گی۔ لیکن اس موقع پر بلال شاہ نے ایک کام کر دکھایا۔ ایسے موقعوں پر وہ ایسے کارنامے اکثر انجام دے دیتا تھا۔ بیٹھے بیٹھے اس بندۂ خدا نے اچانک اتنی زوردار چھینک ماری اور پورا ہال ہماری طرف دیکھنے لگا۔ بہرحال اس چھینک کے دوران میں نے محسوس کیا کہ کرسٹی نے نہ صرف ہم کو دیکھ لیا ہے بلکہ پہچان بھی لیا ہے۔ ممکن ہے میرا اندازہ غلط ہو، بہرطور اب خود کو چھپانا، خواہ مخواہ مشکوک ہونا تھا۔ بلال شاہ پر ایک قہر آلود نظر ڈال کر میں اٹھا اور کرسٹی کی میز پر پہنچ گیا۔ اس نے مجھے دور ہی سے آتے دیکھ لیا تھا۔ پہچان کر کھڑی ہو گئی۔

”ہیلو...... آپ انسپکٹر نواز ہیں ناں۔“ اُس نے میرے چہرے کی طرف انگلی اٹھا کر

گلابی اُردو میں کہا۔

''بے شک!'' میں نے ہنس کر جواب دیا۔

''بیٹھیے...... بیٹھیے۔ بڑی خوشی اور حیرت ہوئی آپ کو یہاں دیکھ کر۔'' وہ 'حیرت' کو 'حیرٹ' بولتی تھی۔ اس طرح 'ہرٹ' 'کوٹ' میں بدل دیتی تھی۔ میں کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنی ساتھی سے مختصر تعارف کرایا پھر رسمی باتوں میں مصروف ہوگئی۔ میں نے اسے بتایا کہ میں آج کل رام پور کے ایک تھانے میں ہوں اور ایک ڈکیتی کی تفتیش میں یہاں آیا ہوا ہوں۔

وہ بولی۔ ''حیرٹ کا بات ہے۔ ہم بھی پچھلے آٹھ مہینے سے رام پور میں رہتا...... پھر بھی آپ سے ملاقات نہ ہوا۔''

میں نے کہا۔ ''بات تو واقعی حیرت کا ہے لیکن آپ یہاں کیسے؟''

اُس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا لیکن پھر فوراً ہی سنبھل گئی اور بولی۔ ''بس ہم بڑا کریزی عورٹ ہے۔ ایک دم جی اچاٹ ہوگیا اخبار سے۔ سب رپورٹنگ وپورٹنگ چھوڑ دیا۔ آج کل ایک سرکس میں نوکری کر رہا ہے۔ بڑا تفریح رہتا ہے۔ خوب انجوائے کرتا ہے۔ بس ایک ہی ڈر رہتا ہے کسی دن ٹائیگر ہمارا لقمہ نہ بنا ڈالے۔'' وہ ہنسنے لگی۔

میں نے کہا۔ ''بہت بے وقوف شیر ہوگا جو آپ جیسی ذہین رپورٹر کو پیٹ کی بھوک مٹانے کے لیے استعمال کرے گا۔ آپ سے تو بہت بڑے بڑے کام لیے جاسکتے ہیں اور لوگ لے بھی رہے ہیں۔''

وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگی۔ پھر ایک دم سنجیدہ ہو کر بولی۔ ''کیا آپ سمجھتا کہ ہم یہاں کسی خاص کام کے لیے آیا۔''

میں نے جواب دیا۔ ''میرے سمجھنے یا نہ سمجھنے سے کیا ہوتا ہے۔ ویسے مجھے اتنا یقین ہے کہ آپ اخبار کی اچھی بھلی نوکری چھوڑ کر اس سرکس میں یوں ہی نہیں آسکتیں۔''

اس نے بڑی ذہانت کے ساتھ میرے فقرے میں سے نکتہ نکالا اور بولی۔ ''آپ کی بات سے ہم کو اندازہ ہوا کہ آپ جانتا ہے ہم کون سے سرکس میں کام کرتا ہے۔ کیا آپ بھی اُس سرکس میں گیا تھا۔'' میں نے اقرار میں سر ہلانا ہی بہتر سمجھا۔ وہ بولی۔ ''اب تو ہم ایک اور بھی شک کرسکتا ہے لیکن...... ہوسکتا ہے تم ہمارا پیچھا کرتا ہوا یہاں تک آیا ہو۔''

اُس کی معاملہ فہمی قابلِ داد تھی۔ میں مسکرانے لگا۔ وہ کہنے لگی۔ ''اس کا مطلب ہے کہ آپ کسی چکر میں یہاں آیا ہے۔ آئی مین سرکس کا چکر ہے۔''

میں نے کہا۔ ''بالکل ہے اور اسی لیے مجھے یقین ہے کہ آپ بھی چکر میں ہیں۔''

وہ گہری سانس بھر کر بولی۔ ''ہمارا کھیال ہے انسپکٹر ان باتوں کے لیے یہ جگہ ٹھیک نہیں۔ آؤ گھر چلتے ہیں۔''

اندھا کیا چاہے، دو آنکھیں۔ میں نے فوراً چلنے کی ہامی بھرلی۔ کونے کی میز سے بلال شاہ کو بھی بلا لیا گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد کرسٹی نے اپنی ساتھی کو گڈ بائے کہہ دیا اور ہمارے ساتھ گاڑی میں سوار ہو کر اپنے گھر چل دی۔

گھر میں ایک اینگلو انڈین عورت موجود تھی۔ میں دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ وہ کرسٹی کی خالہ والہ ہرگز نہیں ہے۔ شاید اخبار میں ہی کام کرنے والی عورت تھی جسے کرسٹی نے خالہ کے طور پر اپنے ساتھ رکھا ہوا تھا۔ اس کے لباس اور بول چال سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ معمولی معاوضے پر کام کرنے والی عورت ہے۔ اب رات کا ایک بج چکا تھا۔ سردی زوروں پر تھی۔ کرسٹی ہمیں ایک آرام دہ کمرے میں لے آئی۔ یہاں آتشدان دہک رہا تھا اور فرش پر قالین نما دری بچھی تھی۔ اس نے ہمارے لیے کشمیری قہوہ بنوایا، خود برانڈی کے چند گھونٹ لیے اور تسلی سے ہمارے پاس بیٹھ گئی۔ اُس کا چہرہ بدستور اُداسی کی زد میں تھا۔ یوں لگتا تھا وہ کسی اندرونی دکھ کو چھپانے کی اور بھلانے کی کوشش کر رہی ہے۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر کی گفتگو کے بعد ہم اصل موضوع پر آگئے۔ وہ ایک طویل سانس بھر کر بولی۔

''انسپکٹر نواز! ہم آج تک بھولا نہیں۔ آپ نے جالندھر میں ہم سے بڑا اچھا سلوک کیا۔ ہم چاہتا ہے کہ آپ سے دوستوں کی مافق بات کرے اور آپ سے کچھ بھی مت چھپائے۔ اگر ہم گلٹی نہیں کر رہا تو آپ موسیٰ کے چکر میں یہاں آیا ہے...... ہم ٹھیک کہتا ناں؟''

اُس نے خود ہی ساری بات صاف کر دی تھی۔ لہٰذا میں نے بھی پردہ رکھنا مناسب نہیں سمجھا۔ ہم دونوں کھل کر باتیں کرنے لگے۔ باتیں کرتے کرتے اچانک کرسٹی اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی۔

''انسپکٹر! ہم آپ کو ایک چیز دکھانا مانگتا۔ آپ دیکھ کر ضرور حیران ہوئیں گا۔''

وہ ایک اندرونی کمرے کی طرف گئی اور وہاں سے چند کاغذ اٹھا لائی۔ میں یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا کہ یہ اُسی ظالم موسیٰ کے خطوط تھے۔ یہ کل تین خطوط تھے اور کرسٹی کے نام لکھے گئے تھے۔ ان پر رام پور کی مہر لگی تھی اور اُس محلے کا ایڈریس تھا جہاں پہلے شائلہ پر تیزاب پھینکا گیا تھا اور پھر اُس کی چھوٹی بہن روزینہ کو بیدردی سے قتل کر دیا تھا۔ خط دیکھ کر مجھے فوراً اندازہ ہوگیا کہ کرسٹی کو کیا لکھا گیا ہے۔ یہ تقریباً وہی مضمون تھا جو اس سے پہلے کئی بدقسمت

لڑکیوں کو زندگی کا روگ لگا چکا تھا۔ کرسٹی کو میم صاحب کہہ کر مخاطب کیا گیا تھا۔ نیچے تحریر تھا۔
”میں تمہیں روزانہ دفتر میں جاتے دیکھتا ہوں۔ تمہاری ننگی پنڈلیاں اور چست لباس ہر آنکھ کو دعوتِ گناہ دیتے ہیں۔ اپنے ملک میں تم جو بھی کرو ٹھیک ہے لیکن یہ ہندوستان ہے۔ یہاں تمہیں ہندوستانی بن کر رہنا ہوگا۔ اگر تمہارا گھر سے نکلنا بہت ضروری ہے تو جسم کو ڈھانپو اور چہرے کو پردے میں رکھو...... میری ہدایت پر عمل نہ کیا تو پچھتانا پڑے گا۔ ب ب“

باقی دونوں خط بھی اسی نوعیت کے تھے اور اُن میں کرسٹی کو ڈرایا دھمکایا گیا تھا۔ ان خطوں کی تاریخ دیکھ کر مجھے حیرانی ہوئی۔ ان پر چار ماہ پہلے کی تاریخ درج تھی۔ خط پڑھنے کے بعد میں سوالیہ نظروں سے کرسٹی کی طرف دیکھنے لگا۔ ظاہر ہے میں تمام تفصیل جاننا چاہتا تھا۔ کرسٹی نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر اپنے مخصوص، دھیمے لہجے میں بولنا شروع کیا۔ میں اور بلال شاہ ہمہ تن گوش سنتے رہے۔ کہیں کہیں میں نے کرسٹی سے سوالات بھی کیے۔ اس گفتگو کا خلاصہ کچھ یوں ہے۔

”کرسٹی کا رویہ باقی ساری عورتوں سے مختلف تھا۔ پہلا گمنام خط پا کر وہ کچھ پریشان ہوئی لیکن پھر اُسے یہ سب کچھ اچھا لگنے لگا۔ ایک نامعلوم شخص اسے پردہ داری کی تلقین کر رہا تھا اور چاہتا تھا کہ وہ نیکی کے راستے پر چلے۔ نہ جانے اُس کے دل میں کیا آئی کہ اس نے خود کو گمنام خطوط کے مطابق بدلنے کا فیصلہ کر لیا۔ منی اسکرٹ چھوڑ کر شلوار قمیص پہننے لگی اور باہر نکلتے ہوئے سر پر موٹی اوڑھنی رکھنے لگی۔ پھر اس نے اوڑھنی سے چہرہ بھی ڈھانپنا شروع کر دیا۔ ایک ہی مہینے میں اُس کے طور اطوار میں زمین آسمان کا فرق آ گیا۔ اب خطوط ملنے بند ہو چکے تھے۔ ایک روز وہ اپنی سہیلی کی کار میں شاپنگ کے لیے جا رہی تھی۔ چھوٹی سی کار ٹریفک کے اشارے پر رکی تو اچانک کھڑکی میں ایک چہرہ نظر آیا۔ یہ ایک بونا تھا۔ اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک لیے وہ کرسٹی کی طرف دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ کرسٹی کچھ کہتی وہ بول پڑا۔ ”بہت شکریہ میم صاحب! بہت شکریہ۔ اس لباس میں آپ بہت اچھی لگتی ہیں۔“ اس کے ساتھ ہی وہ کھڑکی سے ہٹ کر بھیڑ میں گم ہو گیا۔ کرسٹی کے حیران ہونے کی ایک وجہ اور بھی تھی۔ وہ اس شخص کو جانتی تھی۔ اس نے کہیں پہلے بھی اسے دیکھا ہوا تھا لیکن ذہن میں نہیں آ رہا تھا کہ کہاں دیکھا ہے۔ گھر آ کر بھی وہ رات بھر اس الجھن میں گرفتار رہی۔ ایک تھیٹر کے ڈرامے میں اس نے بہت سے بونے دیکھے تھے شاید اُن میں تھا۔ ایک ہوٹل میں بھی بونے ویٹر کے فرائض سرانجام دیتے تھے اور ایک سینما میں تو اب بھی بونوں کی ایک فلم لگی ہوئی تھی۔ وہ ساری رات سوچتی رہی لیکن کچھ یاد

نہیں آیا۔ دن چڑھے تھک ہار کر سو گئی۔ شام کو جاگی تو کچھ ہی دیر بعد اچانک سب کچھ یاد آ گیا۔ وہ بھاگتی ہوئی اپنے سٹڈی روم میں پہنچی۔ رسالوں کے ایک ڈھیر کو اُلٹ پلٹ کر دیکھتی رہی۔ پھر قریباً ڈھائی سال پرانا ایک رسالہ نکال کر صوفے پر آ بیٹھی۔ جلد ہی وہ کل والے بونے کی تصویر ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گئی۔ موسیٰ نامی اس بونے پر دو تین صفحے کا مضمون شائع ہوا تھا۔ اس مضمون میں بتایا گیا تھا کہ یہ چھوٹے قد کا شخص اپنے فن میں دیو قامت ہے۔ رسّے اور لوہے کے باریک تار پر حیرت انگیز کرتب دکھاتا ہے اور تماشائیوں سے بے پناہ داد وصول کرتا ہے...... یہ کرسٹی کی بے پناہ ذہانت اور یادداشت ہی تھی کہ وہ ڈھائی برس پہلے دیکھی ہوئی ایک تصویر کی وجہ سے موسیٰ کو پہچان گئی تھی۔

اُس نے موسیٰ کے بارے میں یہ مضمون دوبارہ پڑھا اور اس عجیب و غریب کردار میں اُسے بے حد دلچسپی محسوس ہوئی۔ اس مضمون میں اُس سرکس کا نام بھی تھا جہاں موسیٰ کام کرتا تھا۔ کرسٹی نے پتہ چلایا کہ وہ سرکس آج کل مراد آباد میں ہے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ مراد آباد جائے گی اور تصدیق کرے گی کہ اس روز کار کی کھڑکی میں جھانکنے والا موسیٰ تھا یا کوئی اور۔ اسی دوران وہ واردات بھی ہو گئی جس میں موسیٰ نے اکبر ٹاؤن کے رہائشی دیوندر کی پیشہ ور بیوی رجنی پر تیزاب پھینک دیا۔ اس واردات میں بھی گمنام خطوں کا تذکرہ تھا۔ کرسٹی کو صورتِ حال سمجھنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ اس نے فوراً مراد آباد جا کر موسیٰ کا سراغ لگانے کا فیصلہ کیا۔ مراد آباد جا کر وہ سرکس والوں سے ملی تو معلوم ہوا کہ موسیٰ نام کا بونا ڈیڑھ دو برس پہلے کام چھوڑ کر جا چکا ہے۔ اب اُس کا کچھ پتہ نہیں۔ ہماری طرح کرسٹی نے بھی منیجر کے خیمے میں موسیٰ کی کچھ تصویریں دیکھیں اور اُسے پتہ چل گیا کہ گمنام خط لکھنے والا اور کھڑکی سے جھانکنے والا موسیٰ ہی تھا۔ وہ ایک اخباری رپورٹر تھی اور اس معاملے میں اس کی دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی۔ لہٰذا اس نے فوری طور پر ایک فیصلہ کیا اور کوشش کر کے چند دن کے اندر اندر سرکس میں نوکری حاصل کر لی۔ اُس کا خیال تھا کہ سرکس والوں نے جو کچھ موسیٰ کے بارے میں بتایا ہے درست نہیں ہے اور صحیح بات اُسے اُن لوگوں سے معلوم ہو گی جو موسیٰ کے ساتھ کام کرتے رہے ہیں۔ کرسٹی کا خیال درست ثابت ہوا۔ سرکس میں رہ کر اُسے تصویر کے ایک دوسرے رُخ کا پتہ چلا اور یہ رُخ پہلے رُخ سے بالکل مختلف تھا۔“

کرسٹی بول رہی تھی جبکہ میں اور بلال شاہ مبہوت سُن رہے تھے۔ کرسٹی نے قہوے کی تازہ پیالیاں منگوائیں اور آتش دان کے انگاروں کو گھورتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔

سرکس میں کام کرنے والوں سے کرسٹی کو جو اصل بات معلوم ہوئی وہ کچھ اس طرح

تھی۔ ’’موسیٰ جے پور کے ایک غریب شخص کا بیٹا تھا اور روزی کی تلاش میں در بدر بھٹک رہا تھا۔ اس دوران اُس کی ملاقات راجہ نام کے ایک شخص سے ہوئی۔ راجہ نے اُن دنوں ایک سرکس کی داغ بیل ڈالی تھی اور اچھے فن کاروں کی تلاش میں تھا۔ راجہ نے موسیٰ کو معمولی معاوضے پر ملازم رکھ لیا۔ موسیٰ سخت محنت سے کام کرنے لگا۔ شروع میں وہ چھوٹے موٹے مزاحیہ آئیٹم کرتا تھا پھر اس نے کچھ کرتب بھی سیکھ لیے اور بازیگروں کی نقالی کر کے تماشائیوں کو قہقہے لگانے پر مجبور کرنے لگا۔ راجہ کی ایک بہن بانو تھی۔ بہت ماڈرن اور شوخ۔ راجہ سے کئی برس چھوٹی تھی۔ وہ موسیٰ سے دل لگی کرتی رہتی۔ مذاق مذاق میں اُس نے موسیٰ کو اپنی چاہت میں گرفتار کر لیا۔ وہ بے وقوف اپنی اوقات سے بے خبر بانو کی تیز طرار اداؤں کو دیکھتا اُس کے مچلتے پھڑکتے جسم پر نگاہیں دوڑاتا اور چپکے چپکے ٹھنڈی سانسیں بھرتا۔ راجہ ایک لالچی شخص تھا۔ پیسہ کمانے کے لیے وہ کچھ بھی کر سکتا تھا۔ موسیٰ اس کے سرکس کے لیے بہت کار آمد تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ وہ بانو میں دلچسپی لیتا ہے تو اس نے بے غیرت بھائی کا کردار ادا کرتے ہوئے اس کی غلط فہمی کو بڑھاوا دینے کی کوشش کی۔ وہ اشاروں کنائیوں میں اسے سمجھانے لگا کہ اگر وہ خوب محنت سے کام کرے اور اپنا مقام بنائے تو یہ کوئی ناممکن بات نہیں کہ بانو کا ہاتھ اُسے سونپ دیا جائے۔ بانو کے عشق نے موسیٰ کی مت مار رکھی تھی۔ وہ گونگا بہرہ ہو کر راجہ کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے لگا۔ اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر راجہ نے اسے نت نئے کاموں پر اُکسایا اور اپنے سرکس کو ترقی دینے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ راجہ ہی کے کہنے پر کوتاہ قد موسیٰ نے پہلے رسّے اور پھر تار پر چلنے کا کرتب سیکھا۔ وہ مزاحیہ انداز میں تار اور رسّے پر چلتا اور لوگوں کو لوٹ پوٹ ہونے پر مجبور کر دیتا...... قانونی طور پر جال کے بغیر بلندی پر کرتب دکھانا منع ہوتا ہے لیکن اُن دنوں بعض سرکس والے خاص شو کرتے تھے اور بھاری ٹکٹ لے کر تماشائیوں کو بغیر جال کے کرتب دکھاتے تھے۔ یہ خطرناک کام نجی محفلوں میں بھی کیا جاتا تھا۔ اپنی تجوری آباد کرنے کے لیے راجہ نے موسیٰ کو ایسے کرتبوں کے لیے بھی آمادہ کر لیا۔ وہ بیچارہ اپنی تمناؤں کا مارا ’’موت کے اس رقص‘‘ پر بھی تیار ہو گیا۔

زمین سے بیسیوں فٹ کی بلندی پر بغیر جال کے آہنی تار پر کرتب دکھانا موت کا رقص ہی تو تھا۔ اپنی محبوبہ کے دلفریب حُسن کو نگاہوں کے سامنے رکھ کر وہ زندگی اور موت کا یہ کھیل کھیلتا رہا۔ راجہ کا سرکس اب علاقے کا مشہور سرکس تھا اور اس کی تجوری میں نوٹوں کی ریل پیل تھی۔ وہ پاگل نہیں تھا کہ اپنی بہن کی شادی ایک چار فٹ کے بونے سے کرتا۔ بہن بھی

دیوانی نہیں تھی کہ ایک ٹھگنے مسخرے کو اپنی زندگی کا ساتھی بناتی۔ لہٰذا وہی ہوا جو ہونا تھا۔ بانو کی نسبت طے ہوئی اور اس کی شادی دھوم دھام کے ساتھ ایک امیر گھرانے میں کر دی گئی۔ پاگل بونا روتا اور سسکتا رہا۔ اپنی محبت کا ماتم کرتا رہا لیکن اُس کی آہ و بکا سننے والا کون تھا؟ راجہ کے کارندوں نے اُسے مارا پیٹا اور اٹھا کر ویرانے میں پھینک آئے...... چند ماہ بعد موسیٰ نے ’’ڈریم لینڈ‘‘ نامی سرکس میں نوکری کر لی لیکن یہ نوکری چند ہفتوں سے زیادہ نہیں چلی۔ اپنے کام سے اُس کا جی بیزار ہو چکا تھا جس کے لیے جان جوکھم میں ڈالتا تھا وہی نہیں رہی تھی تو وہ ہر روز سُولی پر کیوں لٹکتا۔ اس کے بعد قریباً ڈیڑھ برس تک موسیٰ کا کچھ پتہ نہیں چلا کہ وہ کہاں رہا، کس کے ساتھ رہا اور کیا کرتا رہا۔ یہاں تک کہ مراد آباد میں اُس کی موجودگی کی گواہی ملی......‘‘

کرشی نے موسیٰ کے بارے میں جو کچھ بھی بتایا انکشاف انگیز تھا۔ یہ ایک بدنصیب شخص کی دردناک کہانی تھی۔ ایک چالاک شخص نے اُس کی مجبوری کا فائدہ اٹھا کر اسے بری طرح لوٹا تھا۔ یہاں تک کہ اسے جنونی بنا دیا تھا...... اب وہ اپنی برباد محبت کا انتقام ہر عورت سے لینا چاہتا تھا۔ یہاں تک تو بات ٹھیک تھی لیکن یہ خیال آتا تھا کہ اس نے روزینہ جیسی نوعمر لڑکی کو ہوس کا نشانہ بنایا اور قتل کیا تو اس کے ساتھ کوئی ہمدردی باقی نہیں رہتی تھی۔ عورتوں کے چہروں پر تیزاب پھینکنا بھی کوئی کم بڑا جرم نہیں تھا لیکن عزت لوٹ کر ایک دوشیزہ کو قتل کر دینا بھیانک جُرم تھا اور سخت سے سخت سزا کا مستحق بھی۔

☆======☆======☆

اگلے روز میں پھر سرکس کے منیجر سے ملنے پہنچا۔ عین ممکن تھا کہ اس مرتبہ اس مکرانی سے کوئی اہم بات معلوم ہو سکتی۔ میں اور بلال شاہ دوپہر کے وقت سرکس پہنچے۔ اُس وقت وہاں ویرانی کا راج تھا۔ رات بھر کے جاگے ہوئے فن کار اور مزدور یہاں وہاں سوئے پڑے تھے۔ ہاں منیجر سیمسن کی چھولداری آباد تھی۔ وہ مجھے ایک بار پھر سامنے پا کر ٹھٹک گیا۔ میں نے اُسے بتایا کہ ابھی کچھ باتیں اس سے پوچھنا باقی ہیں۔ اس کی چوڑی پیشانی پر ناگواری کی شکن تھی تاہم اس نے ہمیں بیٹھنے کی دعوت دی اور چائے وغیرہ منگوائی۔ چھولداری میں خوشبو سی پھیلی ہوئی تھی جس سے میں نے اندازہ لگایا کہ ابھی کچھ دیر پہلے یہاں کوئی تتلی سیمسن کا دل بہلا رہی تھی۔ ابھی میں سیمسن کے ساتھ رسمی باتوں میں ہی مصروف تھا کہ ایک ملازم تیزی سے اندر آیا اور اُس نے سیٹھ صاحب کے آنے کی اطلاع دی۔ سیٹھ صاحب سے اس کی مراد یقیناً مالک سے تھی کیونکہ سیمسن فوراً اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور سیٹھ صاحب کے استقبال کے لیے

احاطے کی طرف بڑھا۔ کسی بڑی کار کے دروازے کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں آئیں۔ پھر کوئی شخص بھاری آواز میں ''سلاموں'' کے جواب دیتا ہوا چھولداری کی طرف آیا۔ ایک ملازم نے جلدی سے آگے بڑھ کر چھولداری کا رنگین پردہ اٹھایا۔ تھری پیس سُوٹ والا ایک دراز قد شخص اندر داخل ہوا۔ اس کے پیچھے ایک ہٹا کٹا ملازم بریف کیس تھامے ہوئے تھا۔ دراز قد شخص کی صورت دیکھ کر میں چونک گیا۔ وہ پرنسپل اسمٰعیل صاحب تھے۔ انہی کے گھر کئی روز چھپ کر میں مجرم کا انتظار کرتا رہا تھا اور پھر جب روزینہ والی واردات ہوگئی تھی مسٹر اور مسز اسمٰعیل ایک دم میدان چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ آج کئی ہفتے بعد میں اسمٰعیل صاحب کو مراد آباد میں دیکھ رہا تھا اور وہ بھی ایک بالکل نئے روپ میں۔ اسمٰعیل صاحب بھی مجھے پہچان کر ٹھٹک گئے۔ اُن کا رنگ بالکل زرد ہوگیا۔ ایک لمحے کے لیے تو یوں لگا کہ وہ رُخ پھیر کر باہر تشریف لے جائیں گے لیکن پھر وہ سنبھلے اور آگے بڑھ کر مجھ سے مصافحہ فرمایا۔ پرنسپل اسمٰعیل نے سیمسن سمیت سارے ملازموں کو باہر بھیج دیا۔ ہم دونوں آمنے سامنے بیٹھ گئے۔

میں نے کہا۔ ''یہ میری آنکھیں کیا تماشہ دیکھ رہی ہیں پرنسپل صاحب۔ کہاں اینگلو انڈین سکول اور کہاں یہ سرکس۔''

پرنسپل اسمٰعیل نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ ''اب اس سرکس سے میرا تعلق ہے۔ کسی کسی وقت حساب کتاب چیک کرنے کے لیے آتا ہوں۔''

یعنی پرنسپل اسمٰعیل نے اعتراف کرلیا کہ اس سرکس کے مالک وہ خود ہی ہیں۔ میں نے کہا۔

''لیکن مجھے تو کسی راجہ صاحب کا نام بتایا گیا تھا؟''

''مجھے ہی راجہ اسمٰعیل کہتے ہیں۔'' پرنسپل کے پاس میری الجھن رفع کرنے کے سوا چارہ نہیں تھا۔

میرے ذہن میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ اس کا مطلب تھا مجھ سے بہت کچھ چھپایا گیا ہے۔ رام پور میں راجہ اسمٰعیل نے مجھ سے ذکر تک نہیں کیا تھا کہ وہ کسی سرکس کا مالک بھی ہے یا کہ وہ مجرم کو پہلے سے جانتا ہے۔ یہاں مراد آباد میں بھی اس کے منیجر نے بڑی شاندار اداکاری کی تھی اور یہ ظاہر کیا تھا کہ اُن کو موسیٰ کی وارداتوں کے بارے کچھ پتہ نہیں ہے۔ حالانکہ وہ دونوں جان چکے تھے کہ رام پور میں کھلبلی مچانے والا اُن کا وہی پرانا حریف موسیٰ ہے۔ جسے وہ ناچیز سمجھ کر بھلا چکے تھے وہ ایک نئے روپ میں سامنے آیا تھا۔ اب انہیں سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ اس جنونی دشمن سے براہِ راست ٹکر لیں یا نہیں۔ وہ اس سے پہلے بھی اسے

بہت نقصان پہنچا چکے تھے۔ شادی کا لالچ دے کر اس کی محنت سے اپنے لیے آسائشیں اکٹھی کرتے رہے تھے۔ اب اگر وہ اسے گرفتار کرانے میں پولیس کی مدد کرتے تو عین ممکن تھا وہ اور بھڑک اٹھتا۔ قاتل تو وہ بن ہی چکا تھا۔ اب اس کے لیے کسی اور کو قتل کرنا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ روزینہ کے قتل ہوتے ہی پرنسپل اسمٰعیل اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ یہاں آ چھپا تھا۔

میں نے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے راجہ اسمٰعیل کو غور سے دیکھا، اُس کے چہرے سے شرافت کے سارے چھلکے اُتر چکے تھے۔ لوگوں کی نظروں میں وہ ایک اعلیٰ سکول کا پرنسپل، ایک قابلِ عزت شخص تھا لیکن میری نگاہ میں وہ ایک عیار شخص تھا جس نے اپنے کاروبار کو ترقی دینے کے لیے اپنی غیرت کو داؤ پر لگایا تھا اور ایک مجبور شخص کو رات دن خطرے کی بھٹی میں جھونکا تھا...... میرے سینے میں راجہ اسمٰعیل کے خلاف نفرت کا غبار پھیل رہا تھا۔ کاش میرے بس میں ہوتا اور میں اسی وقت اسے ہتھکڑی لگا کر سلاخوں کے پیچھے پہنچا سکتا...... میرے منہ میں جو آیا اس کے سامنے کہہ دیا۔ میں سچ کہہ رہا تھا جھوٹ نہیں کہہ رہا تھا۔ میرا سچ سن کر راجہ اسمٰعیل پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔

وہ بار بار اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن بات نہیں بنتی تھی۔ میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''راجہ صاحب! اگر موسیٰ قاتل بنا ہے تو اس میں تم بھی برابر کے حصے دار ہو۔ یاد رکھو اگر مجھے کوئی موقع مل گیا تو تمہیں چھوڑوں گا نہیں، برابر کی سزا دلواؤں گا۔''

ابھی ہم باتیں کر ہی رہے تھے کہ ایک کلرک نما گنجا شخص اندر داخل ہوا۔ اس نے سلام کر کے ایک کاغذ راجہ اسمٰعیل کی طرف بڑھا دیا۔ ''کیا ہے'' راجہ نے کاغذ کی طرف دیکھے بغیر پوچھا۔

''جی...... وہ...... استعفیٰ ہے...... مس کرسٹی کا۔'' ملازم نے عام سے لہجے میں جواب دیا۔

کرسٹی کا نام سن کر میں چونک گیا۔ راجہ اسمٰعیل نے عینک لگا کر ایک طائرانہ نظر کاغذ پر ڈالی پھر اُسے لاپرواہی سے سیمسن کے کاغذوں پر رکھ دیا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اب مجھے زیادہ دیر یہاں نہیں رکنا چاہیے۔ کرسٹی یہاں سے جانے کے لیے پر تول رہی تھی۔ وہ اب غائب ہوتی تو پھر نہ جانے کب ملتی۔ وہ اس کہانی کا ایک اہم کردار تھی اور مجھے یقین تھا کہ اس سے مجھے اور بھی بہت کچھ معلوم ہوگا۔

ٹھیک ایک گھنٹے بعد میں بلال شاہ پھر کرسٹی کے دروازے پر دستک دے رہے تھے۔ ساری رات قہوہ پی پی کر بلال شاہ کے دماغ کو خشکی چڑھی ہوئی تھی۔ کہہ رہا تھا کہ ایک رات میں مَیں نے اتنا قہوہ پی لیا کہ دو ڈھائی مہینے تک نیند پاس بھی نہیں پھٹکے گی لیکن جب ہم اندر داخل ہوئے تو بلال شاہ یوں ایک خالی بستر پر گرا جیسے اب قیامت تک نہیں اٹھے گا۔ ایک طرح سے یہ اچھا ہی تھا۔ اب میں کھل کر کرسٹی سے باتیں کر سکتا تھا۔ میں نے ادھیڑ عمر عورت سے پوچھا کہ کرسٹی کدھر ہے۔ اس نے گلابی اُردو میں بتایا کہ وہ ساتھ والے کمرے میں ہے اور آج کئی ماہ کے بعد پھر سگریٹ نوشی کر رہی ہے۔ میں ساتھ والے کمرے میں پہنچا تو وہ شب خوابی کا لباس پہنے دری پر بیٹھی تھی۔ سنہری بال منتشر تھے اور کمرے میں سگریٹ کا دھواں بھرا ہوا تھا۔ وہ مجھے کل سے اُکھڑی اُکھڑی نظر آئی تھی اور آج تو اس کا موڈ کچھ زیادہ ہی خراب تھا۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ وہ ضرور کسی شدید الجھن میں گرفتار ہے۔ یہ الجھن کیا ہو سکتی تھی؟

میں نے کہا۔ ”کرسٹی! مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ نے سرکس کی ملازمت چھوڑ دی ہے!“

”ہاں“ اُس نے اداسی بھرے لہجے میں کہا۔ ”اب شاید ہم یہ کنٹری ہی چھوڑ جائے۔ بس دل بھر سا گیا ہے یہاں سے۔“

”کیوں ایسی کیا بات ہوگئی ہے ایک دم۔“

”بس ہم نے ایک ارادہ کیا تھا۔ وہ ارادہ پورا نہیں ہوا۔ ہمارا کوئی ارادہ بھی پورا نہیں ہوتا۔ ہم بڑا بدقسمت ہے مَین!“

میں سمجھ گیا کہ کرسٹی کا اشارہ اپنے ماضی کی طرف ہے۔ جالندھر میں اس نے مجھے بتایا تھا کہ یکے بعد دیگرے اس کی دو شادیاں ناکام ہوئی ہیں۔ پہلے مرد نے اس سے بے وفائی کی اور دوسرے نے اس کی کمائی پر عیش کی اور مارا پیٹا۔ چھوٹی سی عمر میں ہی وہ سنگدل زمانے کے کئی وار سہہ چکی تھی۔ میں نے کہا۔ ”کیا بات ہے۔ میں نے آپ کو پہلے کبھی ایسے پریشان نہیں دیکھا۔“

وہ بولی۔ ”بات ہی کچھ ایسا ہے۔ ہم آپ کو بتائیں گا تو آپ حیران ہوئیں گا۔ جو بھی سنے گا حیران ہوئیں گا۔ ہماری عقل پر ہنسیں گا۔“

میں نے کہا۔ ”میں نہیں سمجھتا کہ آپ نے کوئی ایسی بے وقوفی کی بات کی ہوگی۔ ویسے آپ نہ بتانا چاہیں تو یہ آپ کی مرضی ہے۔“

وہ عجیب سے انداز میں کہنے لگی۔ ”ہم نے آپ سے اس کیس میں بھی کوئی بات نہیں

چھپایا تھا انسپکٹر۔ آج بھی نہیں چھپائے گا۔ ہم آپ پر بھروسہ کرتا ہے۔“

پھر مختصر تمہید کے بعد اُس نے اپنا دل کھول کر میرے سامنے رکھ دیا۔ اس نے جو بات بتائی وہ ایک انگریز لڑکی ہی بتا سکتی تھی اور کرسٹی جیسی لڑکی ہی بتا سکتی تھی۔ اس کی باتوں سے پتہ چلا کہ موسیٰ کو دیکھنے کے بعد اور اس کے حالاتِ زندگی جاننے کے بعد وہ ایک اہم فیصلہ کر چکی تھی۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ ایسا کام کرے گی جو سب کو حیران کر دے گا...... وہ موسیٰ کے دل میں پلنے والی عورت کی ”خواہش“ پوری کر دے گی۔ وہ اس سے شادی کر لے گی۔ سرکس میں رہ کر جُوں جُوں اسے موسیٰ کے بارے میں زیادہ پتہ چلتا گیا، اس کا ارادہ پختہ ہوتا گیا۔ وہ اس کے زخمی دل پر مرہم رکھنے کے لیے دل و جان سے تیار ہوگئی۔ اس نے عزم کیا کہ وہ موسیٰ کو ڈھونڈے گی، اس سے ملے گی اور اس کی زندگی کو سنبھالا دینے کی پوری کوشش کرے گی۔ وہ جانتی تھی کہ موسیٰ بار بار قانون کو اپنے ہاتھ میں لے رہا ہے۔ اُس نے کئی عورتوں کے چہرے اپنے غضب کے چھینٹوں سے داغدار کر دیئے ہیں لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ ایک بے وفا لڑکی کے ”بے پردہ حسن“ نے اسے ورغلا کر رستے سے بھٹکایا تھا اب وہ کسی عورت کا حسن عیاں دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ ”بے پردہ خوبصورتی“ اسے زہر لگتی تھی اور وہ اسے ڈھانپنے کے لیے بے قرار ہو جاتا تھا۔ یہ بات بالکل ظاہر تھی کہ وہ ایک غلط کام کر رہا ہے لیکن پھر وہ ”اس غلط کام“ میں حد سے گزر گیا۔ چہرے داغدار کرتے کرتے اس نے ایک عزت داغدار کر دی بلکہ قاتل بن گیا...... کرسٹی نے اپنے ذہن میں جو منصوبہ بنایا تھا وہ دھڑام سے نیچے آ گرا۔ عزت کا لٹیرا اور قاتل بننے کے بعد موسیٰ اس کے لیے کسی طور قابلِ قبول نہیں رہا تھا۔ اب وہ اپنی پچھلی سوچوں پر شرمندہ تھی کہ اپنے ذہن میں کیسے فضول خیالوں کی پرورش کرتی رہی ہے۔ اب اسے موسیٰ سے کسی طرح کا کوئی سروکار نہیں تھا۔ وہ خود کو اس معاملے سے بالکل الگ کر لینا چاہتی تھی۔ عین ممکن تھا کہ وہ ایک دو ماہ میں واپس ولائیت ہی چلی جاتی۔

کرسٹی کی پوری روئیداد سن کر میں بہت متاثر ہوا۔ اس نے جو سوچا تھا وہ کسی مقامی لڑکی کو سوچنے کی توفیق نہیں ہوئی تھی...... ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ بغیر کسی بہت بڑے دباؤ یا لالچ کے ایک چار فٹ کے شخص سے شادی کرنا کس لڑکی کو منظور ہوتا...... لیکن کرسٹی کو یہ منظور ہوا تھا۔ وہ کوئی بدصورت یا جسمانی عیب والی لڑکی نہیں تھی۔ اچھے خاصے موزوں جسم کی مالک تھی۔ بنی سنوری ہوتی تو ٹھیک ٹھاک لگتی تھی۔ اس کے باوجود وہ موسیٰ کی زندگی سنوارنے پر کمربستہ ہو گئی تھی۔ اب یہ موسیٰ کی تقدیر تھی جو پلٹا کھا کر بھی پلٹا نہیں کھا سکتی تھی۔

بال بکھرائے، افسردہ افسردہ سی اپنے سامنے بیٹھی وہ مجھے اچھی لگی۔ میں کافی دیر بے خیالی میں اُسے دیکھتا رہا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''کرسٹی! میں آپ کی ساری بات سمجھ گیا ہوں...... اگر میں آپ سے ایک بات کہوں تو مانیں گی؟''

''کیا؟'' وہ بے ساختہ بولی۔

''ابھی رام پور چھوڑنے اور واپس وطن جانے کا خیال دل سے نکال دیں۔''

''لیکن کیوں؟''

''یہ آپ کو چھ سات دن کے اندر اندر معلوم ہو جائے گا۔ کیا آپ مجھے یہ چند دنوں کی مہلت نہیں دیں گے؟''

''لیکن بات کیا ہے مَین...... کچھ ہم کو بھی تو پتہ چلے۔''

''میں نے آپ سے کہا ہے ناں، کہ صرف چند دن۔ اس کے بعد آپ ہر طرح کا فیصلہ کرنے میں آزاد ہوں گی۔''

درحقیقت مجھے یہ شبہ ہو چکا تھا کہ روزینہ کا قتل کرنے والا موسیٰ کی بجائے کوئی اور ہے اور اگر موسیٰ ہے تو پھر اس کے ساتھ کوئی اور بھی شریک تھا۔ یعنی یہ واردات شک وشبے میں پڑ چکی تھی۔ میں اس سلسلے میں تفتیش کا آغاز بھی کر چکا تھا۔ سب سے پہلی بات تو مجھے یہ معلوم ہوئی تھی کہ روزینہ عطا محمد صاحب کی سگی بیٹی نہیں تھی۔ وہ اُن کے ایک مرحوم دوست کی لاوارث بیٹی تھی جسے انہوں نے اپنے گھر میں اولاد کی طرح رکھا ہوا تھا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ روزینہ جائیداد کی مالک بھی تھی۔ سب سے اہم بات ذہن میں یہ آتی تھی کہ ایک چارفٹ کے معمولی شخص نے کس طرح ایک جوان جہان لڑکی پر قابو پایا۔ زبردستی اس کے ہاتھ پاؤں باندھے۔ اس کے منہ میں کپڑا ٹھونسا اور اس تمام کارروائی کے دوران اسے چیخنے تک نہیں دیا۔ پھر پوری قوت سے اس کے سینے میں خنجر گھونپا اور بھاگ نکلا۔ دھیان خود بخود اُس پُراسرار شخص کی طرف جاتا تھا جو موقعے سے فرار ہوا تھا اور فرار ہوتے وقت اس نے مجھ پر چھری سے حملہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ فوری طور پر ذہن میں یہ خیال آتا تھا کہ وہ شخص موسیٰ کا ساتھی تھا۔ دونوں نے مل کر لڑکی پر قابو پایا اور اسے قتل کیا۔ لیکن یہاں یہ سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ اگر وہ موسیٰ کا ساتھی تھا تو پھر اُس کے ساتھ ہی فرار کیوں نہیں ہو گیا اور واردات کے بعد بھی گھر میں چھپا کیوں رہا۔ دوسری اہم بات یہ تھی کہ مقتولہ کے بھائی رضوان نے اپنے بیان میں اس شخص کا ذکر تک نہیں کیا۔ نہ وہ شخص گھر میں موسیٰ کے ساتھ نظر آیا اور نہ فرار ہوتے وقت اس کے ساتھ تھا۔

اس معمے کو حل کرنے کے لیے میرے ہاتھ چھوٹا سا سراغ آیا تھا اور یہ ''سراغ'' میں دو روز پہلے رام پور کے ایک شخص کے حوالے کر آیا تھا۔ یہ ایک دستی گھڑی تھی۔ جیسا کہ آپ کو یاد ہوگا عطا محمد صاحب کے گھر سے فرار ہونے والے شخص نے چھت سے گلی میں چھلانگ لگا دی تھی۔ وہ کافی بلندی سے گرا تھا یقیناً اسے چوٹ بھی آئی ہوگی۔ اس کی گھڑی کا چین ٹوٹ گیا تھا اور وہ گلی ہی میں پڑی رہ گئی تھی۔ بعد میں یہ گھڑی میں نے اپنی تحویل میں لے لی۔ اس گھڑی کی پشت پر ایک چھوٹی سے چٹ لگی ہوئی تھی۔ بعض گھڑی ساز اپنی مرمت کی ہوئی گھڑی پر ایسی چٹ چسپاں کر دیتے ہیں۔ عموماً اس چٹ پر مرمت کی تاریخ لکھ دی جاتی ہے یا گھڑی کے مالک کا نام درج ہوتا ہے۔ مفرور شخص کی گھڑی پر دو لفظ لکھے تھے۔ سراج اور پارسی چوک...... یعنی یہ سراج نامی شخص کی گھڑی تھی جو پارسی چوک میں رہتا تھا...... میں یاد دلاتا چلوں کہ پارسی چوک اسی محلّے کا نام ہے جہاں شوکی خاں اور اُس کا ''بدمعاش'' بھتیجا نکّے خان رہتے تھے۔ میں دو روز پہلے پارسی چوک گیا تھا اور یہ گھڑی شوکی خان کے حوالے کر آیا تھا۔ میں نے شوکی خان سے کہا تھا یہ تمہارے ہی محلّے کے کسی شخص کی گھڑی ہے۔ پتہ چلاؤ یہ کون ہے۔ شوکی خاں اس سراج نامی شخص کو پہچان گیا تھا۔ وہ فوراً میرے ساتھ سراج کے گھر پہنچا تھا لیکن معلوم ہوا تھا کہ وہ ایک ہفتہ پہلے گھر چھوڑ کر جا چکا ہے۔ شوکی خاں نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ ایک دو روز میں وہ سراج کا کھوج لگا کر مجھے بتا دے گا۔

کرسٹی کے پاس سے اٹھ کر میں نے بلال شاہ کو جگایا اور فوراً رام پور کا رخ کیا۔ بذریعہ کار ہم ایک گھنٹے میں رام پور واپس پہنچ گئے۔ تھانے کا ایک چکر لگا کر میں نے سیدھا پارسی چوک کا رخ کیا۔ شوکی خان اپنے ڈیرے پر ہی تھا۔ میں نے اسے باہر جیپ میں ہی بلا لیا۔

وہ بولا۔ ''صاحب بہادر! آپ نے خواہ مخواہ تکلیف کی۔ مجھے کوئی اطلاع ملتی تو خود ہی آپ کو پہنچا دیتا۔''

میں نے کہا۔ ''یعنی ابھی تک کوئی اطلاع نہیں'' وہ نفی میں سر ہلانے لگا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو شوکی خان! مجھ سے کوئی ہیر پھیر نہ کرنا۔ اگر اس شخص سراج سے تمہارا کوئی تعلق واسطہ ہے تو درمیان سے نکل جاؤ۔ میں خود اُسے ڈھونڈ لوں گا۔''

وہ گردن کی رگیں پھلا کر بولا۔ ''صاحب بہادر! آج تک شریفوں کی زبانوں پر اعتبار کرتے آئے ہو۔ اب ایک بدمعاش کی زبان کا اعتبار کر کے بھی دیکھ لو۔ میں نے جو کچھ کہا ہے وہ سولہ آنے صحیح ہے۔ سراج سے میرا صرف اتنا تعلق ہے کہ وہ میرا محلّے دار ہے اور اگر اس

نے کسی عورت پر ظلم کیا ہے تو پھر یہ تعلق بھی ختم ہی سمجھو۔ وہ جہاں اور جب بھی ملے گا میں اس کی گردن ناپ لوں گا، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں ہی اسے تلاش کروں گا۔ آپ بھی بڑے شوق سے ڈھونڈیں۔ مقصد تو اس کو پکڑنا ہی ہے ناں۔"

میں نے کہا۔ "گھڑی کا کچھ پتہ چلا؟"

وہ بولا۔ "ہاں جی۔ اس بات کا نتارا ہو گیا ہے کہ یہ سراج کی ہی گھڑی ہے۔ اس کی بیوی نے خود شناخت کی ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "اور کچھ نہیں بتایا اس کی بیوی نے۔"

"بتایا ہے جی!" شوکی خان نے سر ہلایا۔ "وہ کہتی ہے سراج پچھلے اتوار کو آیا تھا۔ پھر ایک ضروری کام سے لدھیانہ چلا گیا۔ ایک دو روز میں آجانا تھا لیکن ابھی تک نہیں آیا...... میں اس کی ایک فوٹو بھی لے آیا ہوں جی اس کی بیوی سے۔ آپ دیکھ کر پہچان لیں۔" شوکی خان نے اپنی بوسکی کی قمیص میں سے چمڑے کا بٹوہ نکالا اور اُس میں سے ایک بھدی سی تصویر نکال کر میرے سامنے کر دی۔" میں دیکھتے ہی پہچان گیا۔ یہی شخص تھا جس نے دو ہفتے پہلے عطا محمد صاحب کے گھر کی چھت پر مجھے چھری دکھائی تھی اور بعد میں فرار ہوا تھا۔ اب شک شبے کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔ میں نے شوکی خان سے کہا۔

"ہاں بھئی! یہی بندہ ہے۔ تم اس کا کھرا دبا لو تو سمجھو ہماری ایک بڑی مشکل آسان ہو جائے گی۔"

"بس جی آپ بے فکر رہیں۔" شوکی خان نے جواب دیا۔ "یہ میرے محلّے کا معاملہ ہے۔ یہ بندہ اگر "انڈیا" کا بارڈر پار نہیں کر گیا تو ہم سے بچ نہیں سکے گا۔" شوکی خان شیخیاں بگھار رہا تھا، بہر حال مجھے امید تھی، وہ کچھ نہ کچھ کرے گا ضرور۔

☆======☆======☆

دوسری طرف موسیٰ کی تلاش بھی زور و شور سے جاری تھی۔ میں نے سب انسپکٹر کو جے پور بھیج دیا تھا اور اسے کہا تھا کہ وہ موسیٰ کے والدین اور عزیز و اقارب سے مکمل معلومات حاصل کر کے آئے۔ رام پور اور مراد آباد میں بھی مفرور ٹھگنے کی تلاش پورے زور و شور سے جاری تھی۔ اس قسم کا مجرم قانون کی نگاہ سے زیادہ دیر چھپا نہیں رہ سکتا۔ اپنے خاص حلیے کی وجہ سے وہ ہر کسی کی نظر میں آجاتا ہے اور مخبری کے سبب پکڑا جاتا ہے۔ موسیٰ بھی خاص حلیے اور قد کاٹھ کا شخص تھا۔ پھر بھی اس کا کوئی سراغ نہیں مل رہا تھا۔ یوں لگتا تھا وہ کوئی چھلاوہ ہے جو رات کے اندھیرے میں پرچھائیں کی طرح نکلتا ہے اور غائب ہو جاتا ہے۔ علاقے میں

بہت خوف و ہراس تھا اور لوگ محتاط تھے شاید اسی وجہ سے کوئی نئی واردات نہیں ہوئی تھی لیکن یہ سکون تادیر برقرار نہیں رہ سکتا تھا۔ رام پور کی پولیس پوری طرح ہوشیار تھی اور ہر طرف مخبروں کا جال سا بچھا دیا گیا تھا۔ ایک روز علی الصبح شائلہ اور مقتولہ روزینہ کے والد عطا محمد صاحب تھانے پہنچے۔ ان کے ساتھ ان کا بیٹا رضوان اور چھوٹا بھائی بھی تھا۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے عطا محمد صاحب ریلوے میں اعلیٰ آفیسر تھے۔ خاصے پڑھے لکھے اور خوش باش آدمی تھے لیکن گھر میں اوپر تلے ہونے والے دو حادثات کے بعد وہ بے حد پژمردہ اور ملول نظر آتے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ اب اس گھر میں رہنے کو دل نہیں چاہتا لہٰذا وہ مکان بدل رہے ہیں۔ اگر تفتیش کے سلسلے میں اُن کی ضرورت پڑے تو نئے پتے پر رابطہ قائم کیا جائے۔ وہ اس بات پر بھی رنجیدہ تھے کہ اتنے دن گزرنے کے باوجود پولیس ابھی تک مجرم کا سراغ نہیں لگا سکی۔ ان کے بیٹے رضوان نے شائلہ اور پھر روزینہ کو اپنے سامنے تڑپتے سسکتے دیکھا تھا لہٰذا اس کے ذہن پر کچھ زیادہ ہی اثر محسوس ہوتا تھا۔ بال پریشان آنکھیں سرخ اور چہرے پر برہمی۔ اس نے تلخ لہجے میں کہا۔ "انسپکٹر صاحب، ہم ہر صبح اس امید کے ساتھ اٹھتے ہیں کہ آج قاتل کی گرفتاری کی خبر سنیں گے لیکن لگتا ہے، اس کے گرفتار ہونے تک اور کئی گھروں میں رونا پیٹنا مچے گا۔"

میں نے باپ بیٹا کو تسلی دی اور ان سے نیا ایڈریس لے کر انہیں رخصت کر دیا۔

تین چار دن اور گزر گئے۔ سراج کا کچھ پتہ چلا اور نہ ہی موسیٰ کا۔ کوشش دونوں طرف جاری تھی۔ ایک روز دوپہر کے وقت شوکی خان تھانے چلا آیا۔ اس کے ساتھ نوعمر بدمعاش نکے خاں بھی تھا۔ حسبِ معمول اس نے لمبا سا کُرتہ پہنا ہوا تھا، سر پر تلّے دار ٹوپی تھی اور وہ اکڑ اکڑ کر چل رہا تھا۔ شکر تھا کہ اس وقت بلال شاہ تھانے میں موجود نہیں تھا ورنہ زبردست گڑ بڑ ہو جاتی۔ نکے نے بلال شاہ کے ماتھے پر اینٹ ماری تھی اور وہ ابھی تک اس چوٹ کو بھولا نہیں تھا۔ شوکی خاں نے کہا۔ "آؤ صاحب بہادر! آپ کو ایک جگہ پر لے کر جانا ہے۔"

میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ اسٹیشن کے علاقے میں ایک بڑا پہنچا ہوا فقیر بیٹھا ہے۔ ہندو مسلم سکھ سب اُس کو مانتے ہیں۔ لوٹا گھما کر فال نکالتا ہے اور ایسی نکالتا ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ گمشدہ بندے کو چٹکی بجاتے ڈھونڈتا ہے۔ پولیس افسر تک اس کو مانتے ہیں۔

میں نے کہا۔ "لیکن میں ایسے لوٹے گھمانے والوں کو نہیں مانتا۔ لوٹے گھمانے سے مجرم مل جاتے تو پولیس کا محکمہ بنانے کی ضرورت ہی نہ رہتی۔"

وہ کہنے لگا۔ ''صاحب بہادر! ایک مرتبہ ہم جاہلوں کی بات مان کر بھی دیکھ لیں۔ میں یقین دلاتا ہوں اس کے پاس جا کر ہم گھاٹے میں نہیں رہیں گے۔ بندے کا پتہ اس نے نہ بتایا تو ٹیوا ضرور بتا دے گا۔ کل میں اس کے پاس سے ہو کر آیا ہوں۔ کہہ رہا تھا بندہ رام پور میں نہیں ہے۔ مراد آباد میں بھی نہیں ہے۔ اس کا کوئی رشتے دار ہے جس کا نام الف سے شروع ہوتا ہے اس کے پاس ٹھہرا ہوا ہے۔ اگر دو تین روز تک مل نہ گیا تو پھر اس کا ملنا مشکل ہو جائے گا۔''

میں نے کہا۔ ''ایسی باتیں تو ہر لوٹے گھمانے والا بتاتا ہے، اس نے خاص بات کون سی بتائی ہے۔''

''خاص بات بھی بتائے گا۔ نہ بتائے گا تو میں پوچھوں گا اس سے۔ مجھ سے بھاگ کر کہاں جائے گا۔'' شوکی خاں کے لہجے میں اپنے آپ بدمعاشی جھلکنے لگی۔

اس نے بہت اصرار کیا تو میں نے سوچا چلو ایک چکر لگا ہی آتے ہیں۔ کیا پتہ کوئی تکا لگ ہی جائے۔ تھانے سے باہر نکلتے ہی باہر ایک تانگہ مل گیا۔ ہم سوار ہو کر اسٹیشن کی طرف چل دیئے۔ ننکے خان بھی ساتھ تھا۔ میں نے اسے چڑانے کے لیے کہا۔ ''ننکے خاں! تم نے ابھی تک میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔ کیا تم نے واقعی بھرے بازار میں رجنی سے کہا تھا، کتھے جا رہے او سوہنیو، حسن دی خیر تے پاؤ۔''

اس کے چہرے پر سرخی پھیل گئی۔ کرخت لہجے میں بولا۔ ''مجھ کو نہیں پتہ جی۔''

میں نے کہا۔ ''اس میں شرمانے والی کیا بات ہے۔ جوان ہی ایسی باتیں کرتے ہیں اور تم ماشاء اللہ جوان ہو۔''

اُس کا کچھ غصہ کچھ ٹھنڈا پڑ گیا۔ کہنے لگا۔ ''صاحب بہادر بد سے بدنام بُرا ہوتا ہے۔ یہ زمانہ چھوٹی سی بات کا بتنگڑ بنا لیتا ہے۔ سنی سنائی باتوں پر یقین نہ کیا کریں آپ۔ ہر بندے کا سو جن سو دشمن۔'' وہ اپنی عمر سے بہت بڑی بڑی باتیں کرتا تھا۔ لگتا تھا روزمرہ بول چال کے سارے محاورے اسے رٹے ہوئے ہیں۔ بس یہ سمجھیں کہ اپنی طرز کا عجیب بچہ تھا وہ اس کی ٹھیکے دار باتیں سنتے ہوئے ہم اسٹیشن کے علاقے میں پہنچے اور چند تنگ سڑکوں سے گزر کر ہمارا تانگہ پیپل کے ایک بڑے درخت کے پاس جا رُکا۔ یہاں پہنچ کر شوکی خاں کچھ حیران نظر آنے لگا۔ اس نے تانگے سے اُتر کر چند مقامی افراد سے سوال جواب کیے پھر پریشان سا تانگے میں واپس آ گیا۔

میں نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے۔ کدھر ہے فقیر؟''

وہ بولا۔ ''اسے تو کل ایک ریڑھے نے ٹکر ماردی۔ بیچارہ سول اسپتال میں پڑا ہے۔ ایک ٹانگ چکنا چُور ہو گئی ہے۔''

میں نے سوچا چلو وقت ضائع ہونے سے بچا...... کتنی عجیب بات ہے، سڑک کے کنارے بیٹھ کر دوسروں کی قسمت کا حال بتانے والے بعض اوقات اپنی تقدیر کی چال سے مار کھا جاتے ہیں۔ ہم اسٹیشن سے واپس روانہ ہو گئے۔ مختلف سڑکوں سے گزرتا ہوا۔ جب ہمارا تانگہ پارسی چوک کے علاقے میں پہنچا تو وہاں کافی رش تھا۔ تانگہ سُست رفتاری سے آگے بڑھ رہا تھا۔ میں ایک ہیڈ کانسٹیبل کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھا تھا، ننکے خاں بھی ہمارے ساتھ تھا۔ میں اور کانسٹیبل سادہ لباس میں تھے۔ شوکی خان کوچوان کے ساتھ اگلی نشست پر تھا۔ جونہی ہمارا تانگہ ایک موڑ پر گھوما ننکے خاں کو نہ جانے کیا نظر آیا وہ اچھل کر تانگے سے اُترا۔ ''وہ رہا'' اس نے پکار کر کہا اور تیزی سے ایک طرف لپکا۔ لوگوں کے درمیان سے رستہ بناتا وہ چند ساعتوں میں کافی دور نکل گیا۔ پھر میں نے اسے ایک شخص کی ٹانگوں سے لپٹتے ہوئے دیکھا۔ میں اور ہیڈ کانسٹیبل بھی چھلانگیں لگا کر تانگے سے اُترے۔ ہجوم کی وجہ سے کچھ نظر نہیں آیا کہ کیا ہو رہا ہے۔ یہ سب لوگ ایک طرف بھاگتے جا رہے تھے۔ پھر مجھے لوگوں کے درمیان سے ننکے خاں کے کریم کلر کُرتے کی جھلک نظر آئی۔ وہ بدستور راہگیر کی ٹانگوں سے لپٹا ہوا تھا اور زور زور سے پکار رہا تھا۔ راہگیر اسے اپنے ساتھ گھسیٹتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا اور ساتھ ساتھ کسی چیز سے ننکے خاں کے سر پر ضربیں لگا رہا تھا۔ میں نے دونوں ہاتھوں کو حرکت دی اور ہجوم کے درمیان تیزی سے راستہ بناتا ننکے خاں کی طرف بڑھا۔ قریباً دس گز کی دوری پر میں نے ایک اسکوٹر دیکھا۔ اسکوٹر اسٹارٹ تھا اور اس پر ایک دبلا پتلا شخص بیٹھا تھا۔ جس راہگیر کو ننکے خاں نے جکڑا ہوا تھا وہ اسکوٹر پر سوار ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ دوسری طرف ننکے خاں اس کی ہر کوشش ناکام بنانے پر تلا ہوا تھا۔ وہ جیسے راہگیر کی ٹانگوں کے ساتھ جونک بن کر چمٹ گیا تھا۔ اس کے کریم کلر کُرتے پر مجھے جگہ جگہ خون کے دھبے نظر آ رہے تھے۔ میں نے آخری چند گز کا فاصلہ تیزی سے طے کیا اور راہگیر پر جا پڑا۔ وہ اپنی ایک ٹانگ اسکوٹر پر رکھ چکا تھا اور دوسری ٹانگ ننکے خاں سے چھڑانے کے لیے اس کے سر پر مسلسل ضربیں لگا رہا تھا۔ میرا مکا اس کے جبڑے پر پڑا تو وہ اپنے ساتھی اور اسکوٹر سمیت اُلٹ کر سڑک پر جا گرا۔ میں نے اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ سراج تھا۔ اس کے سڑک پر گرتے ہی لوگ اس پر ٹوٹ پڑے۔ اس کے ہاتھ میں دیسی ساخت کا ریوالور تھا۔ اس سے وہ ننکے خاں کے سر پر ضربیں لگا تا رہا تھا۔ چند ہی لمحوں میں لوگوں نے اسے مار مار کر لہولہان کر دیا۔ اس کے ساتھی کی بھی تسلی بخش ٹھکائی

کی گئی۔ میں نے نکے خاں کو سہارا دے کر اٹھایا۔ اس کے چہرے اور سر پر کئی زخم آئے تھے۔ سارے کپڑے لہولہان ہو رہے تھے۔ ہم اسے فوراً ایک قریبی ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔ اس کے سر اور چہرے پر قریباً تیس ٹانکے لگے۔ وہ ٹانکے لگوانے سے انکار کر رہا تھا۔ کہتا تھا۔ ''میں بالکل ٹھیک ہوں، جوانوں کو ایسی چوٹیں کیا کہتی ہیں۔'' بہر حال ٹانکے تو لگنے ہی تھے۔ ٹانکے لگنے سے تکلیف ہوئی تو وہ چیخنے لگا۔ ''اوہ ڈاکٹر! ہوش نال کم کر۔ کوئی ہور سیاپا نہ پالئیں۔'' یعنی ہوش سے کام کرو کہیں میرے ساتھ دشمنی نہ ڈال لینا۔

اسی ڈاکٹر سے سراج اور اس کے ساتھی کی مرہم پٹی بھی کروائی گئی اور پھر تینوں زخمیوں کو لے کر ہم واپس تھانے آ گئے۔

سراج کے پاس سے دیسی پستول کے علاوہ گولیاں بھی برآمد ہوئیں اس کے علاوہ اس کے اسکوٹر کی ڈگی میں وہ چھری بھی موجود تھی جس سے اس نے دو ہفتے پہلے مجھ پر حملہ کیا تھا۔ نکے خاں کی خوش قسمتی تھی کہ جس وقت وہ سراج کو پہچان کر اس کی ٹانگوں سے لپٹا، سراج کے پستول میں گولیاں موجود نہیں تھیں ورنہ عین ممکن تھا کہ وہ نکے کو ٹانگوں سے لپٹے دیکھ کر اور اسے ''تھانیدار...... تھانیدار'' کی پکار کرتے سن کر شوٹ ہی کر دیتا۔ سراج سے پوچھ گچھ کے دوران معلوم ہوا کہ وہ پچھلے دو ہفتے سے رام پور میں ہی تھا اور اپنے ایک پرانے دوست غلام رسول کے گھر میں چھپا ہوا تھا۔ (یعنی محترم فقیر صاحب کی ''الف'' والی پیش گوئی بھی غلط ثابت ہوئی تھی۔)

سراج پارسی چوک میں آٹے کی ایک چکی پر کام کرتا تھا۔ وہیں ایک دوست سے اسے نشے کی لت پڑی۔ جو کماتا وہ نشے میں اُڑا دیتا۔ آخر گھر اور نشے کے اخراجات پورے کرنے کے لیے اس نے چھوٹی موٹی وارداتیں شروع کر دیں۔ میں نے حوالات میں اس سے پوچھ گچھ شروع کی تو وہ اُلٹی سیدھی ہانکنے لگا۔ جلد ہی مجھے یہ اندازہ ہو گیا کہ وہ لاتوں کا بھوت ہے باتوں سے نہیں مانے گا۔ میں نے اسے ٹھیک ٹھاک چھینٹی لگوائی۔ ڈیڑھ دو گھنٹے کی محنت کے بعد وہ راہِ راست پر آ گیا۔ اس نے باقاعدہ اعتراف کر لیا کہ آج سے اٹھارہ روز قبل شام کے چھ بجے وہ ریلوے آفیسر عطا محمد صاحب کی کوٹھی میں داخل ہوا تھا اور اس وقت اس کے پاس یہی چھری تھی جو اب براؤن اسکوٹر کی ڈگی سے برآمد ہوئی ہے، لیکن اس نے یہ بات تسلیم کرنے سے پُر زور انکار کیا کہ قتل کی واردات میں اس کا ہاتھ ہے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ وہ موسیٰ نام کے کسی ٹھگنے کو جانتا ہے اور نہ کبھی اسے ملا ہے۔

میں نے کہا۔ ''لیکن میں سمجھتا ہوں کہ موسیٰ تمہارا ساتھی ہے اور تم نے اس کے ساتھ مل

کر روزینہ کا خون کیا ہے۔''

وہ زور زور سے انکار میں سر ہلانے لگا۔ ''یہ بالکل غلط بات ہے تھانیدار صاحب۔ لڑکی کے قتل میں میرا کوئی ہاتھ نہیں اور...... اور میرا خیال ہے کسی ٹھگنے کا بھی کوئی ہاتھ نہیں۔''

اس کی بات نے مجھے تھوڑا سا چونکا دیا۔ میں نے پوچھا۔ ''تو پھر کس کا ہاتھ ہے۔ کیا اس رات کسی جن بھوت نے عصمت دری اور قتل کا شوق پورا کیا تھا؟''

وہ آنکھوں میں آنسو بھر کر بولا۔ ''اگر میں خدا کو حاضر ناظر جان کر سب کچھ سچ سچ بتا دوں تو کیا اس شخص سے میری جان چھوٹ جائے گی۔'' اس کا اشارہ ہیڈ کانسٹیبل سجاد کی طرف تھا۔ پچھلے دو گھنٹے میں اس نے سراج پر خاصی ''محنت'' کی تھی۔

میں نے کہا۔ یہ تو تم بیان دو گے تو پتہ چلے گا۔ اپنی جان چھڑانا یا پھنسانا تمہارے اپنے اختیار میں ہے۔

سراج کا نشہ ٹوٹ رہا تھا۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر ایک سگریٹ پینے کی اجازت طلب کی۔ اس کی حالت دیکھتے ہوئے میں نے کانسٹیبل کو اشارہ کیا۔ وہ سراج کے سامان میں سے ایک بھرا ہوا سگریٹ لے آیا۔ سگریٹ کے لمبے لمبے کش لیتے ہوئے سراج نے کہا۔ ''انسپکٹر صاحب! مجھے اس رات کچھ پتہ نہیں تھا کہ چوہدری عطا کے گھر میں کیا ہونے والا ہے۔ اگر پتہ ہوتا تو میں کبھی وہاں قدم نہ رکھتا۔ میں چوری کی نیت سے اندر گھسا تھا۔ میرا خیال تھا کہ مجھے صحن میں ہی سے چند ایک چیزیں مل جائیں گی اور کچھ نہ ہوا تو دوسری منزل کے برآمدے میں سے چھت کے دو پنکھے اتار لوں گا اور انہیں بیچ کر چند دن کے لیے روٹی پانی کا انتظام کر لوں گا لیکن جب میں اندر گھس گیا تو چوکیدار نے سیڑھیوں کا دروازہ بند کر دیا جہاں سے میں نے باہر نکلنا تھا۔ یوں میں صبح تک کے لیے دوسری منزل پر قید ہو کر رہ گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اب کیا کروں۔ چوری چکاری تو بھول گیا اور میں اپنی جان بچانے کے چکر میں پڑ گیا۔ اس وقت رات کے قریباً سوا گیارہ بجے تھے جب قریبی کمرے کا دروازہ کھلا اور میں نے ایک سایہ سا باہر نکلتے دیکھا۔ یہ وہی لڑکی تھی جس پر کچھ دیر بعد زیادتی کی گئی اور پھر قتل کر دیا گیا۔ لڑکی نے بے چینی کے ساتھ راہداری میں ایک چکر لگایا اور واپس چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد نچلی منزل کی سیڑھیوں سے کھٹ پٹ سنائی دی۔ کوئی بڑی احتیاط کے ساتھ اوپر آ رہا تھا۔ پھر ایک سایہ میرے قریب سے گزرا۔ اس کے ہاتھ میں بوتل سی تھی۔ میں نے ایک ستون کی اوٹ سے اس پر بھرپور نگاہ ڈالی اور پہچان لیا...... وہ بڑی آہستگی سے چلتا ہوا لڑکی کے کمرے تک پہنچا اور انگلی کے ساتھ مدھم دستک دی۔ اندر سے لڑکی کی ڈری ہوئی سی آواز آئی

"کون؟" لگتا تھا وہ دروازہ کھولنے میں ہچکچا رہی ہے۔ شاید وہ دروازہ نہ کھولتی تو قتل ہونے سے بچ جاتی لیکن تھوڑی سی کش مکش کے بعد اس نے دروازہ کھول دیا۔ دستک دینے والا تیزی سے اندر داخل ہو گیا اور داخل ہوتے ہی اس نے کنڈی چڑھا دی۔ اس کے بعد قریباً ڈیڑھ گھنٹے تک مجھے کمرے کے اندر سے کوئی آواز سنائی نہیں دی۔ بس کبھی کبھی مدھم سی کھٹ پٹ ہوتی تھی اور خاموشی چھا جاتی تھی۔ میرے ذہن میں بالکل نہیں آیا کہ اندر ایک لڑکی کو تشدد کا نشانہ بنا کر قتل کیا جا رہا ہے۔ کوئی افراتفری محسوس ہوئی اور نہ چیخ پکار سنائی دی۔ قریباً پونے ایک بجے کمرے کا دروازہ دوبارہ کھلا اور وہ سایہ تیزی سے چلتا ہوا نیچے چلا گیا۔ اس کے چند ہی لمحے بعد پورا گھر چیخ و پکار سے گونج اٹھا۔ جب گھر میں سب لوگ جاگ گئے تو میرے نکلنے کا راستہ بالکل بند ہو گیا۔ میں نے خود کو برآمدے کے ایک تاریک کونے میں سیمنٹ کی جالی کے پیچھے چھپا لیا۔ میرا خیال تھا کہ صبح سے پہلے پہلے مجھے بھاگنے کا کوئی موقع مل جائے گا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ بھاگنا اور مشکل ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ آپ کی نظر مجھ پر پڑ گئی اور مجھے اپنی جان بچانے کے لیے چھت پر سے کودنا پڑا۔

☆======☆======☆

اسی روز شام کو میں نے عطا محمد صاحب کی نئی رہائش گاہ پر ان سے رابطہ قائم کیا۔ میں نے ان سے کہا۔ "عطا صاحب! میں آپ کو ایک خوشخبری سنانے آ رہا ہوں۔ آپ کوٹھی پر ہی رہیے گا۔"

فون سے فارغ ہو کر میں نے سراج کو اپنے ساتھ لیا اور عطا صاحب کی طرف روانہ ہو گیا۔ قریباً آدھ گھنٹے بعد ہم ان کی کوٹھی پہنچے۔ ایک دراز قد لڑکی لان میں ٹہل رہی تھی۔ اس کی گردن پر جبڑے کے قریب سفید نشان سا تھا۔ میں پہچان گیا۔ یہی عطا صاحب کی حقیقی بیٹی شائلہ تھی۔ اس کی ٹھوڑی پر نظر آنے والا نشان تیزاب کا تھا۔ قدرت نے اس کا چہرہ مسخ ہونے سے بچا لیا تھا۔ گردن اور بازو کا کیا تھا۔ یہ حصے تو لباس میں چھپ جاتے ہیں۔ ہمیں دیکھتے ہی شائلہ نے چادر سرکا کر گھونگھٹ سا نکال لیا۔ میں نے سوچا کاش یہ گھونگھٹ پہلے ہی اس کے لباس کا حصہ ہوتا۔

عطا صاحب نے ہمیں خوش آمدید کہا اور ساتھ لے کر ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ یہاں عطا صاحب کا چھوٹا بھائی اور بیٹا رضوان بھی موجود تھے۔ میں نے عطا صاحب کو بتایا کہ ہم روزینہ کے قاتل کے بالکل قریب پہنچ چکے ہیں۔ امید ہے آج ہی گرفتاری ہو جائے گی۔

رضوان نے کہا۔ "انسپکٹر صاحب! ہمارا خیال تھا کہ آج آپ نے قاتل کو پکڑ لیا ہے

لیکن آپ تو آج بھی صرف آس دلانے ہی آئے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "اتنا مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ سمجھیں کہ قاتل کا نام پتہ میری جیب میں پڑا ہے۔ بس ہتھکڑیاں لگانے کی ضرورت ہے۔"

"آخر......کون ہے وہ؟" رضوان نے قریباً چیختے ہوئے پوچھا۔

"تم خود ہو۔" میں نے بڑے اطمینان سے اس کی آنکھوں میں جھانک کر جواب دیا۔

وہ جیسے اپنی نشست سے اچھل پڑا۔ یہی حال عطا صاحب کا بھی ہوا۔ بہر حال دونوں کے اچھلنے میں فرق تھا۔ عطا صاحب حیرت اور بے یقینی کے عالم میں اچھلے تھے جبکہ رضوان پر دفعتاً خوف کا شدید حملہ ہوا تھا۔ ایک ہی لمحے میں اس کا رنگ خوف سے سیاہ پڑ گیا اور وہ کھلی آنکھوں سے میری طرف دیکھتا چلا گیا۔ میں نے صوفے سے ٹیک لگاتے ہوئے رضوان کے باپ سے کہا۔

"مجھے افسوس ہے عطا صاحب۔ میری سنائی ہوئی خوشخبری میں آپ کے لیے غم کا دھچکا بھی ہے۔ آپ نے اپنے دوست کی بیٹی کو اپنی بیٹی بنایا تھا کاش آپ اپنے بیٹے کو بھی اسے بہن سمجھنے پر آمادہ کر سکتے۔ آپ جانتے ہیں آپ کے بیٹے نے پہلے دن سے روزینہ کا وجود اس گھر میں قبول نہیں کیا تھا۔ یہ روزینہ سے شدید نفرت کرتا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ نفرت انتقام کے خوفناک جذبے میں ڈھل چکی تھی۔ آخر دو ہفتے پہلے یہ آتش فشاں پھٹ پڑا اور آپ کی منہ بولی بیٹی کو خاکستر کر گیا۔"

عطا صاحب سکتے کی حالت میں بیٹھے تھے۔ لگتا تھا ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ میرے منہ سے ایسی بات نکلے گی۔ میں نے سراج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے آپ اس شخص کو سادہ لباس میں پولیس والا سمجھ رہے ہیں لیکن یہ پولیس والا نہیں مجرم ہے۔ یہی شخص ہے جس نے دو ہفتے پہلے آپ کے گھر کی چھت پر مجھ پر چھری نکالی تھی اور ہاتھا پائی کر کے بھاگ گیا تھا۔ یہ شخص وقوعہ کی رات آپ کے گھر میں بند تھا اور یہ اس گھناؤنی واردات کا چشم دید گواہ بھی ہے۔"

میں دیکھ رہا تھا کہ رضوان کے چہرے پر زلزلے کے آثار نمودار ہو رہے ہیں۔ شاید اس نے پھانسی کا پھندا آنکھوں کے سامنے لہراتے دیکھ لیا تھا۔ میں نے تیزی سے پستول نکال لیا

"خبردار! اپنی جگہ سکون سے بیٹھے رہو۔ بھاگنے کے لیے تمہیں دو ہفتے ملے تھے لیکن تم اپنی چال سے پوری طرح مطمئن تھے اس لیے بھاگنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی۔"

"آ......آپ یہ کیا......کہہ رہے ہیں؟" اس نے شکستہ آواز میں گھگیا کر کہا۔

''حقیقت بیان کر رہا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''تم نے اپنے گناہ پر پردہ ڈالنے کے لیے تیزاب کا سہارا لیا۔ تم جانتے تھے کہ تیزاب کی وارداتیں پے در پے ہو رہی ہیں اور پولیس ایک کوتاہ قد مجرم کی تلاش میں ہے۔ تم نے تفتیش کو غلط راہ پر ڈالنے کے لیے مقتولہ کے چہرے پر تیزاب پھینکا اور بعد میں پولیس کو یہ کہانی سنائی کہ تم نے اپنی آنکھوں سے ٹھگنے کو چھت پر چڑھتے اور غائب ہوتے دیکھا ہے۔ تم اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب ہو چکے تھے اور شاید تمہارا یہ جرم ہمیشہ تاریکی کے پردے میں چھپا رہتا...... اگر یہ شخص سراج اس رات چوری کی نیت سے تمہارے گھر میں داخل نہ ہوتا اور تمہارا گھناؤنا جرم اپنی آنکھوں سے نہ دیکھتا۔'' (میں بتاتا چلوں کہ اس کیس میں رضوان کو بعد میں عمر قید کی سزا ہوئی)

دفعتاً چوہدری عطا کے ہونٹوں سے آہ کی آواز نکلی اور وہ بے ہوش ہو کر صوفے پر لڑھک گئے۔

بہر طور میں نے ایک لمحے کے لیے بھی رضوان سے نظر نہیں ہٹائی۔ میں جانتا تھا وہ نکل بھاگنے کے لیے پر تول رہا ہے اور میری ایک لمحے کی غفلت اسے مجھ سے کوسوں دور لے جائے گی۔

وہ رات رضوان کو حوالات میں آئی۔ میرا عملہ رات بارہ بجے رضوان کے ایک نہایت قریبی دوست کرامت کو بھی پکڑ لایا۔ کرامت ایک نازک مزاج لڑکا ثابت ہوا۔ اسے تھوڑی سے پھینٹی لگی تو وہ چیخنے چلانے لگا اور سب کچھ بتانے پر آمادہ ہو گیا۔ اس کے بیان نے رضوان کے انجام پر مہر تصدیق کر دی۔ اس کی باتوں سے کئی اندر خانے کی باتیں سامنے آئیں۔ مثلاً یہ کہ مقتولہ سے رضوان کی نفرت کی اصل وجہ مقتولہ کی قابلیت تھی۔ وہ تعلیمی میدان میں اپنا لوہا منوا چکی تھی جبکہ رضوان کا شمار شروع سے نالائق طالب علموں میں ہوتا تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس نفرت نے کئی روپ بدلے اور آخر خوفناک انتقام کا روپ دھار گئی۔ وقوعہ کی رات رضوان تیزاب کی بوتل ساتھ لے کر مقتولہ کے کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے بڑی چالبازی کے ساتھ پہلے لڑکی کو بے بس کیا پھر عصمت دری کے بعد قتل کر دیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے ہر جگہ سے اپنی انگلیوں کے نشانات صاف کیے۔ آخر میں مقتولہ کے چہرے پر تیزاب پھینکا اور اس کی بندشیں کھول کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ باہر آ کر اس نے پہلے اپنا حلیہ درست کیا اور پھر چیخ و پکار شروع کر دی کہ کوئی گھر میں گھس آیا ہے۔

جس صبح اخباروں میں اس سارے واقعے کی خبر چھپی اسی روز کرسٹی مجھے ڈھونڈتی ہوئی رام پور کے تھانے میں آ پہنچی۔ آج اس نے ڈھنگ کا لباس پہن رکھا تھا اور چہرے پر مسرت

کی ہلکی سی چمک نظر آتی تھی۔ وہ ہندوستانی لباس میں تھی۔ کندھے سے ہینڈ بیگ جھول رہا تھا اور بیگ سے اخبار کا تازہ پرچہ جھانک رہا تھا۔

وہ کرسی گھسیٹ کر میرے سامنے بیٹھ گئی اور معنی خیز لہجے میں بولی۔ ''انسپکٹر نواز! آج ہم کو سمجھ آیا کہ آپ اس روز ہم سے چند روز کا مہلت کیوں مانگ رہا تھا...... آپ...... آپ موسیٰ کو بے گناہ ثابت کرنا مانگتا تھا۔ یہی بات ہے ناں؟''

میں نے مسکرا کر کہا۔ ''ہاں...... بات تو یہی تھی۔ اب پتہ نہیں میں کامیاب ہوا ہوں یا نہیں۔''

وہ اخبار سامنے پھیلا کر بولی۔ ''اب اس میں شک کا کیا بات ہے۔ سب کچھ تو کلیئر ہے۔ یہ بات ثابت ہو رہا ہے کہ موسیٰ مرڈرر نہیں۔'' کرسٹی کے چہرے سے خوشی صاف ظاہر تھی۔ میں نے اس کے لیے چائے منگوائی۔ وہ بڑی دلجمعی کے ساتھ گفتگو میں مصروف رہی۔ کہنے لگی ''انسپکٹر نواز! ہمارا دل نہیں مانتا تھا کہ موسیٰ ایسا ہو سکتا ہے۔ دماغ میں آتا تھا ضرور کوئی گڑ بڑ ہوا۔''

باتوں باتوں میں وہ مجھ سے کافی کھل گئی۔ کہنے لگی۔ ''انسپکٹر! ہمارا دل چاہتا ہے کہ موسیٰ ہمیں کہیں ملے۔ ہم اسے کرائم کی دنیا سے بہت دور لے جائے۔ ایسی جگہ جہاں کوئی اس کی طرف انگلی اٹھا کر مذاق مت کرے۔ جہاں وہ عزت کے ساتھ لائف گزار سکے۔ انسپکٹر کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم اسے اپنے ساتھ انگلینڈ لے جائے......''

میں نے کہا۔ ''مس کرسٹی! آپ ایک بات بھول رہی ہیں۔ موسیٰ صرف قتل کے الزام سے بری ہوا ہے۔ باقی سارے الزام اس پر بدستور موجود ہیں۔ اس نے کم از کم چار خوبرو لڑکیوں کے چہرے داغدار کیے ہیں اور کئی ایک کو سنگین نتائج کی دھمکیاں دی ہیں۔ اس کے علاوہ اس پر چوری کے کیسز بھی ہیں۔''

وہ اپنے مخصوص لہجے میں بولی کہ وہ اس بارے میں سب کچھ جانتی ہے۔ موسیٰ نے چند عورتوں پر تیزاب ضرور پھینکا ہے لیکن اس نے وارننگ کے کئی ایک خطوں کے بعد ایسا کیا اور جو لڑکیاں اس کے ہاتھوں زخمی ہوئیں وہ سب اس سلوک کے لائق تھیں۔ مثلاً رجنی جو شرفا کے محلّے میں عصمت فروشی کرتی تھی اور نوعمر لڑکوں تک کو گندگی میں لتھڑ رہی تھی اور نیلم جو اپنے خاوند سے بے وفائی کرتی تھی اس نے اپنے ہی محلّے کے نوجوان سے ناجائز تعلقات قائم کر رکھے تھے۔ باقی...... جہاں تک چوری کا تعلق ہے وہ بھی ایک بالکل مختلف معاملہ ہے۔ موسیٰ نے کسی بھی گھر میں لالچ میں آ کر چوری نہیں کی۔ یہ بات ثابت ہے کہ اس نے کئی موقعوں پر

قیمتی چیزوں کو بالکل ہاتھ نہیں لگایا۔ صرف وہ چیزیں اٹھائی ہیں جن کا تعلق فیشن پرستی سے تھا یا پھر ریڈیو کیمرے، گراموفون وغیرہ غائب کیے ہیں۔ اسے بھی ہم چوری نہیں کہہ سکتے۔ سمجھ لیں کہ یہ ایک طرح کا جنون ہے۔ وہ ہر اس چیز کے خلاف ہے جو عورت کی سادگی چھین کر اسے ماڈرن اور شوخ بناتی ہے...... کرسٹی بڑی روانی سے موسیٰ کے حق میں دلیلیں دے رہی تھی۔ بالکل کسی وکیل کی طرح وہ موسیٰ کا مقدمہ میرے سامنے پیش کر رہی تھی۔ ایک ایسے ملزم کا مقدمہ جو کئی ماہ گزرنے کے باوجود ابھی تک میری نگاہوں سے اوجھل تھا۔ آخر کرسٹی نے اپنا دل کھول کر میرے سامنے رکھ دیا۔ کہنے لگی۔ ''انسپکٹر نواز! ہم جانتا ہے آپ کے دل میں بھی موسیٰ کا تھوڑا بہت ہمدردی موجود ہے۔ آپ بھی جانتا ہے کہ موسیٰ مجرم کیوں بنا...... کیا آپ اس کا لائف سنوارنے میں ہماری مدد نہیں کرسکتا۔''

میں نے کہا۔ ''مس کرسٹی! یہ تو اس وقت کی باتیں ہیں جب وہ ملے یا خود کو گرفتاری کے لیے پیش کرے۔ ابھی تک وہ مفرور ہے اور ایک مفرور کو میں کیا رعائتیں دے سکتا ہوں۔''

وہ بولی۔ ''بس...... ہم آپ کی زبان سے یہی بات سننا مانگتا تھا۔ اب ہمیں یقین ہو گیا ہے کہ موسیٰ کو بے گناہ سمجھنے میں ہم اکیلا نہیں۔ اس کے کیس میں اتنی گنجائش موجود ہے کہ ابنارمل سمجھ کر اسے معاف کیا جاسکے۔''

کچھ دیر یہ گفتگو جاری رہی۔ پھر کرسٹی مجھ سے اجازت لے کر واپس چل دی۔ اس نے کہا۔

''انسپکٹر! ہم کو امید ہے موسیٰ جلد ہی مل جائیں گا۔ آپ کا محکمہ اسے ضرور ڈھونڈ نکالیں گا۔''

میں نے کہا۔ ''ہاں ضرور ڈھونڈ'' نکالیں'' گا۔''

وہ واپس چل دی۔ مجھے اس پر ایک خاص قسم کا شک ہو چکا تھا۔ وہ بہت ذہین اور گہری لڑکی تھی لیکن اپنی آنکھوں کی ایک خاص چمک مجھ سے چھپا نہیں سکی تھی۔ جونہی وہ تھانے سے باہر نکلی، میں نے ایک سادہ پوش ہیڈ کانسٹیبل کو اس کے پیچھے لگا دیا۔

اس کانسٹیبل نے مجھے تین گھنٹے بعد اپنی شکل دکھائی۔ وہ ہانپا اور گھبرایا ہوا تھا۔ کہنے لگا۔

''انسپکٹر صاحب! جلدی چلئے وہ انگریز لیڈی رام پور سے باہر جا رہی ہے۔ ایک بند مورس گاڑی میں وہ اسٹیشن سے باہر بیٹھی ہے اور اس کے ساتھ پتہ ہے آپ کو کون ہے؟''

''کون ہے؟''

''موسیٰ...... وہی چارفٹ کا بونا!'' کانسٹیبل نے انکشاف کیا۔

میرا شک درست نکلا تھا۔ میں نے فوراً ٹوپی رکھی اور بھاگتا ہوا اپنی جیپ میں آ بیٹھا۔ ہیڈ کانسٹیبل بھی میرے ساتھ تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم اسٹیشن پہنچ گئے۔ اسٹیشن کی عمارت سے باہر چند گاڑیاں کھڑی تھیں ان میں ایک کالے رنگ کی مورس بھی تھی۔ اس کی کھڑکیوں پر کپڑے کے پردے تھے۔ کانسٹیبل نے بتایا بریلی سے دہلی جانے والی گاڑی دو گھنٹے لیٹ ہے۔ مس کرسٹی اور موسیٰ اسی گاڑی کے انتظار میں ہیں۔ میں نے جیپ کچھ فاصلے پر روک دی پھر مختلف چیزوں کی اوٹ لیتا ہوا کار کے پاس پہنچا اور اچانک دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ گاڑی کی پچھلی نشست کا منظر میری آنکھوں کے سامنے آیا۔ کرسٹی گود میں ایک انگریزی رسالہ رکھے بیٹھی تھی۔ اس کے ساتھ ایک بونا تھا۔ وہ پتلون اور بند گلے کے سبز سویٹر میں تھا۔ رنگ سرخ و سپید اور شکل بونوں جیسی ہی تھی۔ میں اسے دیکھتے ہی پہچان گیا۔ وہ موسیٰ تھا۔ خطوں میں وہ اپنے آپ کو ب لکھتا تھا۔ شاید ان میں سے ایک ''ب'' کا تعلق اس کی پہلی محبت بانو سے تھا۔ سیمسن کی چھولداری میں مَیں اس کی تصویر دیکھ چکا تھا۔ کرسٹی کے ساتھ ساتھ موسیٰ کا چہرہ بھی خوف سے سفید پڑ گیا۔ وہ دونوں سکتے کی حالت میں مجھے دیکھتے جا رہے تھے۔

میں نے کہا۔ ''مس کرسٹی...... آپ ہوشیار ہیں لیکن کبھی کبھی ہوشیار لوگ بھی رنگے ہاتھوں پکڑے جاتے ہیں۔''

''ہم...... ہم تو آپ کے پاس۔ ہمارا مطلب ہے......'' وہ ہکلا کر رہ گئی۔

میں نے کہا۔ ''شاید آپ کا مطلب ہے کہ آپ دونوں گاڑی پر بیٹھ کر میرے پاس آ رہے تھے حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ جس گاڑی پر آپ سوار ہونے والے تھے۔ وہ میرے تھانے نہیں آتی دہلی جاتی ہے اور جہاں تک میرا اندازہ ہے آپ دہلی سے بھی آگے جا رہی ہیں شاید بمبئی تک اور پھر...... انگلینڈ تک۔''

کرسٹی کے پاس اب کہنے سننے کو کچھ نہیں رہا تھا۔ وہ شکست خوردہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ کچھ دیر گُم صُم رہنے کے بعد اس نے تمام صورتِ حال بتانے کا فیصلہ کر لیا۔ فکر مند لہجے میں رک رک کر اس نے مجھے جو کچھ بتایا اس کا خلاصہ یہ ہے۔ وہ موسیٰ کو قریباً دو ہفتے پہلے ڈھونڈ چکی تھی۔ موسیٰ شدید بخار اور نیم بے ہوشی کے عالم میں ایک مال گاڑی کی ویران بوگی میں پڑا تھا۔ اخبار کے ایک نمائندے نے اس کا سراغ لگایا۔ یہ نمائندہ کرسٹی کا قریبی جاننے والا تھا۔ اس نے پولیس میں اطلاع دینے کی بجائے کرسٹی کو بتایا اور کرسٹی نہایت خاموشی سے اسے اپنے گھر لے آئی...... اب موسیٰ کرسٹی کے ساتھ دہلی جا رہا تھا۔ وہ انگلینڈ

جانا چاہتی تھی۔ دوسرے لفظوں میں وہ دونوں اس وقت عازم انگلینڈ تھے۔

مجھے پوری کتھا سنانے کے بعد کرسٹی نے آبدیدہ نظروں سے موسیٰ کی طرف دیکھا۔

''آئی ایم سوری موسیٰ۔ ہم تُمہارا کوئی مدد نہیں کر سکا۔ ہم بہت شرمندہ ہے۔''

میں نے ان دونوں کو نیچے اتار لیا۔ ''اب کدھر کو جانا ہے؟'' کرسٹی نے پوچھا۔

''تھانے'' میں نے مختصر جواب دیا۔

''چلئے'' کرسٹی نے قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔ موسیٰ بھی ساتھ تھا۔

''سٹاپ'' میں نے کہا۔ ''تھانے میں اکیلا جاؤں گا۔ آپ دونوں پلیٹ فارم پر جائیں گے۔ میرا خیال ہے گاڑی آنے والی ہے۔'' میری نظریں کلائی کی گھڑی پر تھیں اور وہ دونوں بے پناہ حیرت سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ ''شکورے'' میں نے اپنے ہیڈ کانسٹیبل کو آواز دی۔ وہ بھاگا ہوا آیا۔ ''بی بی اور صاحب کا سامان پلیٹ فارم پر پہنچاؤ۔'' یہی وقت تھا جب اسٹیشن کے اندر اور باہر ہلچل نظر آئی۔ بریلی سے دہلی جانے والی گاڑی پہنچ گئی تھی۔ ''چلیں چلیں جلدی کریں'' میں نے ان دونوں سے کہا۔

مجھے حیرت زدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے وہ پلیٹ فارم کی طرف بڑھے۔ کرسٹی کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔ یہ احسان مندی کے آنسو تھے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ احسان میں نے نہیں اس نے مجھ پر کیا تھا۔ اس نے میرے ملک کے ایک ٹھکرائے ستائے ہوئے عجیب الخلقت شخص کو اپنی بانہوں کا سہارا دیا تھا اور ایک مثال قائم کی تھی جس کی نقل کرنا شاید کسی بھی مقامی لڑکی کے بس کی بات نہ ہو۔

دُلہن کے متلاشی کو آخر دلہن مل گئی تھی لیکن میں سمجھتا ہوں اس کامیابی میں ایک ایسے شخص کا ہاتھ بھی تھا جسے موسیٰ جانتا تک نہیں تھا اور جان بھی جاتا تو شاید اس کی کوشش پر یقین نہ کرتا۔ میرا مطلب ننکے خاں سے ہے۔ اس تیز طرار لڑکے نے جس طرح اپنی جان خطرے میں ڈال کر سراج کو سرِ بازار دبوچا تھا وہ منظر آج تک مجھے یاد ہے۔ بالکل شکاری کتے کی طرح وہ سراج کی ٹانگوں سے پیوست ہو گیا تھا۔ کاش ننکے خاں جیسے پیدائشی دلیر اور ہوشیار بچے صرف نیک گھرانوں میں پیدا ہوں تا کہ بہتر تربیت سے وہ غازی علم دین اور سرور شہید کا روپ دھار سکیں۔

☆======☆======☆

چھپی رستم

ایک ایسے ہوس کار بوڑھے کی شرمناک کہانی جو اقتدار کے اونچے سنگھاسن پر بیٹھ کر نوخیز کلیوں کا رس چوسنے کا عادی تھا۔ وہ حسن کی چراگاہ میں آزادانہ شکار کھیلتے کھیلتے انسپکٹر نواز خان کے سامنے آ گیا اور پھر ایک ایسی کہانی نے جنم لیا جو آپ کو چونکا دے گی۔

یہ بھی ایک یادگار کیس کی روئیداد ہے۔ یہ کیس بڑے دلچسپ انداز میں شروع ہوا۔ بلال شاہ بڑا بھنایا ہوا تھانے میں داخل ہوا اور کہنے لگا کہ اسے فوراً دو سپاہیوں کی ضرورت ہے۔

میں نے اس کا تمتمایا ہوا چہرہ دیکھ کر پوچھا۔ ''شاہ جی! کیا ضرورت پڑ گئی نفری کی؟''
کہنے لگا۔ ''ایک چور عورت کو گرفتار کرانا ہے۔ پاس ہی کپڑا مارکیٹ میں گھوم رہی ہے۔''

میں چندی گڑھ کے اس تھانے میں نیا نیا آیا تھا۔ کچھ اندازہ نہیں تھا کہ کپڑا مارکیٹ یہاں سے کتنی دور ہے، اور وہاں واقعی کپڑا بیچا جاتا ہے یا ہر قسم کی خرید وفروخت ہوتی ہے۔ بلال شاہ بعض اوقات بڑا جذباتی کام کر جاتا تھا جس کی وجہ سے اس کے ساتھ ساتھ مجھے بھی شرمندگی ہوتی تھی۔ میں نے تسلی کے لیے پوچھا۔

''آخر بات کیا ہے بلال شاہ۔ کسی سے جھگڑا وغیرہ تو نہیں ہو گیا۔''

وہ غرا کر بولا۔ ''میں آپ کو مجرم پکڑوا رہا ہوں اور آپ میری نیت پر شک کر رہے ہیں۔ بے حد افسوس کی بات ہے......''

شاید وہ کچھ اور بھی کہتا لیکن میں نے فوراً دو سپاہیوں کو اُس کے ساتھ روانہ کر دیا۔ وہ اندر ہی اندر کھولتا ہوا اور دندناتا ہوا سپاہیوں کے ساتھ باہر نکل گیا۔

قریباً پندرہ منٹ بعد دونوں سپاہی ایک عورت کو لیے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ یہ ایک فربہ اندام عورت تھی۔ بلال شاہ اُس کے آگے آگے یوں چل رہا تھا، جیسے عورت کوئی خطرناک قاتلہ ہو اور بلال شاہ ڈی ایس پی ہو جو اُسے رنگے ہاتھوں پکڑ کر یہاں لایا ہو۔ بلال شاہ کے ساتھ ایک بارہ چودہ سالہ لڑکا بھی تھا اُس کی پیشانی سے خون رِس رہا تھا۔

میرے قریب پہنچ کر بلال شاہ نے کھا جانے والی نظروں سے عورت کو دیکھا اور بولا۔

''خان صاحب! یہ ہے وہ عورت۔ اس نے دکان سے کپڑا چرایا ہے۔ دکان کا مالک یہ لڑکا آپ کے سامنے کھڑا ہے۔ بھگت سنگھ نام ہے اس کا۔''

میں نے بھگت سنگھ کو نظر انداز کرتے ہوئے غور سے عورت کو دیکھا۔ وہ درمیانے قد کی ایک خاصی صحت مند عورت تھی۔ بلال شاہ فربہ اندام ہونے کے باوجود اُس کے سامنے دبلا نظر آ رہا تھا۔ عورت کی عمر پینتالیس سال سے اُوپر رہی ہو گی۔ بے حد بوسیدہ کُرتے میں وہ اپنا بے حد صحت مند سینہ تانے شانِ بے نیازی سے کھڑی تھی۔

میں نے بلال شاہ سے پوچھا۔ ''کیا چرایا ہے اس نے؟''

بلال شاہ نے خود جواب دینے کی بجائے لڑکے کو اشارہ کیا۔ وہ بولا۔

''تھانیدار صاحب! کپڑا مارکیٹ میں ہماری دکان ہے۔ آج کل ہم رعائتی قیمت پر مال بیچ رہے ہیں۔ دکان سے باہر دو تخت پوش بچھا کر وہاں کٹ پیس رکھے ہوئے تھے۔ آج صبح سے بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ میں نے دیکھا اس عورت نے ایک ریشمی ٹوٹا لپیٹ کر اپنی چادر میں چھپا لیا۔ میں نے چادر ہٹانے کی کوشش کی تو یہ مجھے دھکے دینے لگی۔ میں گر گیا اور تخت پوش کا کونہ لگنے سے میرا سر پھٹ گیا۔ یہ دھکے دینے کے علاوہ مجھے گالیاں بھی دے رہی تھی۔ بعد میں یہ سب کو اپنی چادر کھول کھول کر دکھانے لگی کہ کہاں ہے کپڑا...... میرا خیال ہے اس نے کپڑا اپنی کسی ساتھی عورت کو دے کر وہاں سے رفو چکر کر دیا ہو گا۔ میرے پتا جی کہتے ہیں ایسی عورتیں اکیلی نہیں نکلتیں اُن کے ساتھ دوسری عورتیں بھی ہوتی ہیں......''

میں نے عورت سے پوچھا۔ ''کیوں مائی! یہ لڑکا سچ کہہ رہا ہے؟''

عورت نے پھٹی پُرانی چادر کے پلّو سے اپنی پسینہ پسینہ گردن پونچھی اور تحمل سے بولی۔

''تھانیدار جی ہر غریب عورت چور نہیں ہوتی۔ یہ دیکھو...... یہ میرے پاس پورے چار روپے تھے۔ میں سودا لینے آئی تھی۔ دغا کرنے نہیں آئی تھی اور میں نے کسی کو دھکے بھی نہیں دیئے۔ یہ لڑکا مجھ سے ہاتھا پائی کر رہا تھا اپنے ہی زور میں لکڑی کے چوکے پر جا گرا۔ آپ وہاں جا کر پوچھ سکتے ہیں......''

بلال شاہ غرایا۔ ''وہاں جا کر کیا پوچھنا ہے۔ سب کچھ میری آنکھوں کے سامنے ہوا ہے۔ خود میں نے دیکھا ہے تجھے سینہ زوری کرتے ہوئے۔ تیری تو شکل ہی بتاتی ہے کہ ایک نمبر ففے کٹن ہے تُو۔''

عورت نے کہا۔ ''دیکھ لو صاحب! یہ موٹا پھر میری زبان کھلوائے گا۔ سچ پوچھتے ہیں تو اس کی جگہ مجھے تھانے آنا چاہیے تھا۔ اسے کیا حق پہنچتا تھا میری چادر کھینچنے کا اور بال پکڑنے کا۔ یہ کون ہوتا ہے میری تلاشی لینے والا۔ تلاشی لینی ہے تو جا کر اپنی ماں بہن کی لے۔ میرا ہاتھ نہ توڑ دوں گی ایسے مشٹنڈے کے۔ بدذات کہیں کا۔ کہتا ہے میں پولیس کا بندہ ہوں۔ دُر فٹے منہ ایسے پولیس والے کا۔''

بلال شاہ چیخا۔ ''خان صاحب! یہ پھر بھونک رہی ہے، پھر گالی بک رہی ہے۔''

عورت مزید بھڑک کر بولی۔ ''تُو گالی کا کہہ رہا ہے، میرے بس میں ہو تو جوتے مار مار کر تیرا سر پولا کر دوں۔ تُو سمجھتا کیا ہے اپنے آپ کو حرامی۔''

عورت کی دیدہ دلیری حیران کُن تھی۔ میرے سامنے گالیاں کھا کر بلال شاہ کا رنگ اُڑ گیا۔ اُس نے ایک نظر میری طرف دیکھا پھر غصّے سے کانپنے لگا۔ ''میں تیری زبان کھینچ لوں گا کُتیا۔ تیری چمڑی ادھڑوا دوں گا۔''

''کُتیا ہو گی تیری ماں...... اور اُس کے ہوتے سوتے۔ تُو مجھے ہاتھ تو لگا میں تیرے اگلے پچھلوں کی ٹانگیں نہ تڑوا دوں تو نام بدل دینا۔''

بلال شاہ غصّے سے عورت پر جھپٹا۔ اُسے دو کانسٹیبلوں نے پکڑ لیا مگر عورت کو پکڑنے کی ضرورت نہ میں نے سمجھی اور نہ کسی اور نے۔ پتہ ہی نہیں چلا کب اُس نے ٹانگ اٹھا کر چپل ہاتھ میں لی اور پٹاخ سے بلال شاہ کی پیشانی پر دے ماری۔ اتنی موٹی عورت سے اتنی پھرتی کی توقع کسی کو نہیں تھی۔ چپل کھا کر بلال شاہ کا پارہ ساتویں آسمان کو چھو گیا۔ اُس نے دونوں کانسٹیبلوں کے درمیان سے جگہ بنا کر ٹانگ چلائی۔ مگر یہ وار رائیگاں گیا۔ عورت دوسری چپل اتارنے کی کوشش میں تھی جب میں نے جھپٹ کر اُسے تھام لیا۔ عورت کا ہاتھ تو میں نے روک لیا مگر اُس کی زبان میری گرفت میں آنے والی نہیں تھی۔ اُس نے ایک منٹ کے اندر اندر بلال شاہ کو اتنی گالیاں دے ڈالیں جو اُس نے ساری زندگی میں نہیں سنی ہوں گی۔ گالیوں کی رفتار اور کوالٹی دونوں کا جواب نہیں تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اُس بپھری ہوئی ہتھنی نے بلال شاہ کے رشتہ داروں سے ایسے ایسے رشتے جوڑ دیئے کہ...... بس کچھ نہ پوچھئے۔ جواباً بلال شاہ بھی گالیاں دے رہا تھا۔ مگر پتہ نہیں کیوں اس کی آواز باریک ہو گئی تھی اور لگتا تھا کہیں دور سے آ رہی ہے۔ گالیوں میں بھی کوئی خاص دم خم نہیں تھا...... آخر میں نے عورت کو ڈانٹ ڈانٹ کر چپ کرایا اور کانسٹیبل بھی موقعے کی نزاکت دیکھتے ہوئے بلال شاہ کو گھسیٹ گھساٹ کر دوسرے کمرے میں لے گئے۔

عورت چلا رہی تھی۔ ''حرامی تُو کیا سمجھتا ہے، عورت کمزور ہوتی ہے۔ بلونگڑے میں تجھ پر انگوٹھا رکھ دوں تو ہلا نہ جائے تجھ سے۔''

دوسرے کمرے سے بلال شاہ چلا رہا تھا۔ ''ساری عمر تجھ سے چکی نہ پسوائی تو بلال شاہ نام نہیں میرا۔ تُو تو کیا تیری اگلی نسلیں بھی اب جیل کے اندر پیدا ہوں گی۔''

عورت نے ہیجانی انداز میں سینے پر ہاتھ مارا۔ ''بلونگڑے، میرا نام بالی ہے۔ اگر اپنے باپ کا ہے تو شام تک مجھے تھانے میں رکھ کے دکھا دے...... ہے اپنے باپ کا؟''

بلال شاہ غرایا۔ ''ہاں اپنے باپ کا ہوں۔ میں دیکھوں گا اب تیری جان کیسے چھوٹتی ہے یہاں سے۔''

کافی دیر عورت اور بلال شاہ میں گرجدار مکالمے بازی ہوئی۔ عورت کی ظاہری حالت تو فقیروں جیسی تھی مگر وہ بولتی بڑے دھڑلے کے ساتھ تھی۔ گالی گلوچ کے مقابلے میں اُس نے بلال شاہ کو صاف ناک آؤٹ کر دیا تھا۔ ایسا کرتے ہوئے اُس نے میری پرواہ کی تھی اور نہ اس بات کی کہ وہ تھانے میں ہے اور اُس کا مدِمقابل یہ دعوے کر رہا ہے کہ وہ پولیس کا آدمی ہے۔ وہ مجھے بڑی ''چھپی رُستم'' قسم کی عورت لگی۔ شاید کسی بڑے آدمی سے اس کی واقفیت تھی یا کوئی اور سہارا تھا جس کے بل بوتے پر وہ یوں کھڑک دھڑک کر بلال شاہ سے متھا لگا رہی تھی۔

میں نے اُسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو مائی! یہ تھانہ ہے، تمہارے گھر کا صحن نہیں۔ ذرا زبان سنبھال کر بات کرو۔ ہمارے پاس ہر بندے کی ہر بیماری کا علاج ہوتا ہے۔ سمجھ میں آئی ہے میری بات۔''

وہ میری طرف توجہ ہی نہیں دے رہی تھی۔ اُس کا دھیان مسلسل بلال شاہ کی طرف تھا۔ دوسرے کمرے سے بلال شاہ کی جو بڑھک بھی سنائی دیتی تھی وہ اُس کا جواب بڑے چچے تُلے انداز میں دے دیتی تھی۔

کچھ دیر بعد یہ مکالمہ بازی ٹھنڈی پڑی تو میں دوسرے کمرے میں بلال شاہ کے پاس آیا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ بولا۔ ''خان صاحب! پرچہ کاٹو اس خبیث عورت کے خلاف۔ یہ چوری نہیں ہے ڈکیتی ہے۔ اس نے زخمی کیا ہے دکاندار کو۔ مجھے یقین ہے اس غنڈی کے پاس کوئی ہتھیار بھی ہو گا۔ مجھے تو یہ کوئی خطرناک گروہ لگتا ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے، ڈاکو عورتوں کا گروہ۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔

''بالکل'' بلال شاہ نے بے پناہ سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''آپ خود ہی سوچیں کیا کوئی

شریف عورت ایسے سینہ زوری کر سکتی ہے؟ ہرگز نہیں۔ آپ یقین کریں بازار میں یہ بدمعاشوں کی طرح بڑھکیں لگا رہی تھی۔ کہنے لگی......"

کچھ کہتے کہتے بلال شاہ چپ ہو گیا۔ "کیا کہنے لگی؟" میں نے زور دے کر پوچھا۔ بلال شاہ بات بدل گیا۔ یقیناً بازار والی بات دہرانے سے بلال شاہ کی شان میں فرق آتا ہوگا۔ پہلے ہی وہ میری موجودگی میں اس قسم کی باتیں سن چکا تھا کہ "کالے منہ والے سؤر میں تمہارا پیٹ پھاڑ دوں گی۔" یا "موٹے میں تیری آنتیں نکال کر گلے میں ڈال دوں گی۔" وغیرہ وغیرہ۔

میں نے کہا۔ "بلال شاہ! اتنا جذباتی ہونا ٹھیک نہیں۔ الزام وہ لگانا چاہیے جو ثابت کیا جا سکے۔ دو گز کپڑے کی چوری کو ڈکیتی قرار دینا کیا مناسب رہے گا؟"

وہ چیخ کر بولا۔ "اور اس دو ٹکے کی عورت نے میرے سر میں جو راکھ ڈالی ہے کیا وہ مناسب ہے۔"

میں نے کہا۔ "اس میں راکھ ڈالنے والی تو کوئی بات نہیں۔ اُس کی جوتی اگر تمہارے ماتھے پر لگ گئی ہے تو تم نے بھی تو اُس کے بال نوچے ہیں۔ گالیاں اُس نے دی ہیں تو تم نے بھی عورت جان کر اُسے معاف نہیں کیا۔ رہی چوری والی بات تو اُس کا پرچہ ہم کاٹ لیتے ہیں۔ جرم ثابت ہو گیا تو سزا سے بچ نہیں سکے گی۔"

بلال بولا۔ "کچھ بھی ہے خان صاحب! اس عورت کو آج تھانے سے باہر نہیں جانا چاہیے۔ کوئی بھی پیچھے آ جائے اس کے۔ آپ اس کی ضمانت نہیں لیں گے۔ یہ وعدہ کریں مجھ سے۔"

میں نے کہا۔ "بلال پیارے! تم سیانے بیانے آدمی ہو۔ عورت کو رات تھانے میں نہیں رکھا جا سکتا۔ یہ قانون کے خلاف ہے۔"

بلال شاہ نے بُرا سا منہ بنایا۔ "چھوڑیں جی! میں نے بڑی دیکھی ہیں اس جیسی بھوکی ننگی عورتیں تھانوں میں۔ دو دو مہینے کوئی پوچھنے نہیں آتا۔ کانسٹیبلوں اور سپاہیوں کے بستر گرم کرتی رہتی ہیں۔"

میں نے بلال شاہ کو گھور کر دیکھا۔ "مجھے تمہاری یہ بات اچھی نہیں لگی۔ کوئی کنویں میں گرے گا تو تم بھی گر جاؤ گے اور دوسری بات یہ بلال پیارے! کہ ہر خستہ حال کو بھوکا ننگا نہیں سمجھنا چاہیے۔ لوگ اوپر سے کچھ اور اندر سے کچھ ہوتے ہیں۔ مجھے تو یہ عورت بھی کسی بلا سے کم نہیں لگتی۔ دیکھا نہیں تھا کیسے سینہ پیٹ پیٹ کر دعوے کر رہی تھی اور ویسے بھی بات کو خواہ

مخواہ بڑھانا نہیں چاہیے۔ میں تم دونوں میں راضی نامہ کرا دیتا ہوں۔"

راضی نامے کا سن کر بلال شاہ یوں بدکا جیسے میں نے اُس کی دُم پر پاؤں رکھ دیا ہو فوراً اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ "یہ اچھی بات ہے خان صاحب! ماں بہن کی گالیاں کھا کر راضی ہو جاؤ۔ نہیں جی نہیں۔ میں تو اس عورت کو معاف نہیں کروں گا۔"

"پھر کیا کرو گے۔"

"میں نے کیا کرنا ہے۔ اسے حوالات میں بند کریں۔ کل اس کا ریمانڈ لیں اور زنانہ پولیس کے حوالے کریں اسے۔"

میں نے کہا۔ "کیا اس سے کم میں تسلی نہیں ہو سکتی؟"

"ہرگز نہیں۔"

"اگر وہ تم سے معذرت کرے۔ میرا مطلب ہے معافی مانگ لے۔"

"ہرگز نہیں۔ اگر آپ کچھ نہیں کر سکتے تو میں ہیڈ آفس جاؤں گا۔ ایس پی صاحب سے کہوں گا۔ آخر دس برس سے مخبر ہوں پولیس کا۔ کیا میری بے عزتی نہیں ہے؟"

اتنے میں تھانے سے باہر گاڑی رکنے کی آواز آئی۔ میں نے کھڑکی سے جھانکا۔ ایک جیپ میں سے ایک دراز قد خوش پوش آدمی نکل رہا تھا۔ میں نے اپنے کمرے میں پہنچ کر دراز قد شخص کو خوش آمدید کہا۔

وہ بولا۔ "میرا نام راجندر دوشی ہے۔ میں ایک مقامی فرم میں سیل منیجر ہوں۔" آواز سن کر ساتھ والے کمرے سے فربہ اندام عورت بھی آ گئی۔ دراز قد شخص کو دیکھ کر عورت کے چہرے سے شناسائی کے آثار نظر آئے۔ میں سمجھ گیا کہ یہ شخص عورت کو چھڑانے آیا ہے۔ تھوڑی سی حیرت بھی ہوئی کہ یہ خوش لباس شخص اس عورت کا واقف کار کیسے ہے۔ میں نے کہا۔

"اچھا...... تو آپ اس عورت کے لیے آئے ہیں۔"

"جی ہاں۔" اُس نے اعتماد سے کہا۔

"لیکن فی الحال میں اسے نہیں چھوڑ سکتا۔ اس پر چوری کا الزام ہے اور مجھے شبہ ہے کہ یہ مزید وارداتوں کا اعتراف بھی کرے گی۔"

راجندر دوشی بولا۔ "میں اس عورت کی طرف سے آپ کو ہر قسم کی ضمانت دے سکتا ہوں۔" میں نے دوشی کو تیز نظروں سے دیکھا۔ "کیا میں پوچھ سکتا ہوں، ملزمہ سے آپ کا کیا تعلق ہے؟"

وہ بولا۔ ''میرا کوئی تعلق نہیں لیکن اُن کا ہے جنہوں نے مجھے بھیجا ہے۔''

''کس نے بھیجا ہے؟''

''کیا میں ایک ٹیلی فون کر سکتا ہوں۔'' اُس نے میرا سوال نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

میں نے سیٹ اُس کی طرف بڑھا دیا۔ اُس نے ایک نمبر ڈائل کیا اور اپنا نام بتانے کے بعد ریسیور میری طرف بڑھا دیا۔ ''ہیلو'' میں نے ماؤتھ پیس میں کہا۔ دوسری طرف صوبے کی ایک اہم سیاسی شخصیت بول رہی تھی۔ یہ صوبائی اسمبلی کا وزیر تھا۔ نام آپ پر بودھ کمار تصور کر لیں۔ پر بودھ کمار نے اپنا تعارف کرانے کے بعد مجھے حکم دیا کہ زیر حراست عورت کو فوراً تسلی کر دوں۔ میں نے قانونی پوزیشن بتانے کی کوشش کی لیکن دوسری طرف وزیر کو گرجنے برسنے کا دورہ پڑ گیا۔ میں نے خاموش رہنا بہتر سمجھا۔ تھوڑی دیر بعد ''اے سی'' صاحب کی کال بھی آ گئی۔ حکم وہی تھا جو پہلے دیا جا چکا تھا...... میں نے رسمی کارروائی کرنے کے بعد فربہ اندام عورت کو راجندر دوشی کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی۔ میری رسمی کارروائی کے دوران وہ عورت خاموش بیٹھی یک ٹک مجھے دیکھتی رہی تھی۔ جیسے میری بیچارگی کا لُطف اُٹھا رہی ہو۔ جاتے وقت اس نے حسبِ عادت گردن اور چہرے سے پسینہ پونچھا اور خطرناک لہجے میں بولی۔

''کہاں ہے وہ تمہارا بلونگڑا!؟''

میں نے مسکرا کر کہا۔ ''اب کیا کہنا ہے اُسے؟''

وہ بدستور سنجیدہ لہجے میں بولی۔ ''بس محبت سی ہو گئی ہے اُس سے۔''

اُس کی باتوں سے عداوت کی بُو آ رہی تھی۔ میں نے ہنسی ہنسی میں بات ٹال دی اور اُسے واپس بھیج دیا۔

☆======☆======☆

تیسرے روز مجھے اطلاع ملی کہ بلال شاہ کو مشرقی تھانے والے پکڑ کے لے گئے ہیں اور انہوں نے اُسے خوب پھینٹی لگائی ہے۔ میں بھاگم بھاگ مشرقی تھانے پہنچا لیکن میرے پہنچنے سے پہلے ہی بلال شاہ رہا ہو کر گھر جا چکا تھا۔ تھانے والوں سے پتہ چلا کہ بلال شاہ کو پکڑنے اور مارنے کا کام سی آئی اے والوں نے کیا ہے۔ انہوں نے کل رات اُسے گرو مندر کے چوک سے مشتبہ حالت میں گھومتے پکڑا تھا۔ گرو مندر چوک کا نام سنتے ہی میں ساری بات سمجھ گیا۔ بلال شاہ سونے سے پہلے ایک سیر گرما گرم دودھ ضرور پیتا تھا۔ اکثر ذائقہ بدلنے کے لیے اُس میں جلیبیاں وغیرہ بھی ملا لی جاتی تھیں۔ یہ عیاشی گھر میں تو ہو نہیں سکتی

تھی۔ ایک بیوی اور دس بچوں کو دودھ جلیبیاں کھلا کر اپنا راستہ صاف کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ لہٰذا رات کا یہ آخری ناشتہ بلال شاہ دودھ دہی کی دکان پر بیٹھ کر کیا کرتا تھا۔ یہ عادت اب پختہ ہو چکی تھی۔ وہ جس جگہ بھی ہوتا رات کے ناشتے کے لیے دودھ دہی کی دکان ڈھونڈ لیتا تھا۔ چندی گڑھ میں یہ دکان بلال شاہ کے گھر سے کافی دور تھی۔ یعنی تقریباً ایک میل دور گرو مندر چوک میں۔ کل رات وہ گرو مندر چوک میں گیا تھا اور دودھ جلیبی کھانے سے پہلے یا بعد میں سی آئی اے والوں کے ہتھے چڑھ گیا تھا...... اطلاع ملتے ہی میں جان گیا تھا کہ یہ گرفتاری پرسوں والے واقعے کی کڑی ہے۔

میں واپس تھانے میں آیا تو بلال شاہ برآمدے میں موجود تھا۔ اس کی ایک آنکھ سوجی ہوئی تھی اور کرسی پر بیٹھنے کے انداز سے پتہ چلتا تھا کہ پھینٹی بھی خوب لگی ہے۔ ایک کانسٹیبل اس کا کندھا دبا رہا تھا، حوالدار پاس بیٹھا تسلی تشفی کی باتیں کر رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بلال شاہ کا تمتمایا چہرہ اور تمتما گیا۔ ''دیکھ لیں خان صاحب! آپ کی خاطر کیا کچھ سہنا پڑ رہا ہے۔ بس جیل جا کر پتھر توڑنے کی کسر رہ گئی ہے۔ میرا تو خیال ہے اب جیل کی سیر بھی کروا ہی دیں...... کچھ تو انعام ملنا چاہیے ناں ہماری خدمت گزاری کا۔ ڈاکوؤں اور قاتلوں کی مخبری کی ہے۔ اپنی جان خطرے میں ڈالی ہے در بدر کی خاک چھانی ہے۔ اب دس بارہ سال کی جیل بھی نہ ملے تو کیا فائدہ اس ساری بھاگ دوڑ کا......''

طنز کے تیر چلانے بلال شاہ کو خوب آتے تھے اور وہ اکثر چلاتا رہتا تھا۔ میں نے کانسٹیبل اور حوالدار کو باہر بھیج دیا اور اُس کے پاس آ بیٹھا۔ میں نے کہا۔ ''بلال شاہ، تمہیں کہا تھا ناں کہ یہ عورت مجھے زبردست شے لگتی ہے۔ تم نے میری بات نہ مانی اور خواہ مخواہ پھڈا ڈال لیا۔ وقت وقت کی بات ہوتی ہے۔ اس وقت ہو سکتا ہے وہ تم سے معافی بھی مانگ لیتی مگر تمہارا دماغ عرش پر پہنچا ہوا تھا۔''

بلال شاہ نے منہ بنایا۔ ''آپ مجھ سے ہمدردی جتانے آئے ہیں یا میرے زخموں پر نمک چھڑکنے۔ اگر آپ میری مدد نہیں کر سکتے تو خاموش رہیں۔ میں خود ہی نپٹ لوں گا اُس غنڈی سے۔ اب وہ رہے گی یا میں۔ لعنت ہے ایسی زندگی پر کہ آدمی ایک عورت سے مات کھا جائے۔'' بلال شاہ کا غصہ عروج پر تھا۔ ایسی حالت میں اس کی عقل گھاس چرنے چلی جاتی تھی۔

میں نے عام لہجے میں کہا۔ ''ٹھیک ہے جو دل چاہتا ہے کرو۔ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بتا دینا۔ ویسے ایک بات ذہن میں رکھنا، بُری عورت اگر نڈر بھی ہو تو اس سے بُرا کوئی نہیں

ہوتا۔"

"او چھوڑو جی! آپ تو ہمیشہ ایسی ہی باتیں کرتے ہیں۔ کسی کا بھی قصور ہو آپ کو میرا ہی قصور نظر آتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "دیکھو بلال شاہ۔ حق بات حق ہوتی ہے۔ تم نے بھی زیادتی کی ہے۔ حوالدار کرم دین نے مجھے سب کچھ بتایا ہے۔ تم نے پہلے عورت کی چادر کھینچی، پھر اُسے بالوں سے گھسیٹا اور لنگڑائی دے کر نیچے گرا دیا۔ لوگ تمہیں روک نہ لیتے تو تم شاید اُس کے اوپر ہی سوار ہو جاتے...... ٹھیک ہے تم پولیس کے لیے کام کرتے ہو لیکن پولیس بے لگام گھوڑا نہیں ہے۔ کچھ قانون قاعدے ہیں جن کے اندر رہ کر ہمیں کام کرنا ہوتا ہے۔"

"مجھے پتہ ہے جی سارے قانون قاعدوں کا۔" بلال شاہ نے بیزاری سے سر جھٹکا۔ "اُس وقت قانون قاعدے کہاں تھے جب وہ لڑکے کو مار رہی تھی اور میری ماں بہن ایک کر رہی تھی۔"

دوسرے لفظوں میں بلال شاہ تسلیم کر رہا تھا کہ اُس نے عورت کو باقاعدہ نیچے گرا کر اُس سے دنگل لڑنے کی کوشش کی تھی۔ اس وقت وہ غصے میں تھا لہٰذا میں نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔ قریب ہی اخبار پڑا تھا۔ میں اٹھا کر پڑھنے لگا۔ بلال شاہ اپنی جگہ بیٹھا "وِس گھولتا" رہا۔ دس پندرہ منٹ بعد میں نے اخبار رکھا تو بلال شاہ کا پارہ کافی درجے نیچے آ چکا تھا۔ دھیمی آواز میں کہنے لگا۔

"اگر آپ صلح کرانا چاہتے ہیں تو آج ہی کرا دیں ورنہ یقین کریں میں کچھ نہ کچھ کر بیٹھوں گا۔ زیادہ سے زیادہ پھانسی ہو جائے گی ناں۔ مجھے اس کی پرواہ نہیں ہے۔"

میں نے کہا۔ "لیکن مجھے تو پرواہ ہے۔ تمہیں پھانسی ہو گئی تو تمہارے "بچے" مجھے سنگسار کر دیں گے۔ یاد ہے ناں جب تم شملے چلے گئے تھے۔ تمہاری "قوم" میری دو ماہ کی ایڈوانس تنخواہ کھا گئی تھی۔ کھا گئی تھی یا نہیں؟"

بلال شاہ کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار نہیں ہوئی۔ مطلب یہ تھا کہ وہ کافی سنجیدہ ہے۔ اُس نے صلح کی جو پیشکش کی تھی اس سے دو باتوں کا پتہ چلتا تھا۔ ایک تو یہ کہ حوالات کی رات اس پر کافی "بھاری" گزری ہے اور دوسرے یہ کہ پھر ایسی ہی رات کے خدشات بلال شاہ کے اِردگرد منڈلا رہے ہیں۔ میں نے فیصلہ کیا کہ کسی بندے کو بیچ میں ڈال کر یہ معاملہ اب ختم کرا دینا چاہیے۔ بلال شاہ کے ساتھ جو کچھ ہوا اس سے زیادہ ہوتا تو میں برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

میرا ارادہ تھا کہ اگلے روز اُس عورت کا حدود اربعہ دریافت کر کے بلال شاہ سے اس کا راضی نامہ کرا دوں گا۔ مگر اگلے روز علی الصبح ایک اور مصیبت گلے پڑ گئی۔ یہ مصیبت انگریز ایس ایس پی والٹر نیل کی صورت میں تھی۔

ایس ایس پی والٹر ایک سخت مزاج اور اصول پسند افسر تھا۔ اُس میں کئی باتیں بہت خاص تھیں اور ان میں ایک خاص بات یہ بھی تھی کہ وہ سادہ لباس میں اچانک تھانوں کا دورہ کیا کرتا تھا۔ وہ بلائے ناگہانی کی طرح تھانے میں نازل ہوتا تھا اور پورے دن کے لیے جم کر بیٹھ جاتا تھا۔ بعض اوقات تھانے کے نچلے عملے کو بھی پتہ نہیں چلتا تھا کہ اندر والٹر صاحب آئے بیٹھے ہیں۔ اُس روز بھی یہی ہوا۔ علی الصبح ایس ایس پی آیا اور میرا کمرہ سنبھال کر بیٹھ گیا۔ پچھلے مہینے کی مکمل رپورٹ سننے کے بعد اُس نے کچھ فائلیں منگوائیں اور اُن کا مطالعہ کرنے لگا۔ پورے تھانے کو سانپ سونگھا ہوا تھا۔ عملے کو بیکار تو میں پہلے بھی نہیں بیٹھنے دیتا تھا لیکن آج وہ کچھ زیادہ ہی مصروف نظر آ رہا تھا...... دوپہر کے وقت اچانک وہی فربہ اندام عورت دندناتی ہوئی تھانے میں آ گھسی۔ اُس کے ساتھ دو سپاہی بھی تھے۔ میں برآمدے میں بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی عورت کی آنکھوں میں شرارت آمیز چمک نظر آئی۔ وہ آج بھی بوسیدہ لباس میں تھی اور بال فقیرنیوں کی طرح بکھرے ہوئے تھے۔ آتے ساتھ ہی بے تکلفی سے کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔

"وہ تمہارا مچھندر کہاں ہے؟" اُس نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ اُس کا اشارہ صاف طور پر بلال شاہ کی طرف تھا۔

"کیوں اب کیا کہنا ہے اُسے؟" میں نے بھی پوری سنجیدگی سے سوال کیا۔

وہ خطرناک انداز میں مسکرائی۔ "تمہیں اس سے کیا۔ یہ عاشق معشوق کا معاملہ ہے۔"

میں نے کہا۔ "میرا خیال ہے کافی محبت ہو گئی ہے اُس سے۔ اب یہ کھیل بند نہ کیا جائے؟"

وہ میرے لہجے سے اثر قبول کیے بغیر بولی۔ "ہم سائیں لوک ہیں جس سے لَو لگاتے ہیں پکی لگاتے ہیں۔"

میں نے پوچھا۔ "اب کیا خطا ہوئی ہے اُس سے؟"

وہ بولی۔ "کوئی تازہ خطا تو نہیں ہوئی۔ وہی اُس روز والی بات ہے۔ تمہارے مچھندر نے مجھ سے ہاتھا پائی کی تھی۔ اس ہاتھا پائی میں میرے گلے سے ایک تسبیح ٹوٹ گئی ہے۔ دو دن تو مجھے پتہ ہی نہیں چلا آج پتہ چلا ہے تو تمہارے پاس آ گئی ہوں۔"

"کس لیے آ گئی ہو؟"

"میرا خیال ہے وہ تسبیح تمہارے مچھندر کے پاس ہے۔"

میں نے کہا۔ "دیکھو بی بی! فضول باتوں کے لیے میرے پاس وقت نہیں۔ اور اس کے علاوہ تم اپنے لہجے کو ذرا قابو میں رکھو۔ نام بگاڑ کر بولنا کوئی شریفانہ کام نہیں ہے۔"

وہ میرے غصّے کو بالکل نظر انداز کر کے بولی۔ "وہ کوئی معمولی تسبیح نہیں تھی۔ اُس میں امام اور دونوں محراب سونے کے تھے۔ دو سو سے کم قیمت نہیں تھی۔ کسی نے نذر کی تھی مجھے۔"

میں نے حیران ہو کر کہا۔ "تمہارے پاس تسبیح کا کیا کام۔ کیا اُس پر گالیوں کا وِرد کرتی ہو۔"

وہ درویشانہ انداز میں بولی۔ "فقیرنی کی زبان نہ کھلواؤ تو اچھا ہے۔ بند مٹھی لکھ کی اور کھلی لکھ کی...... تم بس اپنے مچھندر کا پتہ بتاؤ۔ میں نے اُسے ساتھ لے کے جانا ہے۔"

شومئی قسمت اتنے میں بلال شاہ بھی لنگڑاتا ہوا ایک کمرے سے برآمد ہو گیا۔ بلال کو دیکھتے ہی عورت کی آنکھوں میں عداوت کی چمک نمودار ہوئی۔ دوسری طرف بلال شاہ کا رنگ بھی زرد ہو گیا۔ میرا کہنا صحیح ثابت ہو رہا تھا۔ یہ خستہ حال عورت بلا بن کر بلال شاہ کو چمٹ گئی تھی۔ میں نے بلال شاہ کو قریب بلایا اور اُس سے تسبیح یعنی "مالا" کے بارے میں پوچھا۔ بلال شاہ نے صاف انکار کر دیا۔ عورت لاپرواہی سے بولی۔

"تھانیدار جی! تم کیا تفتیش کرنے بیٹھ گئے ہو۔ تم بس بندہ تور (بھیج) دو۔ پوچھنے والے خود ہی پوچھ لیں گے۔" عورت کا اشارہ سی آئی اے سٹاف کی طرف تھا۔ بلال شاہ کے ماتھے پر پسینہ چمکنے لگا۔

میں نے کہا۔ "اگر بندہ نہ بھیجنا ہو تو؟"

وہ بولی۔ "کیسے نہیں بھیجو گے، میں تو لے کے جاؤں گی۔"

"تم کون ہو؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولی۔ "میں وہی ہوں جسے پرسوں تم نے ہاتھ باندھ کر چھوڑا تھا۔ اگر اب بھی پہچان نہیں ہوئی تو میں کروا دیتی ہوں۔ تم جیسے تمام بڑے تھانیداروں کو میرا نام یاد ہو چکا ہے۔"

نہ جانے اس عورت کا واسطہ کیسے پولیس والوں سے پڑتا رہا تھا۔ میرا دل چاہا کہ اب میں بھی اسے اپنی پہچان کرا ہی دوں لیکن مسئلہ یہ تھا کہ ایس ایس پی اندر بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کی موجودگی میں تھانے کے اندر کوئی ہنگامہ ہوتا تو ٹھیک نہیں تھا۔

میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "میں اس وقت مصروف ہوں، تم تھوڑی دیر بعد آنا۔ پھر

اس بارے میں بات کر لیتے ہیں۔"

"تھوڑی دیر بعد آؤں، تا کہ تم اس مچھندر کو یہاں سے چلتا کر دو۔" وہ بلال شاہ کے منہ پر اُسے مچھندر کہہ رہی تھی اور بلال شاہ خوف اور غصّے سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ اسی جگہ عورت کا باریک قیمہ بنا دیتا۔

میں نے کہا۔ "میری بات کا بھروسہ رکھو۔ یہ بندہ کہیں نہیں جائے گا۔"

وہ بے خوفی سے بولی۔ "میں کالے چور کی زبان پر بھروسہ کر سکتی ہوں، تھانیدار کی زبان پر نہیں۔"

میں نے غصّے کا ایک نہایت کڑوا گھونٹ بھرا اور آواز کا دھیما پن برقرار رکھتے ہوئے کہا۔ "تو ٹھیک ہے یہیں بیٹھی رہو۔ میں فارغ ہو جاؤں تو اس کے بارے میں فیصلہ کر لیتے ہیں۔"

دونوں سپاہی اُس کی شہہ پر تھے۔ ایک مونچھ بردار بولا۔ "فیصلہ کیا کرنا ہے زناب۔ آپ بندے کو بھیجنے والی بات کریں۔ اوپر سے بڑا سخت آرڈر آیا ہوا ہے۔"

میں نے پتہ نہیں کس طرح خود پر جبر کر رکھا تھا۔ عورت نے دوٹوک لہجے میں کہا۔

"ایک بات کرو تھانیدار جی...... بندے کو بھیجنا ہے یا نہیں۔"

یہ رویہ میرے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ بہر طور تھانے میں دنگے فساد سے بچنے کے لیے میں نے یہ سب کچھ برداشت کیا اور آنکھوں آنکھوں میں بلال شاہ کو تسلی دے کر کہا۔

"ٹھیک ہے بلال شاہ! تم ان کے ساتھ چلے جاؤ۔"

اس کے ساتھ ہی میں اُٹھ کر اندر آ گیا۔ ایس ایس پی بدستور فائلیں دیکھ رہا تھا۔ یہ فائلیں ختم ہونے تک میں یہاں سے اُٹھ نہیں سکتا تھا۔ کیونکہ مجھے گاہے بگاہے مختلف سوالوں کا جواب بھی دینا ہوتا تھا۔ جونہی ایس ایس پی نے آخری فائل بند کی، میں نے ایک ضروری کام کا بہانہ بنا کر اُس سے دو گھنٹے کی رخصت مانگی اور احاطے سے اپنی موٹر سائیکل لے کر "سی آئی اے" سٹاف روانہ ہو گیا۔ مجھے یقین تھا کہ ابھی بلال شاہ سے پوچھ گچھ شروع نہیں ہوئی ہو گی۔ بڑی سڑک پر آتے ہی میں نے موٹر سائیکل کی رفتار چالیس تک پہنچا دی۔ میرے دماغ میں انگارے سے دہک رہے تھے۔ یہ عورت میرے اندازوں سے زیادہ خبیث ثابت ہو رہی تھی۔ اب اس کی اینٹ کا جواب پتھر سے دینا ضروری ہو گیا تھا۔ اپنے آپ میں کھولتا ہوا جب میں جنرل پوسٹ آفس کے قریب پہنچا اچانک میری نظر بلال شاہ پر پڑی وہ ایک تانگے میں بیٹھا واپس آ رہا تھا۔ میں نے آواز دے کر اُسے روکا اور موٹر سائیکل موڑ کر پاس پہنچ گیا۔ میرا حیران

ہونا لازمی تھا۔

میں نے پوچھا۔ "تم کب آئے؟"

"کہاں سے؟" اُس نے پوچھا۔

"سی آئی اے سے۔"

"وہاں تو وہ مجھے لے کے ہی نہیں گئے۔"

"تو کہاں لے کر گئے۔"

"گرومندر چوک میں۔ پہلے گنّے کا رس پلایا، پھر کھیر کھلائی، پھر کرایہ دے کر واپس بھیج دیا۔ وہ حرام زادی کہہ رہی تھی بس تجھے یہ بتانے کے لیے لائی ہوں کہ جب چاہوں تجھے اپنے ساتھ لے جاسکتی ہوں۔"

میں نے بلال شاہ کو موٹر سائیکل پر بٹھایا اور واپس تھانے آگیا۔ راستے بھر بلال شاہ خاموش رہا۔ میں نے بھی کوئی بات نہیں کی۔ بلال شاہ کی خاموشی میرے دل پر اثر کر رہی تھی۔ میں نے دل ہی دل میں فیصلہ کرلیا کہ اُس منہ زور عورت کو مناسب سبق سکھانا ہے۔

☆======☆======☆

اپنے ایک ہوشیار اے ایس آئی انور باجوہ کو میں نے ذمے داری سونپی کہ وہ اس آفت کی پرکالی عورت کا کھوج لگائے اور پتہ کرے کہ وہ کس باغ کی مولی ہے۔ انور باجوہ ایسے کاموں میں خاصا ماہر سمجھا جاتا تھا۔ شکل وصورت سے بالکل پولیس والا نہیں لگتا تھا۔ آواز بھی بڑی مسکین سی پائی تھی لیکن دماغ افلاطون کا تھا۔ اُس نے ٹھیک تین روز بعد مجھے عورت کے بارے میں رپورٹ دے دی۔ یہ رپورٹ ہر لحاظ سے مکمل تھی۔ خلاصہ کچھ اس طرح تھا۔

عورت کا اصل نام فصیحت بی بی تھا۔ وہ چندی گڑھ کی ایک متوسط آبادی میں رہتی تھی۔ گلی محلّے میں اُسے عام طور پر "باجی جان" کہا جاتا تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ یہ نام عزت کی وجہ سے لیا جاتا تھا۔ بس نام ہی یہ پڑ گیا تھا۔ دو سال کے بچے بھی اُسے باجی جان ہی کہتے تھے۔ فصیحت یا باجی جان کو چندی گڑھ میں آئے تین چار مہینے ہی ہوئے تھے لیکن اس دوران وہ خاصی مشہور ہوگئی تھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ غصیلی بھی بہت تھی۔ گالیاں دینے پر آتی تو رکنے کا نام نہیں لیتی تھی۔ کچھ لوگ اُسے بہت اچھا سمجھتے تھے اور کچھ بہت ہی بُرا۔ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ باجی جان کہاں سے آئی ہے۔ اس کا آگا پیچھا کیا ہے، وہ کن حالات میں یہاں پہنچی ہے۔ سب سے پہلے اُسے ایک مقامی پیر "بخشی جان" کے مزار پر دیکھا گیا تھا۔ وہاں سے ٹیلر ماسٹر علی احمد کے گھر پہنچ گئی تھی۔ علی احمد "باجی جان" کو بڑی بہن کا درجہ دیتا تھا اور اُس کی جواں سال

لڑکی فرحت اُسے خالہ کہتی تھی۔ اب وہ علی احمد کے مکان میں گھر کے فرد کی طرح رہ رہی تھی۔ علی احمد کی بیوی چند ماہ پہلے ہیضے کا شکار ہو چکی تھی اور وہ خود بھی کچھ علیل رہتا تھا۔

میں نے اے ایس آئی باجوہ سے پوچھا کہ فصیحت نام کی اس عورت کے تعلقات اُوپر کے لوگوں سے کیسے ہوگئے ہیں۔ باجوہ نے جواب دیا۔

"چندی گڑھ میں تو کوئی افسر میرے علم میں نہیں آیا جو اس عورت کو خاص طور پر جانتا ہو۔ نہ ہی وہ کسی کے پاس آتی جاتی ہے۔ عام لوگوں سے واسطہ ہے اس کا۔"

میں نے کہا۔ "پھر اُس کے لیے جمنا انڈسٹری کا منیجر کیوں بھاگا آیا تھا اور صوبائی وزیر کو کیا ضرورت تھی سفارش کرنے کی۔"

باجوہ بولا۔ "ہوسکتا ہے وہ جہاں سے آئی ہے وہاں اُس کے تعلقات ہوں۔ وہ جھاڑ پھونک کرتی ہے اور کمزور عقیدے کے لوگ تو ہر جگہ موجود ہوتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "کچھ تو کھوج ملا ہوگا کہ اس کا تعلق کس علاقے سے ہے۔"

باجوہ نے کہا۔ "بس اتنا اشارہ ملا ہے کہ وہ کسی پہاڑی علاقے کی رہنے والی ہے۔ کیونکہ سب سے پہلے جب اُسے "بخشی جان" کے مزار پر دیکھا گیا تھا تو وہ ایسے لباس میں تھی جو پہاڑی علاقوں میں پہنا جاتا ہے۔ یہ بات مجھے مزار کے ایک خادم نے بتائی تھی۔ اُس کا کہنا ہے ہوسکتا ہے عورت کا تعلق ڈلہوزی یا چمبا وغیرہ سے ہو۔"

باجوہ کی یہ بات میرے دل کو لگی۔ فصیحت کے لب و لہجے میں ہلکا سا پہاڑی پن پایا جاتا تھا۔ اس کی صحت بھی بعض پہاڑنوں کی طرح دیکھنے کے لائق تھی۔ سب سے بڑی بات یہ کہ جس صوبائی وزیر کا فون مجھے آیا تھا اُس کا تعلق بھی ڈلہوزی کے علاقے سے تھا...... باجوہ کی حاصل کی ہوئی معلومات کے بعد فصیحت نامی یہ عورت مزید پُراسرار ہوگئی تھی۔ میں نے دل میں تہیہ کرلیا کہ جیسے بھی ہو اِس عورت کا اَتہ پتہ معلوم کرنا ہے۔

اُسی روز شام کے وقت ایک ایسا واقعہ رُونما ہوگیا جس کے سبب فصیحت یا باجی جان سے ہمارا "تعلق" اور مضبوط ہوگیا۔ وہ ایک نیم گرم شام تھی۔ میں تھانے کے برآمدے میں ٹیبل فین لگائے بیٹھا تھا۔ بلال شاہ اپنے بیمار کان میں دوائی ڈال کر پچھلے کمرے میں سویا ہوا تھا۔ اُس کے خراٹے پورے تھانے میں گونج رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی شیر دھاڑ رہا ہے۔ اچانک تھانے کے دروازے پر گوشت کا پہاڑ نمودار ہوا۔ میرا خیال ہے آپ سمجھ گئے ہوں گے۔ میں فصیحت کا ذکر کر رہا ہوں۔ وہ چاق وچوبند ہتھنی کی طرح تھل تھل کرتی میرے پاس آئی اور بڑے اعتماد سے کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔ سنتری میرے قریب کھڑا تھا۔ فصیحت

نے ہاتھ کے اشارے سے سنتری کو حکم دیا کہ وہ باہر جائے۔ سنتری نے ایک سوالیہ نگاہ مجھ پر ڈالی اور پھر باہر چلا گیا۔ فصیحت نے حسبِ عادت اپنے سُرخ وسفید چہرے کا پسینہ بوسیدہ چادر سے پونچھا اور بولی۔

''تھانیدار جی! تمہیں ایک کام کرنا ہے۔''

''جی فرمایئے۔'' میں نے کہا۔

میرے طنزیہ انداز پر ایک لمحے کے لیے اس کی تیوری چڑھ گئی لیکن پھر اس نے خود پر قابو پایا اور تحکمانہ لہجے میں بولی۔ ''ابھی تھوڑی دیر بعد دوعورتیں تمہارے پاس آئیں گی۔ ایک میری عمر کی ہوگی دوسری لڑکی۔ لڑکی نے سفید ساٹن کا برقع اوڑھ رکھا ہوگا۔ لڑکی تم سے شکایت کرے گی کہ باسط نامی ایک نوجوان نے اُسے حبسِ بے جا میں رکھا ہے اور زیادتی کی ہے۔ باسط نامی یہ لڑکا ایشور کالونی کا رہنے والا ہے۔ اُس کا مکمل ایڈریس تمہیں لڑکی اور اس کی ماں بتا دیں گی۔ تم سپاہی بھیج کر لڑکے کو تھانے میں بلا لینا۔ میں چاہتی ہوں کہ تم لڑکے کو اتنا ڈرا دھمکا دو کہ وہ پھر ایسی حرکت کا خیال بھی دل میں نہ لائے۔ اگر ضرورت سمجھو تو اُسے ہلکی پھلکی مار بھی لگا دو لیکن اس معاملے کی رپورٹ درج نہیں ہونی چاہیے۔ کل اسی وقت میں آؤں گی میری ضمانت پر لڑکے کو چھوڑ دینا...... لڑکی اور اس کی ماں کا معاملہ بھی میں خود ہی سنبھال لوں گی۔''

میں سناٹے کی کیفیت میں بیٹھا فصیحت کی بکواس سن رہا تھا۔ چودہ پندرہ سالہ سروس میں یہ پہلا تجربہ تھا کہ کوئی مجھ سے اس لہجے میں بات کر رہا تھا، اور ایسی بے باکی سے مجھے بددیانتی کا سبق پڑھا رہا تھا...... درحقیقت یہ بڑی دلچسپ صورتِ حال تھی۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے، میں اس تھانے میں نیا نیا آیا تھا۔ بیشتر لوگوں کو معلوم ہی نہیں تھا کہ میں کس مزاج کا آدمی ہوں۔ خاص طور پر ''باجی جان'' کو تو میرے بارے میں زبردست خوش فہمی ہو چکی تھی۔ اپنے خیال میں اُس نے مجھے پوری طرح نیچے لگا لیا تھا۔ وہ نہ صرف میرے بندے کو چھینٹی لگوا چکی تھی بلکہ پانچ چھ روز پہلے اُسے میرے تھانے سے زبردستی اپنے ساتھ لے جا چکی تھی۔ یہ آخری کارروائی اس کے نزدیک کسی بڑے کارنامے سے کم نہیں تھی...... اُسے معلوم نہیں تھا کہ وہ یہ ''کارنامہ'' کیونکر انجام دے سکی ہے۔ اگر اُس روز اندر کمرے میں ایس ایس پی نہ بیٹھا ہوتا اور مجھے اُس کی خاطر داری منظور نہ ہوتی تو پانچ منٹ کے اندر اندر ''باجی جان'' کے غبارے سے ہوا نکل جاتی۔ بلال شاہ کو لے جانا تو دور کی بات ہے وہ خود بھی زنانہ پولیس کے ہاتھوں سے اپنی چمڑی نہ بچا سکتی۔ بہرحال اب وہ پوری طرح اکڑی ہوئی تھی اور مجھ سے یوں

گفتگو کر رہی تھی جیسے وہ تھانیدار ہے اور میں ایک ادنیٰ سپاہی کی حیثیت سے اُس سے بات کر رہا ہوں۔ اس موقع پر میں اپنی تھانیداری دکھاتا تو مجھ سے بڑا بیوقوف کوئی نہ ہوتا۔ یہ دانہ پھینکنے کا وقت تھا کیونکہ شکار (جو خود کو شکاری سمجھ رہا تھا) خودبخود جال کی طرف آ رہا تھا۔ عقل مندی کا تقاضا تھا کہ وہ جس راستے پر مجھے لگا رہی ہے میں خاموشی سے لگ جاؤں۔ لڑکے لڑکی کا معاملہ یقیناً پُراسرار تھا اور ممکن تھا اس معاملے کی وجہ سے ''باجی جان'' کے متعلق بھی کوئی اہم انکشاف ہو جائے۔ میں نے پہلے تو ذرا پس و پیش سے کام لیا پھر باجی جان کی خواہش کے آگے سرِتسلیم خم کر دیا۔

وہ مجھے پوری بات سمجھانے کے بعد جس طرح آئی تھی اُسی طرح اچانک واپس چلی گئی۔ ابھی اُسے گئے دس منٹ ہی ہوئے تھے کہ دوعورتیں اندر داخل ہوئیں ان میں ایک چادر پوش تھی اور دوسری برقع پوش۔ برقع پوش چال ڈھال سے نوجوان لڑکی لگتی تھی۔ دونوں عورتیں تیزی سے اندر داخل ہوئی تھیں۔ چادر پوش عورت نے کہا۔

''انسپکٹر صاحب! میں آپ سے اکیلے میں بات کرنا چاہتی ہوں۔''

میں نے پاس کھڑے دو کانسٹیبلوں کو باہر بھیج دیا اور دروازہ بند کر دیا۔ دروازہ بند ہوتے ہی لڑکی نے نقاب الٹ دیا۔ وہ ایک خوبصورت چہرہ تھا لیکن اُس کی پہلی جھلک نے ہی مجھے سمجھا دیا کہ لڑکی کا تعلق کسی شریف گھرانے سے نہیں۔ یہی بات ادھیڑ عمر عورت کے بارے میں کہی جا سکتی تھی۔ عورت اور لڑکی دونوں غصّے میں بھری نظر آتی تھیں۔ عورت نے لرزاں آواز میں کہا۔

''انسپکٹر صاحب! آج میری لڑکی کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے۔ اس کے بعد میں خودکشی کر لیتی تو بہتر تھا۔ یہ دیکھئے...... یہ دیکھئے اُس درندے نے کیا حال کیا ہے میری معصوم بچی کا۔''

ایک جھٹکے سے اُس نے لڑکی کا بالائی برقع اتار پھینکا۔ لڑکی کا گریبان ادھڑا ہوا تھا۔ گردن پر خراشیں تھیں۔ عورت کڑک کر بولی۔ ''ہم ناچنے گانے والے ضرور ہیں لیکن پیشہ ور نہیں۔ ہماری شرافت کی گواہی پورا شہر دے سکتا ہے۔ اگر کوئی میری لڑکیوں میں برائی ثابت کر دے تو میں اپنے ہاتھوں سے اپنا سر کاٹ لوں۔ اس خبیث نے میری ناسمجھ بچی کو ورغلایا اور آج اس کا یہ حال کیا کہ وہ اپنے قدموں پر چل کر تھانے بھی نہ آ سکتی تھی۔ ہمارے ساتھ تو جو ہونا تھا ہو چکا اب میں اُس بدمعاش کو پھانسی کے تختے پر چڑھا کر چھوڑوں گی۔''

میں نے کہا۔ ''بی بی! یوں واویلا کرنے سے فائدہ نہیں۔ مجھے اس طریقے سے بات بتاؤ کہ میں سمجھ بھی سکوں۔ کون ہے وہ شخص اور کہاں رہتا ہے؟''

عورت نے کہا۔ ”اُس کا نام باسط علی ہے۔ یہاں قریب ہی ایشور کالونی میں رہتا ہے۔ بازارِ حسن میں آتا جاتا رہتا ہے۔ دو تین ماہ سے ہمارے چوبارے پر بھی آرہا تھا۔ آج میں اور میری بچیاں رام مندر پر پھول پانی چڑھانے گئی تھیں۔ صرف کرن گھر میں تھی۔ اُس خبیث کو معلوم تھا کہ ہم ہر مہینے دوسرے شوکروار ”رام مندر“ پر پھول پانی چڑھانے جاتے ہیں۔ وہ موقعہ تاڑ کر میرے گھر گھس آیا۔ گھر میں ایک بوڑھی اماں کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ کرن بالائی کمرے میں سو رہی تھی۔ وہ شراب کے نشے میں دُھت اس پر جا پڑا اور نوچنے کھسوٹنے لگا۔ میری بچی نے دہائی مچائی تو ماں زادے نے اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ حرامی سے جو بھی ہو سکا اُس نے کیا ہے، اب مجھ سے بھی جو ہوگا میں کروں گی۔“

خدانخواستہ میرے سامنے کوئی شریف عورت بیٹھی ہوتی تو میں اس موقع پر بالکل خاموش رہتا بلکہ شاید آنکھ بھی نہ اٹھا سکتا لیکن مجھے معلوم تھا یہ کس قماش کی عورتیں ہیں اور ان کی باتوں میں کتنا ہیر پھیر ہو سکتا ہے۔ میں نے وقوع کی اصل حقیقت جاننے کے لیے کہا۔
”بی بی! کیا میں تمہاری بات سے یہ مطلب لوں کہ باسط نامی شخص نے تمہاری بیٹی پر مجرمانہ حملہ کیا ہے۔“

وہ غصّے سے بولی۔ ”مجرمانہ حملہ اور کیا ہوتا ہے......؟ آپ مہربانی کر کے رپورٹ لکھیں۔ ہمیں اور ذلیل مت کریں۔“

میں نے کہا۔ ”بی بی! اگر سائل بن کر تھانے آگئی ہو تو اب ذرا حوصلہ پیدا کرو۔ عدالت میں ہر بات کھول کر پوچھی جاتی ہے۔ وہاں تمہیں بتانا ہوگا کہ تمہاری بیٹی پر دست درازی ہوئی ہے یا مجرمانہ حملہ ہوا ہے اور یہی بات مجھے رپورٹ میں بھی لکھنا پڑے گی۔“

وہ غرا کر بولی ”تم دیکھ نہیں رہے میری بچی کی کیا حالت ہو رہی ہے۔ کیا اب کچھ اور پوچھنا باقی ہے؟“

میں نے لڑکی سے کہا۔ ”بی بی! تم بتاؤ مجرمانہ حملہ ہوا ہے کہ نہیں۔ ہاں یا نہ میں جواب دے دو لیکن یاد رہے ابھی طبّی معائنہ ہوگا اور پولیس سرجن سے کوئی بات چھپی نہیں رہے گی۔“

طبّی معائنے اور سرجن وغیرہ کا ذکر سن کر نو عمر لڑکی تھوڑا سا بدک گئی۔ اُس نے ایک نظر ماں کی طرف دیکھا پھر بڑے غصّے سے بولی۔ ”اُس نے میرے ساتھ بڑا بُرا سلوک کیا ہے۔ تھپڑ مارے ہیں، سارے کپڑے پھاڑ ڈالے ہیں، اُٹھا اُٹھا کر پٹخا ہے......اگر اگر میں شور نہ مچاتی تو پتہ نہیں کیا ہو جاتا۔“

میں نے اطمینان کی طویل سانس لی۔ لڑکی کی باتوں سے پتہ چلتا تھا کہ اور کچھ ہوا ہو تو ہوا ہو مگر اسے ”ریپ“ نہیں کیا گیا۔

لڑکی کی ماں یا نائیکہ جو بھی تھی تیزی سے بولی۔ ”انسپکٹر! تم بس اُس حرامی کے خلاف پرچہ کاٹو۔ میں اُسے جیل کی ہوا کھلا کر رہوں گی۔“

میں نے بڑے خشوع وخضوع کے ساتھ عورت کو صبر کی تلقین کی اور لڑکے کا نام پتہ پوچھ کر دو کانسٹیبلوں کو اندر بلایا۔ وہ غالباً دروازے سے لگے یہاں کی گفتگو سن رہے تھے۔ ان کی چور نظریں بار بار لڑکی کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔ میں نے دونوں کانسٹیبلوں کو ہدایت کی کہ وہ ایک رائفل مین کو ساتھ لے جائیں اور ایشور کالونی کی گلی نمبر فلاں اور مکان نمبر فلاں سے مسمّی باسط علی ولد سراج دین کو پکڑ کر تھانے لے آئیں۔ اور اگر وہ وہاں نہ ملے تو فلاں فلاں جگہ پر اُسے تلاش کریں۔

باسط علی کے دیدار کے لیے مجھے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ قریباً پون گھنٹے بعد کانسٹیبل ایک مدہوش نوجوان کو تانگے سے اتار کر تھانے میں لے آئے۔ نوجوان کا رنگ گندمی، نقوش تیکھے اور قد نکلتا ہوا تھا۔ اس کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی اور میلے لباس پر پان کے چھینٹے تھے۔ جونہی نوجوان کے لڑکھڑاتے قدم کمرے میں پڑے ادھیڑ عمر نائیکہ چیل کی طرح اس پر جھپٹی۔ اگر میں بروقت مداخلت کر کے اُسے روک نہ لیتا تو وہ اپنے ناخنوں سے باسط علی کے چہرے پر پانچ دریاؤں کا انمٹ نقشہ بنا دیتی۔ وہ اُسے خطرناک دھمکیوں کے ساتھ دنیا جہان کی گالیاں بھی دے رہی تھی۔ میں نے بمشکل اُسے قابو کیا اور کانسٹیبل کے ساتھ دوسرے کمرے میں بھیج دیا۔

لڑکے سے تنہائی میں پوچھ گچھ شروع کی۔ وہ نشے میں دھت تھا۔ کوئی کام کی بات اُس کی زبان سے نہیں نکل رہی تھی۔ ”میں نے کچھ نہیں کیا......کچھ نہیں کیا۔“ وہ بار بار کہہ رہا تھا۔ کبھی وہ ہاتھ جوڑ کر کسی ”فری“ نام کی لڑکی سے معافیاں مانگنے لگتا۔ ”مجھے معاف کر دے فری۔ میں نیچ ہوں ذلیل ہوں۔ تیرے قابل نہیں ہوں۔“ پتہ نہیں یہ لڑکی کون تھی اور اس لڑکی، لڑکے کا ”باجی جان“ سے کیا تعلق تھا۔ یہ معاملہ ہر گھڑی الجھتا جا رہا تھا۔ بہر طور میں نے باجی جان کے ”احکامات“ پر عمل کرتے ہوئے باسط علی کو آڑے ہاتھوں لیا۔ اُسے ڈرایا دھمکایا پھر ہلکی پھلکی مار لگوائی اور حوالات میں بند کر دیا۔ نائیکہ اور اُس کی بیٹی کرن سے میں نے کہا کہ وہ کل دوپہر تشریف لائیں اس دوران میں لڑکے سے پوچھ گچھ مکمل کرلوں گا۔ اگر اُس کا قصور ثابت ہوگیا تو وہ سزا سے بچ نہیں سکے گا۔ ماں بیٹی دونوں بے حد برہم تھیں۔ اُن کا بس نہیں

چل رہا تھا ورنہ وہ ابھی باسط کے ہاتھ پاؤں تڑوا دیتیں......اُن کے نزدیک باسط کا جرم بے حد سنگین تھا ایک تو اُس نے دست درازی کی تھی اور دوسرے مفامقت۔ داناؤں نے ٹھیک کہا ہے طوائف کے لیے پیسہ ہی سب کچھ ہوتا ہے اور کنگال عاشق اس کے در پر کتے سے بدتر سمجھا جاتا ہے۔

شام تک باسط علی کا نشہ اُتر گیا اور وہ ڈھنگ کی باتیں کرنے لگا۔ میں اُس سے "فری" کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ صاف ظاہر ہے یہ اُس کی محبوبہ کا نام تھا۔ میں نے بہت کریدا لیکن باسط نے کچھ نہیں بتایا۔ وہ بولا۔ "میں اُس سے محبت کرتا ہوں۔ اُس کے متعلق کچھ بتانا میرے لیے مرنے کے برابر ہے۔" وہ زندگی سے اُکتایا ہوا نظر آتا تھا۔ آنکھوں میں ویرانی رچی بسی تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ دل پر گہری چوٹ کھائے ہوئے ہے۔ میں نے پوچھا۔

"یہ باجی جان تمہاری کیا لگتی ہے؟"

بولا۔ "وہ میری محسن ہے۔ وہ نہ ہوتی تو میں کب کا موت کو گلے لگا چکا ہوتا۔ اس نے مجھے جینے کا حوصلہ دیا ہے۔ اور اُمید کی راہ دکھائی ہے۔"

وہ بہت دیر باتیں کرتا رہا۔ جن سے پتہ چلا کہ والدین فوت ہو چکے ہیں۔ بڑے بھائیوں نے اُسے گھر سے نکال دیا ہے۔ وہ اندرون شہر سلے سلائے کپڑوں کی دکان کرتا ہے اور کرائے کے مکان میں رہتا ہے۔ زندگی کی تلخیاں بھلانے کے لیے وہ شراب پیتا ہے اور کبھی کبھی بازارِ حُسن کی طرف نکل جاتا ہے۔ باتوں باتوں میں مَیں اُس سے بے تکلفی کا ماحول پیدا کر چکا تھا۔ میں نے کہا جس لڑکی کو وہ چاہتا ہے اُسے حاصل کرنے میں کیا دشواری ہے؟

وہ ہونٹ کاٹ کر بولا۔ "وہ بے زبان لڑکی ہے۔ باپ کے سامنے بول نہیں سکتی اور باپ مجھے پسند نہیں کرتا۔ وہ بیٹی کو کالے چور سے بیاہ دے گا لیکن مجھ سے نہیں بیاہے گا۔"

☆======☆======☆

اگلے روز دوپہر سے پہلے ہی "باجی جان" لڑکے کو رہا کرانے تھانے آ گئی۔ حسبِ معمول اُس کا حلیہ فقیرانہ اور انداز شاہانہ تھے۔ یوں لگتا تھا اپنے اِرد گرد کے بندے اُسے چیونٹیاں نظر آتے ہیں۔ آتے ساتھ ہی مجھ سے پوچھنے لگی۔

"اُسے اچھی طرح ڈرا دھمکا دیا ہے ناں۔"

میں نے کہا۔ "خالی دھمکایا ہی نہیں لتاڑ بھی دیا ہے۔"

وہ بولی۔ "رپورٹ تو درج نہیں کی۔" میں نے سعادت مندی سے انکار میں سر ہلا دیا۔

مسکرا کر بولی۔ "فقیروں کو خوش رکھو گے تو خود بھی خوش رہو گے۔" پھر وہ میرے ساتھ حوالات میں گئی اور لڑکے کو لے کر چل دی۔ میں نے دبے لہجے میں پوچھا۔

"اور وہ نائیکہ آئی تو اُسے کیا جواب دوں گا۔"

بولی۔ "وہ اب نہیں آئے گی گھبراؤ مت۔ اور ہاں...... پرسوں میں آؤں گی۔ تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔"

دو دن بعد وہ واقعی آ دھمکی۔ بلال شاہ اُس وقت میرے پاس بیٹھا تھا اور خوشگوار موڈ میں تھا۔ "باجی جان" کو دیکھتے ہی اُس کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ غالباً اپنی رسوائی یاد آ گئی تھی۔ جلدی سے کان لپیٹ کر وہ برآمدے میں چلا گیا۔ بلال شاہ کو یوں کھسکتے دیکھ کر باجی جان کی آنکھوں میں شرارتی مسکراہٹ اُبھر آئی۔ ایک دو جملے بلال شاہ پر کسنے کے بعد وہ اصل موضوع پر آ گئی۔

"تھانیدار جی! ایک کام کرنا ہے تم نے اور دس پندرہ روز کے اندر اندر۔"

"کون سا کام؟" میں نے پوچھا۔

"اُس لڑکے کو رنگون بھجوانا ہے۔ کسی بھی طرح...... اُس کا پاسپورٹ بنا ہوا ہے۔ کرائے کے پیسے بھی ہیں اُس کے پاس۔ بس تم کسی طرح باقی انتظام کر دو۔ یہ کام میں کسی بڑے افسر سے بھی کرا سکتی ہوں لیکن اس کے لیے مجھے چندی گڑھ سے باہر جانا پڑے گا اور وہ میں فی الحال نہیں جا سکتی۔"

میں نے کہا۔ "میرا خیال ہے تم باسط علی کی بات کر رہی ہو، لیکن وہ وہاں جا کر کرے گا کیا؟"

کہنے لگی۔ "کچھ بھی کر لے گا اور کچھ نہیں تو کسی ہوٹل میں بیرا لگ جائے گا۔ ان بدمعاشیوں سے تو بچے گا جو یہاں کر رہا ہے۔ چند ماہ اور یہاں رہ گیا تو قبرستان پہنچ جائے گا۔"

میں نے پوچھا۔ "وہ جانے پر راضی ہو گیا ہے۔"

"ہاں" اُس نے گھڑے جیسا سر اُوپر نیچے ہلایا۔

میں نے کہا۔ "میرا خیال ہے پولیس سے کافی ڈرایا ہے تم نے اُسے۔ ورنہ وہ یہاں سے جانے والا نہیں تھا۔"

وہ بولی۔ "یہ اندازہ تم نے کیسے لگایا ہے؟"

میں نے جواب دیا۔ "کوئی عاشق بھی اپنے عشق کو ایسے نازک موڑ پر چھوڑ کر باہر کے

ملک نہیں جاتا۔ وہ ایک لڑکی سے محبت کرتا ہے اور رات دن اُس کے لیے آہیں بھرتا ہے۔''

باجی جان نے بہت بُرا سا منہ بنایا۔ ''یہ سب بیکار کی باتیں ہیں۔ نوجوانی کا پاگل پن ہے۔''

باجی جان کے اس جملے سے مجھے دو باتوں کا پتہ چلا۔ ایک تو یہ کہ وہ باسط علی کے عشق سے بے خبر نہیں ہے۔ اور دوسرے یہ کہ وہ ''اس معاملے'' کو اچھا نہیں سمجھتی۔ فوری طور پر میرے ذہن میں آیا کہیں 'باجی جان' باسط علی کو اس لیے تو ملک سے نہیں بھگا رہی کہ وہ اُسے اُس لڑکی سے دور رکھنا چاہتی ہے...... اس سوال کے ساتھ ہی دوسرا سوال ذہن میں اُبھرا کہ وہ لڑکی کون ہو سکتی ہے؟ اس دوسرے سوال کا جواب فوری طور پر تو میرے ذہن میں نہیں آیا لیکن تھوڑی دیر بعد جب باجی جان مجھے نئی ہدایات دے کر واپس چلی گئی اور میں نے آنکھیں بند کر کے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی تو ایک جھماکا سا آنکھوں کے سامنے ہوا۔ ایک نئے خیال نے مجھے جھنجھوڑ کر سیدھا بٹھا دیا۔ میں نے ایس آئی باجوہ کو آواز دے کر بلایا۔ وہ تیزی سے آیا اور سیلوٹ کر کے سیدھا کھڑا ہو گیا۔ میں نے کہا۔

''باجوہ! تم نے بتایا تھا کہ باجی جان ایک ٹیلر ماسٹر کے گھر میں رہ رہی ہے۔ تم نے ٹیلر ماسٹر کی لڑکی کا نام کیا بتایا تھا؟''

باجوہ نے ذہن پر زور دے کر کہا...... ''فرحت۔''

فرحت اور فری میرا مسئلہ حل ہو گیا تھا۔ مجھے افسوس ہوا کہ یہ سامنے کی بات پہلے میرے ذہن میں کیوں نہیں آئی؟ اس کا مطلب تھا باسط علی کی محبوبہ وہ لڑکی فرحت ہے جن کے گھر باجی جان رہائش پذیر ہے۔ یعنی ٹیلر ماسٹر احمد علی کی بیٹی باسط علی کے دل کا روگ بنی ہوئی تھی۔ اور یہی احمد علی تھا جسے باسط علی ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا...... اب سوچنے کی بات یہ تھی کہ اگر باجی جان باسط اور اُس کی محبوبہ میں فاصلے پیدا کرنے کی سوچی سمجھی کوشش کر رہی ہے تو کیوں؟ اس سے اُس کا کیا مفاد ہو سکتا ہے۔ اس سارے معاملے کو روشنی میں لانے کے لیے فرحت سے ملنا اور اُس کے ذہن کو ٹٹولنا ضروری تھا۔ میرے ذہن میں بلال شاہ کا نام آیا۔ وہ ایسے کاموں میں بڑا کایاں تھا۔ اور ان دنوں تو وہ ویسے ہی بارود سے بھرا ہوا تھا۔ باجی جان کے ہاتھوں اُس کی بے عزتی ہوئی تھی اور میں اُسے باجی جان کے خلاف جس طرح چاہے استعمال کر سکتا تھا۔ اگر میں اُسے فرحت کے پیچھے لگا دیتا تو وہ چند دنوں میں ضرور اُسے بیٹی، بھتیجی یا بھانجی وغیرہ بنا لیتا اور اُس کے ماضی میں خرگوش کی طرح لمبی سرنگیں لگا دیتا۔ میں ٹیلر ماسٹر کی بیٹی فرحت کے سلسلے میں بلال شاہ کا سوچ ہی رہا تھا کہ صورتِ حال نے ایک نئی

کروٹ لی اور میرا کام بالکل آسان ہو گیا۔

☆======☆======☆

یہ اگلے روز دوپہر کا واقعہ ہے۔ ساون کی زبردست جھڑی لگی ہوئی تھی۔ میں ایک موقعہ ملاحظہ کرنے کے بعد تھانے واپس پہنچا تو رجسٹرار نے ایک اہم اطلاع دی۔ کہنے لگا کہ ڈیڑھ گھنٹے سے ایک لڑکی کمرے میں بیٹھی آپ کا انتظار کر رہی ہے۔ اکیلی لڑکی کا سن کر میں حیران ہوا...... رجسٹرار نے یہ بھی بتایا کہ لڑکی کی طبیعت خرابرقع ہے اور وہ دو تین بار پانی مانگ چکی ہے۔ کمرے میں پہنچا تو واقعی ایک لڑکی سکڑی سہمی کرسی پر بیٹھی تھی۔ اُس نے برقع پہن رکھا تھا اور نقاب گرایا ہوا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ انگلیاں مروڑتی ہوئی اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔ پھر بے ڈھنگے پن سے دوبارہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ خاصی گھبرائی ہوئی لگتی تھی۔ میں صاف دیکھ رہا تھا کہ وہ سرتاپا لرز رہی ہے۔ یہ لرزہ خنکی سے زیادہ خوف کے سبب تھا۔ ٹوپی اُتار کر میں نے چہرے سے بارش کا پانی پونچھا اور لڑکی کے سامنے کرسی سنبھالتے ہوئے کہا۔

''ہاں...... بی بی کیا بات ہے؟''

''جی وہ...... وہ میں...... میں'' وہ ہکلا کر چپ ہو گئی۔ تھوڑی دیر خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتی رہی۔ پھر سر جھکا کر سسکیوں سے رونے لگی۔ میں نے اُسے دلاسا دیا۔ کچھ دیر بعد وہ گلوگیر لہجے میں بولی۔

''انسپکٹر صاحب آپ یہ رکھ لیں اور خدا کے لیے اُسے چھوڑ دیں۔'' یہ کہتے ہوئے اُس نے زرد رنگ کا ایک پرس برقعے سے نکالا اور کانپتے ہاتھ سے میز پر رکھ دیا۔

میں نے پرس کھولا۔ اُس میں کرنسی نوٹ تھے۔ قریباً ایک ہزار روپیہ رہا ہو گا۔ اُن دنوں یہ ایک بڑی رقم تھی۔ میں نے پرس بند کر کے اپنے قبضے میں لے لیا۔ لڑکی نے روتی دھوتی آواز میں کہا۔ ''انسپکٹر صاحب! اسے رشوت نہ سمجھئے۔ میں یہ پیسے آپ کو اُس کی رہائی کے لیے دے رہی ہوں۔ آپ جیسے چاہیں ان پیسوں کو استعمال کر لیں اور اس کیس سے اُس کی جان چھڑا دیں۔''

میں نے کہا۔ ''بی بی! مجھے ابھی تک سمجھ نہیں آئی، تم کس کی بات کر رہی ہو۔''

اُس نے ایک بار پھر شدت سے اُنگلیاں مروڑیں اور بولی۔ ''باسط...... علی...... جسے آپ نے جمعے کو گرفتار کیا تھا...... میں...... میں۔''

میں نے کہا۔ ''کیا تم ٹیلر ماسٹر احمد علی کی بیٹی ہو۔'' اُس نے گردن ڈال کر ''ہاں'' میں سر ہلا دیا۔ ایک ہی لمحے میں پوری بات سمجھ میں آ گئی۔ یہ فرحت تھی اور اب تک یہ سمجھ رہی تھی

کہ اُس کا محبوب حوالات میں ہے۔ اُسے اس مصیبت سے نکالنے کے لیے اُس نے ایک دلیرانہ قدم اٹھایا اور کسی طرح رقم کا انتظام کر کے تھانے آ گئی تھی۔ بول چال سے اندازہ ہوتا تھا کہ لڑکی پڑھی لکھی ہے۔ لباس سے کھاتے پیتے گھرانے کی لگتی تھی۔ مگر ایک نوجوان لڑکی کے لیے تنِ تنہا اتنی بڑی رقم کا انتظام کر لینا سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ میں نے رقم کے بارے میں لڑکی سے چند تند و تیز سوال پوچھے تو وہ مزید گھبرا گئی۔ وہ بار بار کہہ رہی تھی۔ ''یہ میرے پیسے ہیں۔ آپ یہ سب رکھ لیں اور اُسے چھوڑ دیں۔ وہ ایسا نہیں ہے۔ اگر اُس نے کچھ کیا ہوگا تو نشے میں کیا ہوگا۔''

باتوں کے دوران ہی اُس نے سینے پر ہاتھ رکھ لیا اور کھینچ کھینچ کر سانس لینے لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ لہرائی۔ اگر میں لپک کر اُسے تھام نہ لیتا تو وہ لڑھک کر پختہ فرش پر جا گرتی۔

''گوبندر سنگھ پانی لاؤ۔'' میں نے پکار کر کہا۔

چند ہی لمحوں میں سارا عملہ لڑکی کے گرد اکٹھا ہو گیا۔ لڑکی کے جسم کو ہاتھ لگاتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ بخار میں بُری طرح تپ رہی ہے۔ میں نے لڑکی کا نقاب اُلٹا تو سب دیکھتے رہ گئے۔ اٹھارہ انیس برس کی وہ ایک خوبصورت لڑکی تھی۔ دودھیا جلد بخار کی وجہ سے تمتمائی ہوئی تھی اور گداز ہونٹوں پر پیاس کے سبب پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔ مجھے اُس کی شکل کچھ جانی پہچانی لگی۔ ایسا چہرہ کہیں دیکھا ہوا تھا میں نے۔ میرے اشارے پر بلال شاہ قریبی بازار سے ڈاکٹر کو بلانے چلا گیا۔ ہم نے لڑکی کو پانی وغیرہ پلایا۔ اس کی ہتھیلیوں کی مالش کی۔ تھوڑی دیر بعد اُس نے آنکھیں کھول دیں۔ اتنے میں ڈاکٹر بھی آ گیا۔ اس نے لڑکی کو چیک کیا اور بتایا کہ وہ 105 بخار میں تپ رہی ہے۔ اُسے دوا کے علاوہ مکمل آرام کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ دماغ کی حدت کم کرنے کے لیے برف کی پٹیاں ضروری ہیں۔ میں نے اسسٹنٹ سب انسپکٹر باجوہ کو بتایا کہ یہ ٹیلر ماسٹر احمد علی کی بیٹی ہے۔ وہ اسے فوراً گھر پہنچانے کا انتظام کرے۔ لڑکی نے میری بات سن لی۔ بخار کی غنودگی میں بڑبڑانے لگی۔ ''نہیں تھانیدار صاحب...... میں نہیں جاؤں گی...... میں نہیں جاؤں گی...... اُس کو چھوڑ دیں...... وہ بے قصور ہے۔''

باجوہ نے اُسے اٹھانے کی کوشش کی تو وہ شدت سے نفی میں سر ہلانے لگی۔ میں نے باجوہ کو ہاتھ کے اشارے سے روک دیا...... بہتر تھا کہ لڑکی کی حالت سنبھلنے کا انتظار کر لیا جاتا۔ وہ غیر مردوں کے ساتھ گھر واپس جاتی تو گلی محلّے میں بدنامی ہو سکتی تھی۔ مناسب یہی تھا کہ وہ جیسے آئی ہے ویسے ہی واپس جائے یا پھر اس کا کوئی عزیز آ کر اُسے لے جائے۔ میرے

کمرے میں ایک بنچ سا پڑا تھا۔ کرسی کی گدی رکھ کر اس پر سرہانہ بنا دیا گیا اور وہ برقعے سمیت وہاں لیٹ گئی۔

ڈاکٹر انجکشن لگا کر گیا تھا۔ آدھ پون گھنٹے بعد اس کا بخار خاصا کم ہو گیا اور قریباً دو گھنٹے بعد وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کے برقعے کا بالائی حصہ میری میز پر پڑا تھا۔ وہ اپنی بے پردگی کو بری طرح محسوس کر رہی تھی۔ میں نے اُس کے ہونٹوں کے عین نیچے ایک سیاہ تل کو گھورتے ہوئے کہا۔

''بی بی فرحت! مجھے لگتا ہے میں نے پہلے بھی تمہیں کہیں دیکھا ہوا ہے۔''

اُس نے فوراً سر جھکا لیا۔ اُس کے انداز سے ظاہر ہوا کہ نہ صرف میری بات صحیح ہے بلکہ وہ مجھے پہچان بھی چکی ہے...... تھوڑی سی کوشش کے بعد مجھے بھی اُس کے بارے سب کچھ یاد آ گیا۔ فرحت سے میری ملاقات قریباً چھ برس پہلے لاہور میں ہوئی تھی۔ میں اُس وقت انسپکٹر تھا اور یہ خوبرو لڑکی سکول کی ایک دُبلی پتلی نوعمر طالبہ تھی۔ اپنے والدین کے ساتھ وہ چندی گڑھ سے لاہور حضرت مادھولال کا عرس دیکھنے آئی ہوئی تھی اور بچھڑ گئی تھی۔ اس کے والدین کا پتہ پورے تین روز بعد چلا تھا اور اتنا عرصہ وہ میرے پاس ہی رہی تھی۔ گیارہ برس کی وہ بچی مجھے ابھی تک یاد تھی جو داناؤں جیسی باتیں کرتی تھی اور اجنبی لوگوں میں ہونے کے باوجود بڑی پُرسکون تھی۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ چھٹی جماعت میں پڑھتی ہے اور تقریری مقابلوں میں حصہ لیتی ہے۔ میں اس کی ذہانت اور اخلاق سے بہت متاثر ہوا تھا...... آج وہی بچی ایک بھرپور دوشیزہ کے رُوپ میں میرے سامنے بیٹھی تھی اور گردن جھکائے اپنی انگلیاں مروڑ رہی تھی۔ وہ کسی خوفزدہ ہرنی کی طرح سہمی ہوئی تھی۔ مجھے لگا جیسے میں نے ابھی ابھی اُسے میلہ چراغاں کے ہجوم میں سے ڈھونڈا ہے اور اپنے ہاتھوں سے اُس کے رخساروں کے آنسو پونچھے ہیں۔

☆======☆======☆

فرحت یا فری طبیعت سنبھلنے کے بعد قریباً دو گھنٹے میرے پاس رہی۔ یہ دو گھنٹے میرے لیے بہت اہم تھے کیونکہ اس دوران فری نے مجھے اپنے اور باجی جان کے بارے میں بہت کچھ بتایا اور اپنے حالات کے بارے میں بھی کھل کر بات کی...... وہ مجھے اسی وقت پہچان گئی تھی جب میں تھانے میں داخل ہوا تھا لیکن جھجک کے باعث اس نے خود کو نقاب میں چھپائے رکھا تھا۔ اور اس نے مجھے ایک دیرینہ ہمدرد اور غم خوار سمجھتے ہوئے اپنے سارے دکھ بیان کر دیئے تھے۔ میں اُسے ایک خوشگوار اتفاق ہی کہوں گا کہ ہم پہلے سے ایک دوسرے کو

جانتے تھے ورنہ فری نے مجھے جو کچھ بتایا وہ ایک لڑکی تھانے میں بیٹھ کر کسی تھانیدار کو بتانے کا تصور بھی نہ کرسکتی تھی۔ گو یہ معمولی باتیں تھیں لیکن ایک لڑکی کے لیے زبان پر لانا بہت مشکل تھیں۔ فری نے مجھے جو کچھ بتایا اور میں نے کرید کرید کر جو کچھ پوچھا اس کا احوال کچھ اس طرح ہے۔

’’فری‘‘ چندی گڑھ کے کالج میں بی۔اے کر رہی تھی۔ اُس کے والد شہر میں ٹیلر ماسٹر تھے اور شہر کے امراء وخواص اُن کے ہاتھوں کے سلے کپڑے پہنتے تھے۔ اپنا مکان تھا۔ گزر بسر سہولت سے ہو رہی تھی۔ باسط علی بھی اسی علاقے میں رہتا تھا۔ وہ بھی چونکہ کپڑوں کا کام کرتا تھا لہٰذا فرحت کے والد سے اُس کا ملنا جلنا تھا۔ چند بار وہ فرحت کے گھر بھی آیا۔ یہیں سے اُن دونوں کے درمیان ایک تعلق سا پیدا ہو گیا۔ قریباً ایک برس تک یہ تعلق خاموش رہا۔ پھر باسط نے اس تعلق کو زبان دی اور بذریعہ تحریر فرحت سے محبت کا اظہار کیا۔ فرحت نے اس کی حوصلہ افزائی کی اور نہ ہی دل شکنی۔ ویسے وہ دل ہی دل میں باسط کو پسند کر رہی تھی۔ وہ خوبصورت تھا، پڑھا لکھا تھا اور برسرِ روزگار ہونے کے لیے بھی اپنی سی کوشش کر رہا تھا۔ وہ غریب ضرور تھا مگر ذہانت کی صفت رکھتا تھا جو اکثر غربت کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دیتی ہے۔ اسی دوران فرحت کے والد کو علم ہو گیا کہ باسط اور فرحت ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اور اُن دونوں میں مختصر ملاقاتیں بھی ہوتی ہیں۔ وہ آگ بگولا ہو گیا اور اس نے فرحت پر سخت پابندیاں لگا دیں۔ وہ پہلے بس پر کالج جاتی تھی، اب محلّے کا ایک تانگہ اُسے لانے اور لے جانے لگا۔ فرحت اُن لڑکیوں میں سے نہیں تھی جو بغاوت کا سوچتی ہیں اور نتیجے میں والدین کے سر میں رسوائی کی خاک ڈال دیتی ہیں۔ وہ تو باپ کی آنکھ کا اشارہ سمجھنے والی لڑکی تھی۔ اس نے اپنے دل کی وہ کھڑکی بند کر دی جو باسط کی طرف کھلتی تھی اور جس میں اپنی آنکھیں رکھ کر وہ کسی کی راہ دیکھا کرتی تھی۔ اس نے باسط کی طرف مکمل بے رخی اختیار کر لی اور اپنی پوری توجہ تعلیم پر مرکوز کر دی۔ باسط کئی ماہ اُس کے پیچھے پیچھے پھرتا رہا۔ اُس کا خیال تھا فرحت کی بے رُخی عارضی ہے اور وہ تا دیر اس کے تڑپنے کا تماشہ نہیں دیکھ سکے گی لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اُس کا یہ خیال غلط ثابت ہوا...... آخر مایوس ہو کر باسط نے بھی خاموشی اختیار کر لی۔ سہانے خواب ٹوٹنے لگے تو سہانے مستقبل کی جدوجہد بھی دم توڑنے لگی۔ باسط کا دل کام سے اچاٹ ہو گیا۔ وہ نشہ کرنے لگا اور بُرے دوستوں میں بیٹھنے لگا۔ وہ دکان جسے وہ اپنا خون دے دے کر سینچ رہا تھا بند ہو گئی اور دکان کی پونجی اللے تللوں میں صرف ہونے لگی۔ دھیرے دھیرے اُس نے فرحت اور فرحت کی آرزو سے بالکل کنارہ کشی اختیار

کر لی۔

فرحت ان حالات سے بے خبر نہیں تھی لیکن وہ ایک مشرقی لڑکی تھی۔ اُس کی قسمت میں اپنے آپ سے لڑنا تھا اور اپنے جسم کو اپنے ارمانوں کی آگ میں جلانا تھا۔ وہ اپنے کیے پر پچھتا رہی تھی اور اب اُسے احساس ہو رہا تھا کہ اُس نے باسط پر اور خود پر ضرورت سے زیادہ ظلم کیا ہے۔ محبت اس کے گلے کی پھانس بن چکی تھی۔ نہ آگے جاتی تھی نہ واپس آتی تھی۔ اُسے اپنی محبت کی شدت کا احساس باسط سے بچھڑنے کے بعد ہوا تھا۔ وہ اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ اُس نے باسط سے بے رخی اختیار نہیں کی اپنی زندگی سے منہ موڑا ہے۔ وہ تو اس کے بغیر زندہ ہی نہیں رہ سکتی تھی...... اب وہ اُسے منانا چاہتی تھی۔ اس سے اپنی خطا کی معافی مانگنا چاہتی تھی اور اس کے پاؤں اپنے اشکوں سے دھونا چاہتی تھی، لیکن محبت کا وہ ’’ناراض دیوتا‘‘ اُس سے دور تھا۔ نہ فرحت کی آواز اُس تک پہنچ سکتی تھی اور نہ وہ خود اُس کے پاس جا سکتی تھی۔ اور یوں چندی گڑھ کالج کی سب سے ہونہار اور ذہین طالبہ جو نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں میں اَن گنت انعامات جیت چکی تھی، اپنی آرزو کے ہاتھوں شکست کھا کر بے بسی کی تصویر بنی میرے سامنے بیٹھی تھی۔

میری نگاہیں اس پرس پر مرکوز تھیں جو تھوڑی دیر پہلے فرحت نے مجھے دیا تھا اور جس میں کم و بیش ایک ہزار کے نوٹ تھے۔ میں نے کہا۔ ’’کیا اب بھی نہیں بتاؤ گی کہ اس رقم کا انتظام تم نے کیسے کیا؟‘‘

اُس نے حسبِ عادت گردن یوں جھکائی کہ ریشمی بالوں نے پھسل کر چہرے پر گھونگٹ سا بنا دیا۔ اب مجھے اُس کی صرف چھوٹی سی ناک نظر آ رہی تھی جو اُس نے رو رو کر سُرخ کی ہوئی تھی۔ نمناک آواز میں بولی۔ ’’کیا آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ میں نے کہیں چوری کی ہے؟‘‘

میں نے کہا۔ ’’میں ایسی بات دماغ میں بھی نہیں لا سکتا لیکن یہ بات میرے لیے حیران کن ہے کہ تم نے اتنی بڑی رقم کہاں سے حاصل کی؟‘‘

وہ بولی۔ ’’لیکن آپ نے شک تو کیا ہے۔‘‘

میں نے جواب دیا۔ ’’تم اسے تجسس کہہ سکتی ہو۔ ایسا سوال تو تمہارا کوئی بھی بڑا تم سے پوچھ سکتا ہے۔‘‘

وہ چند لمحے خاموش رہ کر بولی۔ ’’میرے پاس سونے کے دو میڈل تھے۔ اس کے علاوہ دو تین میڈل چاندی کے تھے۔ میں نے وہ بیچ ڈالے ہیں۔‘‘

میں ششدر رہ گیا۔ کسی نے سچ کہا ہے، محبت ایک میٹھا عذاب ہے۔ پیار کرنے والے

کو دوسرے تمام لوگوں سے مختلف کر دیتا ہے......اور اُس سے ایسے ایسے کام کرواتا ہے جو کبھی عجیب و غریب ہوتے ہیں اور کبھی بے حد خوبصورت۔ پولیس سے اپنے محبوب کی جان چھڑانے کے لیے اپنے میڈل بیچ دینا اور رقم پرس میں ڈال کر دلیری سے تھانے پہنچ جانا، عجیب و غریب اور خوبصورت نہیں تھا تو اور کیا تھا۔ میں نے سونے چاندی کا وزن اور رقم کا حساب کتاب پوچھا تو مجھے یہ جان کر مزید حیرانی ہوئی کہ خریدنے والے نے فرحت کو اصل قیمت سے کوئی تین صد روپیہ کم دیا تھا۔ فرحت بھی یہ بات جانتی تھی لیکن اُسے رقم کی ضرورت تھی اس نے صراف کی بد دیانتی کو بھی برداشت کر لیا تھا (میں نے فرحت سے صراف کا پتہ پوچھ کر نوٹ کر لیا اور بعد میں اُسے آڑے ہاتھوں لیا) میں نے اِس دو گھنٹے کی میٹنگ میں فرحت سے ''باجی جان'' کے متعلق جو سوالات پوچھے اُن سے پتہ چلا کہ وہ باجی جان کی بہت عزت کرتی ہے اور اُسے اپنا سچا ہمدرد اور خیر خواہ سمجھتی ہے۔ فرحت کا خیال تھا کہ باجی جان نہ ہوتی تو وہ اُس چار دیواری میں گھٹ گھٹ کر مر جاتی وہ ہر طرح اُس کی دلجوئی کرتی ہے۔ باسط کے بارے اُسے سب کچھ پتہ ہے اور وہ اس کوشش میں لگی رہتی ہے کہ کسی طرح ماسٹر علی احمد، باسط کے بارے میں اپنا فیصلہ بدل دیں۔ فرحت نے کہا۔

''حالانکہ میں انہیں خالہ جان کہتی ہوں لیکن وہ میری ہمراز سہیلی بھی ہیں۔ تین چار ہفتے پہلے باسط اپنے گھر سے بالکل غائب ہو گیا تھا۔ میری خاطر خالہ نے جان جوکھم میں ڈال کر اُسے ڈھونڈا اور سمجھا بجھا کر گھر واپس لائیں۔ وہ اس کا علاج وغیرہ بھی کرا رہی ہیں تاکہ نشہ چھوٹ جائے۔''

باجی جان کے کردار کا دوسرا رُخ اب واضح طور پر میرے سامنے آ رہا تھا۔ فرحت اُس عورت کو اپنا ہمدرد خیال کر رہی تھی اور یہ سمجھتی تھی کہ وہ اُسے اور باسط کو ملانے کی کوشش کر رہی ہے جبکہ وہ اُن دونوں کی جڑیں کاٹ رہی تھی۔ اُس نے بڑی عیاری سے باسط کو ڈرایا دھمکایا تھا اور اب اُسے بیرونِ ملک بھجوا رہی تھی۔ عین ممکن تھا کہ باسط کی بد عادتوں میں بھی باجی جان کا عمل دخل ہو۔ وہ ظاہراً اُن دونوں کی ہمدرد تھی لیکن اصل میں اُن کے درمیانی فاصلے بڑھا رہی تھی۔ فرحت نے اس کے ذریعے باسط کو جو پیغامات پہنچائے تھے معلوم نہیں وہ کس شکل میں باسط تک پہنچے ہوں گے اور باسط نے جو کچھ کہا ہو گا وہ بھی فرحت کے کانوں تک پہنچتے پہنچتے پتہ نہیں کیا شکل اختیار کر گیا ہو گا۔ جب گھر کا بھیدی ہی لنکا ڈھانے پر تُلا ہوا ہو تو پھر لنکا کیسے بچ سکتی ہے۔ میں نے فرحت کو ٹٹولا اور مجھے معلوم ہوا کہ اُسے باسط کے رنگون جانے کی بھنک تک نہیں اور وہ بیچاری یہی سمجھ رہی ہے کہ آج نہیں تو کل خالہ کی ''مہربانیوں'' کے سبب

وہ دونوں ایک ہو جائیں گے۔

فرحت کی طبیعت اب کافی سنبھل چکی تھی۔ میں نے اُسے خوشخبری سنائی کہ باسط ایک روز پہلے ہی رہا ہو کر یہاں سے جا چکا ہے۔ میں نے اُسے تسلی دی کہ باسط کو اس کیس میں مزید پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا، اور اس سلسلے میں مَیں اُن دونوں کی ہر طرح مدد کروں گا۔ فرحت کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو چمکنے لگے۔ یہ آنسو چھپانے کے لیے وہ جلدی سے کھڑی ہو گئی اور خدا حافظ کہہ کر دروازے کی طرف بڑھی۔ میں نے آواز دی۔

''ٹھہرو......یہ تمہارا پرس۔''

اُس نے شرمسار نگاہ مجھ پر ڈالی اور جلدی سے پرس اُٹھا لیا۔

''سوری......میں بہت شرمندہ ہوں۔''

میں نے مسکرا کر کہا۔ ''اتنے تیز بخار کے ساتھ اتنی زیادہ شرمندگی کا بوجھ اٹھا کر اکیلی کیسے جاؤ گی۔ میں تمہارے ساتھ آدمی بھیجتا ہوں۔ وہ تمہیں گرومندر چوک تک چھوڑ آئے گا۔''

میں نے بلال شاہ کو اشارہ کیا اور وہ فرحت کے ساتھ چل دیا۔

☆======☆======☆

اب سب سے اہم سوال یہ تھا کہ ''باجی جان'' یہ دوغلا کردار کیوں ادا کر رہی ہے۔ مجھے یہ سب کچھ کسی گہری سازش کا حصہ نظر آتا تھا۔ کبھی کبھی تو یوں لگتا تھا کہ یہ ''اللہ لوک'' عورت کسی منصوبے کے تحت علی احمد کے گھر میں داخل ہوئی ہے۔ کوئی ایسا منصوبہ جس کی جڑیں چندی گڑھ میں نہیں کسی اور علاقے، کسی اور شہر میں ہیں۔ ''باجی جان'' کی ٹیلر ماسٹر علی احمد سے کوئی رشتے داری تھی اور نہ کوئی دوسرا تعلق ثابت ہوتا تھا۔ اس سے نتیجہ اخذ کیا جا سکتا تھا کہ وہ کسی کی آلہ کار بنی ہوئی ہے۔ باجی جان کے ساتھ میرا تعلق دن بدن مضبوط ہوتا جا رہا تھا۔ پہلے تو صرف اتنا تعلق تھا کہ اُس نے بلال شاہ کی بے عزتی کی تھی اور میں اس دیدہ دلیری پر اُسے سبق سکھانا چاہتا تھا، مگر اب فرحت والا معاملہ بھی سامنے آ گیا تھا۔ چھ برس پہلے میلہ چراغاں میں بھٹک جانے والی معصوم لڑکی ایک بار پھر مدد طلب نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی، اور میں اُس کی مدد کرنا چاہتا تھا۔

باسط کو رنگون بھیجنے کے لیے باجی جان بڑی بے صبری کا مظاہرہ کر چکی تھی۔ مجھے خدشہ ہوا کہ کہیں وہ میرے علم میں لائے بغیر اُسے روانہ ہی نہ کر دے۔ لہٰذا کاغذات مکمل کرانے کے بہانے میں نے باسط کا پاسپورٹ اپنی تحویل میں لے لیا۔ باجی جان اپنے خیال میں مجھ

پر پوری طرح حاوی ہو چکی تھی اور اُس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ میں اُس کے سامنے سر اُٹھا سکتا ہوں۔ بلال شاہ میری خاموشی پر بُری طرح پیچ و تاب کھا رہا تھا، اُسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ میں واقعی باجی جان سے دب گیا ہوں یا صرف ظاہر کر رہا ہوں۔ میں بلال شاہ کی کیفیت سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ میں جانتا تھا جب بلال شاہ بے سکون ہو، اُس کے کام کرنے کی صلاحیت بڑھ جاتی ہے اور جب وہ مطمئن ہو اُسے دودھ جلیبی کھانے، ادھ رڑکا پینے اور سونے کے علاوہ کوئی کام نہیں رہتا۔

دوسرے تیسرے روز کی بات ہے میں تھانے میں بیٹھا تھا کہ ایک نوجوان نائب تحصیلدار پربت سنگھ ہانپتا کانپتا میرے پاس پہنچا۔ سلام دعا کے بعد کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

"خان صاحب! آپ کے علاقے میں کوئی ٹیلر ماسٹر بھی رہتا ہے۔" اُس نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

ٹیلر ماسٹر کے ذکر پر میں چونک گیا۔ میں نے کہا۔ "کئی ٹیلر ماسٹر ہوں گے۔ تم کس کا پوچھ رہے ہو؟"

بولا۔ "وہ بڑا مشہور درزی ہے جی۔ انگریز افسر بھی اُس سے کپڑے سلواتے ہیں۔ یہیں کہیں گرومندر کے نزدیک رہتا ہے۔"

میں سمجھ گیا کہ یہ علی احمد کی بات ہو رہی ہے۔ انجان بن کر میں نے پوچھا۔ "لیکن معاملہ کیا ہے؟"

وہ بولا۔ "تھوڑی دیر پہلے اے سی صاحب کا فون آیا ہے۔ انہوں نے بتایا ہے کہ ایک وزیر صاحب چندی گڑھ آئے ہوئے ہیں، شام چار بجے وہ گرومندر چوک میں اُس درزی کے پاس جائیں گے۔ کچھ شیروانیاں سلوانی ہیں انہوں نے۔ اے سی صاحب نے کہا ہے گرومندر چوک میں کانسٹیبل موجود ہونے چاہئیں اور درزی والی گلی میں صفائی ستھرائی میں کوئی کسر نہیں رہنی چاہیے۔ اس کے علاوہ درزی کو بھی پہلے سے باخبر کر دیا جائے تاکہ وہ وزیر صاحب کے استقبال کے لیے تیار ہو۔"

یہ اطلاعات مجھے سوچنے کی دعوت دے رہی تھیں۔ میں نے نائب تحصیلدار سے پوچھا "کیا نام ہے وزیر صاحب کا؟"

"پربودھ کمار۔" نائب تحصیلدار نے بتایا۔ "اُن کے ساتھ دو سیکرٹری بھی ہیں۔"

میرے خدشات درست ثابت ہو رہے تھے۔ یہ وہی وزیر نامدار تھے جو اس سے پہلے "باجی جان" کی فی الفور رہائی کے لیے ٹیلیفون فرما چکے تھے۔ اب دال میں کالا ثابت ہو رہا

تھا لیکن یہ "کالا" اصل میں کیا تھا فی الحال کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ نائب تحصیلدار پربت سنگھ نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ "نواز صاحب! ہمیں ذرا تیزی دکھانی ہوگی۔ ساڑھے بارہ ہو گئے ہیں۔ تین ساڑھے گھنٹے میں ہمیں ساری تیاری کرنی ہے۔ درزی کا گھر ڈھونڈنے میں بھی کچھ وقت لگے گا۔"

میں نے کہا۔ "گھر تو ڈھونڈا ہی ہوا ہے۔ اُس کا نام علی احمد ہے۔ مکمل ایڈریس بھی میرے پاس موجود ہے۔"

پربت سنگھ کی پریشانی ذرا کم ہوئی۔ قریباً دس منٹ بعد ہم دونوں موٹر سائیکل پر سوار گرومندر چوک کی طرف جا رہے تھے۔

گرومندر میں کافی رش تھا۔ اس رش سے نکل کر ہم علی احمد والی گلی میں پہنچے۔ باجوہ نے بتایا تھا کہ علی احمد کی طبیعت ناساز رہتی ہے۔ لہٰذا وہ اپنے گھر کی بیٹھک میں ہی کام کرتے ہیں۔ کام بھی بس گنے چنے لوگوں کا ہوتا ہے اور اُن سے کپڑے سلوانے کے لیے گاہکوں کو کافی انتظار کرنا پڑتا ہے۔ یہ ایک کشادہ گلی تھی۔ تین چار فرلانگ آگے جا کر ہم ایک دو منزلہ مکان کے سامنے رک گئے۔ نانک چندی اینٹوں اور لکڑی کے منقش دروازوں والا یہ مکان اچھا خاصا تھا۔ موٹر سائیکل کی پھٹ پھٹ اور میری وردی کی جھلک نے گلی کے بہت سے بچوں کو ہمارے گرد اکٹھا کر دیا۔ انہی بچوں میں سے کسی نے اندر ماسٹر صاحب کے گھر میں اطلاع پہنچائی۔ چند لمحے بعد دروازہ کھلا اور گوشت کا پہاڑ میرے سامنے تھا۔ مجھے دیکھ کر باجی جان کی آنکھوں میں ایک معنی خیز چمک اُبھر کر غائب ہوگئی۔ وہ عام سے لہجے میں بولی۔

"تھانیدار صاحب! تم یہاں؟ کیا بات ہے؟"

میں نے کہا۔ "صوبائی وزیر پربودھ کمار صاحب یہاں آ رہے ہیں۔ مین اس سلسلے میں علی احمد صاحب سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"اچھا اچھا۔" باجی جان نے اپنا گھڑے جیسا سر اُوپر نیچے ہلایا۔ "مجھ سے بات کی تھی، ایک دن وزیر صاحب نے۔" پھر ایک لمحہ رک کر بولی۔ "میں بلاتی ہوں بھائی صاحب کو۔"

وہ واپس مڑی اور تھل تھل کرتی دروازے میں گھس گئی۔ چند لمحے بعد بیٹھک کا دروازہ کھلا اور ایک لڑکے نے کہا۔ "آپ اندر آ جائیں۔" ہم اندر داخل ہوئے ساٹھ پینسٹھ برس کی عمر کا ایک دبلا پتلا شخص ٹیک لگائے سلائی مشین کے سامنے بیٹھا تھا۔ دو لڑکے جو غالباً شاگرد تھے علیحدہ مشینوں پر بیٹھے تھے۔ ایک صاف ستھری الماری میں چند شیروانیاں اور انگریزی سوٹ بڑی نفاست سے ہینگروں میں جھول رہے تھے۔ میں فوراً علی احمد کو پہچان گیا۔ اُس کے بال

دودھیا سفید تھے اور چہرے سے وقار ٹپکتا تھا۔ علی احمد نے اُٹھ کر ہم سے ہاتھ ملایا اور کرسیاں پیش کیں۔ ہم نے جلدی جلدی ماسٹر علی احمد کو اپنی آمد کا مقصد بتایا۔ وزیر کے آنے کا سن کر علی احمد نے کوئی خاص ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔ اپنی دھیمی اور معتبر آواز میں کہنے لگا۔ ''ٹھیک ہے چار بجے تک میں گھر ہی پر رہتا ہوں...... لیکن آپ وزیر صاحب کو بتا دیں کہ میں اُن کے حکم کی تعمیل جلد نہیں کر سکوں گا۔ بہت کام پڑا ہوا ہے۔ بہت جلدی بھی کروں گا تو تین چار ہفتے تو لگ ہی جائیں گے۔ کتنی شیروانیاں سلوانی ہیں انہوں نے۔''

میں نے کہا۔ ''یہ تو وزیر صاحب خود ہی بتا سکتے ہیں۔ بہر حال ہم چار ساڑھے چار بجے تک حاضر ہو جائیں گے۔''

علی احمد سے بات کرنے کے بعد ہم کارپوریشن کے مقامی دفتر میں پہنچے۔ متعلقہ آدمی کو ہدایت دی کہ وہ ایشور کالونی کی گلی نمبر 10 میں خاکروب بھیج دے۔ تین بجے تک صفائی وغیرہ کر کے وہاں چھڑکاؤ کر دیا جائے۔ اس کے بعد نائب تحصیلدار کی گزارش پر میں نے ہیڈ کوارٹر کا رُخ کیا۔ وہاں سے دو ٹریفک کانسٹیبلان کو گرومندر چوک میں پہنچنے کے آرڈر کروائے۔ بعد ازاں ہم تھانے واپس آ گئے۔ کوئی سرکاری عہدیدار جب کسی علاقے میں پہنچتا ہے تو وہاں کے مقامی اہلکاروں کو بہت سی تیاریاں کرنا پڑتی ہیں۔ ان میں سے کچھ تیاریاں قانونی ہوتی ہیں اور کچھ غیر قانونی۔ یہ تو شہری علاقہ تھا۔ ذرا سی بات کا بتنگڑ بن سکتا تھا۔ لہٰذا دورے پر آنے والے والے سرکاری عہدیدار بھی ہوشیار رہتے تھے لیکن دور دراز دیہی علاقوں میں جہاں کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا وہاں بعض رنگین طبع عہدیداروں کا استقبال کسی بادشاہ کی طرح کیا جاتا ہے۔ نہ صرف اُن کے کھانے پینے اور رہنے کا انتظام شاہانہ ہوتا ہے بلکہ دلبستگی کے اور بھی بہت سے سامان ہوتے ہیں۔ شہر سے ''اعلیٰ نسل'' کی طوائفوں کو مجرے کے لیے بلانا اور مقامی آبادی سے ایک دو خوش رو لڑکیوں کا انتظام کر کے انہیں رات کے اندھیرے میں ریسٹ ہاؤس یا بنگلے تک چھوڑ آنا اُن دنوں عام معمول تھا۔ حیرت کی بات تھی کہ شرابی افسروں کے قبضے میں رات بھر رہنے والی یہ لڑکیاں اپنے وارثوں کو پھر قابلِ قبول ہو جاتی تھی۔ فرمانبردار رعایا کی طرح یہ لوگ تسلیم کر لیتے تھے کہ حکمرانوں کو اُن کی عزتیں پامال کرنے کا پیدائشی حق حاصل ہے۔

جیپ کا انتظام کر لیا گیا تھا۔ پورے تین بجے اپنے عملے کے ساتھ میں اُس دوراہے پر پہنچ گیا جہاں سے وزیر صاحب کو میرے تھانے کی حدود میں داخل ہونا تھا...... ہمیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ قریباً پونے چار بجے موٹر سائیکلوں والے سارجنٹ دکھائی دیئے اور اُن

کے پیچھے جھنڈا اُڑاتی وزیر کی لمبی گاڑی نظر آئی۔ اس گاڑی کے پیچھے بھی ایک کار تھی۔ نمبر پلیٹ سے اندازہ ہوا کہ یہ سیکورٹی والے ہیں۔ وزیر صاحب پاس سے گزرے تو ہم بھی اپنی جیپ پر سوار پیچھے ہو لیے۔ مختلف سڑکوں سے گزرنے کے بعد یہ مختصر قافلہ گرومندر چوک میں پہنچا اور وہاں سے ماسٹر علی احمد والی سڑک پر مڑ گیا۔ نیم پختہ سڑک پر تین چار منٹ ہچکولے کھانے کے بعد علی احمد کے دو منزلہ مکان کے سامنے رکیں۔ ارد گرد کے لوگ جمع ہو کر دیکھنے لگے۔ حالانکہ وزیر صاحب نجی دورے پر تھے لیکن مقامی بی ڈی ممبر، پٹواری اور دوسرے سرکردہ لوگوں کو خبر ہو چکی تھی اور وہ استقبال کے لیے موجود تھے۔ وزیر صاحب کلف لگے سفید کُرتے پائجامے میں ملبوس نہرو کیپ پہنے گاڑی سے برآمد ہوئے۔ ماسٹر علی احمد نے آگے بڑھ کر اُن سے ہاتھ ملایا اور چند باتیں کیں۔ اس کے بعد دوسرے لوگوں نے مصافحے کا ''شرف'' حاصل کیا اور وہ علی احمد کے ساتھ بیٹھک میں آ بیٹھے۔ وزیر پربودھ کمار کی عمر قریباً چالیس برس تھی۔ چہرہ سرخ و سپید اور آنکھوں کے نیچے اُبھار تھے جن سے اندازہ ہوتا تھا کہ اپنے جیسے عام لوگوں کی طرح وہ نشے کا رسیا ہے۔ اُس کی صورت دیکھتے ہی میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں زور و شور سے بجنے لگیں اور میرے اندر سے کسی نے پکار کر کہا۔ ''نواز خان! ماسٹر علی احمد کی عزت خطرے میں ہے۔''

وزیر پربودھ کمار قریباً نصف گھنٹہ علی احمد کی بیٹھک میں رہا۔ اس دوران اُس نے اپنا ناپ وغیرہ دیا۔ ہلکی پھلکی گفتگو کی اور شربت بھی پیا۔ ان تمام باتوں کی تفصیل زیادہ اہم نہیں۔ جو اہم بات ہوئی وہ یہ تھی کہ وزیر صاحب سے علی احمد کے اہلِ خانہ کا تعارف بھی کرایا گیا۔ ''اہلِ خانہ'' میں صرف ایک بیٹی ہی تھی، یعنی فرحت۔ فرحت کا تعارف کرانے والی خود ''باجی جان'' تھی۔ پہلے وہ اکیلی اندر آئی۔ اُس نے حسبِ معمول خستہ حال لباس پہن رکھا تھا۔ چہرے پر درویشانہ لاپرواہی طاری تھی۔ وزیر موصوف نے باقاعدہ اُٹھ کر اُسے نمستے کیا اور حال احوال پوچھا۔ اُن دونوں کی باتوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ایک دوسرے کو پہلے سے جانتے ہیں اور وزیر صاحب، درویشانہ صفتوں کی وجہ سے ''باجی جان'' کا احترام کرتے ہیں۔

مختصر گفتگو کے بعد ''باجی جان'' نے کہا۔ ''پربودھ جی! میں آپ کو ماسٹر صاحب کی بیٹی سے ملواتی ہوں۔ ماشاء اللہ بڑی ذہین بچی ہے۔'' پھر وہ جلدی سے باہر گئی اور تھوڑی دیر بعد فرحت کو اپنے ساتھ اندر لے آئی۔ زرد شلوار قمیص میں ملبوس سفید چادر اوڑھے ہوئے فرحت خوبصورتی اور وقار کا مجسمہ لگتی تھی۔ اندر آ کر وہ ذرا جھجکی پھر لمبی پلکیں اُٹھا کر وزیر موصوف کو دیکھا اور سر جھکا کر سلام کیا تب پاس ہی ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ میں نے دیکھا فرحت پر نگاہ

پڑتے ہی وزیر کا چہرہ کسی اندرونی جذبے سے تمتما اٹھا۔ جیسے کئی دن کے بھوکے نے کوئی نہایت لذیذ ڈش سامنے دیکھ لی ہو۔ اُس کی باچھیں کھل گئیں۔ اپنے لہجے میں دنیا جہان کی خوش اخلاقی سمیٹ کر بولا۔

''آپ کی تو بہت تعریف سنی ہے میں نے۔ ''باجی جان'' کہتی ہے آپ نے ڈویژنل سطح کے تقریری مقابلوں میں ٹاپ کیا تھا۔''

''جی'' فرحت نے مختصر جواب دیا۔

''کون سا کالج ہے آپ کا؟'' پربودھ کمار نے بات بڑھانے کی غرض سے کہا۔ فرحت نے اپنے کالج کا نام بتایا۔ پربودھ کمار کالج کے بارے میں دیگر تفصیلات پوچھنے لگا۔ اس نے بغیر کسی درخواست کے فرحت سے ''وعدہ'' کرلیا کہ وہ اپنی بے پناہ مصروفیت سے وقت نکال کر کسی روز اُن کے کالج آئے گا۔ پربودھ کمار کی لچھے دار باتیں سن کر مجھے لگا جیسے کوئی آدم خور پودا کسی چھوٹے سے کیڑے کو شکار کرنے کے لیے اُسے اپنے لیس دار لعاب میں جکڑ رہا ہے۔ پتہ نہیں وہاں موجود دوسرے لوگوں کو ایسا محسوس ہورہا تھا یا نہیں لیکن مجھے ضرور یقین ہو گیا تھا کہ اس وزیر کی آنکھ میں سؤر کا بال ہے اور وہ ماسٹر احمد علی کی جوان بیٹی کو اُس کی خوبصورتی کے لیے کبھی معاف نہیں کرے گا۔ اب ''باجی جان'' کا پُراسرار منصوبہ میرے لیے ڈھکا چھپا نہیں تھا۔ ایک طرف تو وہ باسط علی کو جھوٹے سچے چکروں میں پھنسا کر ملک سے باہر بھیج رہی تھی اور دوسری طرف اس وزیر ''شکاری'' کو شکار کے قریب لانے کے موقعے پیدا کر رہی تھی۔ میں نے وہیں کھڑے کھڑے یہ فیصلہ کرلیا کہ کچھ بھی ہوجائے گا باسط علی کو یہ میدان خالی نہیں کرنے دوں گا اور اُس کو سب کچھ بتانے کے بعد یہ کوشش کروں گا کہ وہ ملک سے باہر نہ جائے۔ جب میں یہ سب کچھ سوچ رہا تھا، باجی جان وزیر موصوف کے قریب جھکی ہوئی کچھ کھسر پھسر کررہی تھی۔ وزیر بار بار اپنا سر اقرار میں ہلا رہا تھا۔ اپنی حرکات وسکنات سے وہ خود کو بے حد مہذب اور شائستہ ظاہر کررہا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ ماسٹر احمد علی اور اس کی جاذب نظر بیٹی بھی کمرے میں موجود تھے۔ وزیر سے گفتگو مکمل کرنے کے بعد باجی جان مطمئن نظر آنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد جب وزیر صاحب اس سڑک اور گلی کی تعمیر کے لیے چار ہزار روپے کے ''خصوصی عطیے'' کا اعلان کرنے کے بعد واپس جارہے تھے، باجی جان تیزی سے میرے پاس آئی اور سرگوشی کے انداز میں بولی۔

''تھانیدار جی! میں نے وزیر صاحب سے بات کرلی ہے۔ تم وہ لڑکے والا پاسپورٹ مجھے دے دو۔ وزیر صاحب اُس کا انتظام کردیں گے۔''

میں نے بہانہ بنایا۔ ''لیکن وہ تو میں نے ویزے کے لیے ایک آدمی کو دے رکھا ہے۔''

وہ گردن سے پسینہ پونچھتی ہوئی بولی۔ ''تو واپس لو نا اُس سے۔ مجھے کل تک پاسپورٹ چاہیے یا پھر ویزا لگوا دو۔ یہ دیر کرنے والا کام نہیں ہے۔'' اس کے لہجے میں تحکم تھا۔

میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''اچھا پھر کرتا ہوں کچھ نہ کچھ۔''

وزیر اور اس کے ساتھی اپنی گاڑیوں میں بیٹھ رہے تھے اچانک میری نظر بلال شاہ پر پڑی۔ وہ موقعے سے کچھ ہٹ کر ایک گلی کے موڑ پر کھڑا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں سائیکل تھی اور انداز ہوتا تھا کہ وہ اس سائیکل کو بے حد تیزی سے بھگاتا یہاں تک پہنچا ہے۔ جونہی میری نگاہ بلال شاہ سے ملی اُس نے سر کے اشارے سے مجھے اپنی جانب بلایا۔ میں جیپ کی طرف جاتے جاتے رک گیا اور رُخ پھیر کر بلال شاہ کی طرف بڑھا۔ کسی نے خاص طور پر میری طرف توجہ نہیں دی۔ میں تنگ سی گلی میں پہنچا تو بلال شاہ سائیکل کو دیوار کے سہارے کھڑا کر چکا تھا۔ اُس کے چہرے پر وہی تاثرات تھے جو کسی سنسنی خیز خبر کے موقع پر نظر آیا کرتے تھے۔ میں چونک گیا۔

''کیا بات ہے'' میں نے پوچھا۔ اس کے ساتھ ہی میری نظر بلال شاہ کے ہاتھ پر پڑی۔ اس کی آستین پر خون کے دھبے نظر آرہے تھے۔

''وہ..... وہ جی باسط..... علی۔'' بلال شاہ ہکلایا۔

''کیا ہوا اُسے؟'' میں نے تیزی سے پوچھا۔

اس سے پہلے کہ بلال شاہ جواب دیتا، مجھے عقب میں قدموں کی آواز سنائی دی۔

میں نے مڑ کر دیکھا۔ ہمارے پیچھے ''باجی جان'' کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں میں وہی شرارت آمیز چمک تھی جسے دیکھ کر میرا دماغ گھومنے لگتا تھا اور بلال شاہ کا خون خشک ہوجاتا تھا۔

''کیا بات ہے مچھندر؟ تم یہاں کیا کرنے آ گئے ہو؟'' اس نے مجھے نظرانداز کرتے ہوئے بلال شاہ سے پوچھا۔

''کچھ نہیں..... ذرا ایک کام پڑ گیا تھا۔'' بلال شاہ نے بُرا سا منہ بنانے کی کوشش کی۔ باجی جان اب اُسے بڑی روانی سے مچھندر کہتی تھی اور وہ بڑی آسانی سے یہ لفظ ہضم کرلیتا تھا۔

''یہ تمہاری آستین پر خون کیسا ہے؟'' باجی جان نے کڑے لہجے میں پوچھا..... کوئی اور یہ بات پوچھتا تو بلال شاہ بھڑک اُٹھتا۔ گردن اکڑا کر کہتا۔ ''تُو تھانیدارنی لگی ہوئی ہے یہاں کی۔ جا نہیں بتاتا میں۔'' لیکن چونکہ وہ باجی جان کے نیچے لگ چکا تھا لہٰذا ایسا کوئی جواب اس

کے دماغ میں آیا ہی نہیں۔ اُس نے خون آلود آستین پشت پر چھپانے کی کوشش کی، اور ہکلا کر بولا۔ ''وہ...... رستے میں ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا کسی کا۔ اسے سڑک سے اٹھایا تھا۔''

باجی جان گھوم کر بلال شاہ کی پشت پر آئی۔ آستین پشت پر چھپانے پر کچھ خون بلال شاہ کی قمیص پر بھی لگ گیا تھا۔ باجی جان بولی۔ ''ہائے تیری تو قمیص بھی پیچھے سے لالو لال ہے۔ یہ تیرے ساتھ ہوا کیا ہے؟ کسی چھری چاقو پر تو نہیں بیٹھ گیا تھا تُو؟''

بلال شاہ سے کوئی جواب بَن نہیں پڑ رہا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ یہ منہ پھٹ عورت اُس کا مذاق اُڑا رہی ہے لیکن وہ اس مذاق کا جواب بھلا کیا دیتا۔ وہ تمسخر سے بولی۔ ''وے مچھندر تُو بچ تو گیا ہے ناں......؟ ماں صدقے...... کیوں اس طرح گھر سے اکیلا نکل آیا تھا...... ہائے ساری قمیص خوناں خون ہو رہی ہے۔''

وہ شاید بلال شاہ کو کچھ اور بھی زچ کرتی مگر اس دوران وزیر پر بودھ کمار صاحب جانے کے لیے تیار ہو گئے اور کسی نے باجی جان کو آواز دے کر بلا لیا۔ وہ چلی گئی تو بلال شاہ نے کڑوا گھونٹ بھر کر کہا۔

''خان صاحب! باسط علی کو محلّے کے کچھ لڑکوں نے بری طرح مارا ہے۔ وہ تو خیریت گزری کہ میں اُدھر سے گزر رہا تھا، کچھ راہگیروں کے ساتھ مل کر میں نے اسے ان کے پنجے سے نکالا اور تھانے لے آیا...... میں نہ ہوتا تو پتہ نہیں کیا ہو جاتا۔ اُس کا سر پھٹ گیا ہے اور بوتل کا شیشہ لگنے سے ایک بازو بھی زخمی ہوا ہے۔''

میرا دھیان فوراً اس طوائف کی طرف چلا گیا جس نے کچھ دن پہلے باسط پر اپنی بیٹی سے زبردستی کرنے کا الزام لگایا تھا۔ کہیں یہ وہی چکر تو نہیں تھا۔ میں نے یہ سوال بلال شاہ سے پوچھا تو وہ زور زور سے نفی میں سر ہلانے لگا۔ بولا۔ ''یہ کوئی اور چکر ہے جی۔ کوئی پستول شتول کا مالمہ ہے۔ آپ یہاں سے فارغ ہو کر ذرا جلدی تھانے آ جائیں۔''

وزیر صاحب کی رخصتی کے فوراً بعد میں تھانے پہنچا تو باسط علی کو اپنے کمرے میں بنچ پر لیٹے پایا۔ اُس کے سر اور بازو پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ عجیب اتفاق تھا یہ...... چند روز پہلے باسط کی محبوبہ یعنی فرحت بھی اسی بنچ پر لیٹی تھی۔ جیسا کہ قارئین کو یاد ہو گا وہ باسط کو رہا کرانے کے لیے بٹوے میں ہزار روپے کے نوٹ ڈال کر یہاں آئی تھی اور شدید بخار کے سبب بے ہوش ہو گئی تھی...... مجھے دیکھ کر باسط علی جلدی سے اُٹھ بیٹھا۔ میں نے اُسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور اپنی کرسی سنبھال لی۔ باسط علی آج بھی نشے میں تھا لیکن زیادہ آؤٹ نہیں تھا۔ آنکھوں میں حسب معمول ویرانی ناچ رہی تھی۔

میں نے کہا۔ ''ہاں بھئی! یہ نیا پھڈا کیا ڈالا ہے تم نے؟''

وہ بولا۔ ''میں نے کوئی پھڈا نہیں ڈالا جی...... ہمارے پڑوسی راہول سنگھ کے پاس لائسنس یافتہ پستول ہے۔ اُس کا بڑا لڑکا بابو ہمارے پاس اُٹھا بیٹھا کرتا تھا۔ میں نے ایک دو بار اُس کے پاس باپ کا پستول دیکھ کر اُسے منع کیا۔ وہ باز نہیں آیا تو میں نے اُس کے باپ سے اُس کی شکایت کر دی۔ یہ کوئی چار مہینے پہلے کی بات ہے جی۔ بابو نے اپنے دل میں خار رکھی ہوئی تھی۔ ایک دو بار مجھے دھمکیاں بھی دے چکا تھا۔ آج میں بازار سے گزرا تو دوستوں کے ساتھ مل کر مجھے گھیر لیا۔''

میں نے باسط کی پوری روئیداد دھیان سے سنی...... وہ مجھ سے بے حد ڈرا ہوا تھا اور باتیں کرتے ہوئے بار بار خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتا تھا۔ اُس کے رویے سے صاف ظاہر تھا کہ باجی جان اُسے پولیس سے خاصا ڈرا دھمکا چکی ہے۔ خاص طور پر میرے حوالے سے اُسے بہت خوف زدہ کیا گیا ہے۔ اپنی کتھا سنانے کے بعد وہ لرزاں لہجے میں بولا۔ ''تھانیدار صاحب! اس بار مجھے جانے دیں۔ آئندہ آپ کو شکایت کا موقع دوں گا اور نہ اپنی صورت دکھاؤں گا۔''

میں نے کہا۔ ''یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ تم جس طرح کے لوگوں میں اُٹھتے بیٹھتے ہو، تم تھانے سے دور رہ ہی نہیں سکتے۔''

وہ بولا۔ ''میں ملک چھوڑ کر جا رہا ہوں جناب...... باجی جان مجھے رنگون بھجوا رہی ہیں۔ وہاں انہوں نے میری نوکری کا انتظام بھی کر دیا ہے۔ بس ایک دو کاغذ تیار ہونے والے ہیں۔ پھر میں نکل جاؤں گا۔''

یہ فقرے ادا کرتے ہوئے باسط کی خوفزدہ آنکھوں میں عجیب سی اُداسی سمٹ آئی۔ جیسے وہ فرحت کو اپنے سامنے دیکھ رہا ہو۔ اپنی نگاہوں سے اس کے چہرے کو الوداعی بوسے دے رہا ہو۔ وہ کاغذوں کی بات کر رہا تھا۔ اُسے معلوم نہیں تھا، یہ کاغذ یعنی پاسپورٹ وغیرہ ''باجی جان'' مجھ سے ہی تیار کروا رہی ہے۔

میں نے پوچھا۔ ''رنگون جانے کا مشورہ کس نے دیا تھا؟''

وہ بولا۔ ''میرا دل یہاں سے اچاٹ ہو گیا ہے جی...... اور باجی جان بھی یہی کہتی ہیں کہ میں یہاں سے چلا جاؤں۔ وہ مجھ سے بہت محبت کرتی ہیں۔ ہر وقت ڈرتی رہتی ہیں کہ کوئی بھی مجھے نقصان نہ پہنچا جائے اور ان کا ڈرنا ٹھیک ہی ہے...... اس شہر میں رہا تو کوئی نہ کوئی پھڈا ضرور چل جائے گا میرا۔''

میں نے کہا۔ ''اور وہ لڑکی...... جسے پیار کرتے ہو تم؟''

اُس کا چہرہ ایک دم بجھ سا گیا۔ کچھ دیر خاموش رہ کر بولا۔ ''وہ اپنی قسمت میں نہیں ہے جی۔ زیادہ سے زیادہ ایک برس تک اس کی شادی ہو جاتی ہے اور میں برما چلا گیا تو تین چار سال سے پہلے کہاں لوٹوں گا۔''

میں نے گہری نظروں سے اُسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم برما نہیں جاؤ گے...... یہیں رہو گے۔ اسی شہر میں اسی محلّے میں۔''

وہ آنکھیں پھاڑ کر مجھے دیکھنے لگا، جیسے میری بات سمجھ نہ پا رہا ہو۔ میں نے اُس کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو...... تمہارے گرد ایک گہری سازش کا جال بُنا جا رہا ہے۔ بہت گہری اور خطرناک سازش۔ تمہیں مجھ سے یا پولیس سے ڈرنے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ میں تمہارا ہمدرد ہوں اور تمہارے ساتھ ہوں۔ اُس کرن والے کیس میں بھی تم پر کوئی پکڑ نہیں ہو گی۔ تم رنگون جانے کا ارادہ ملتوی کر دو اور اگر کوئی تمہیں جانے پر مجبور کر رہا ہے تو اُس کی بات مت مانو۔ صاف کہہ دو کہ فی الحال میرا جانے کا ارادہ نہیں...... میری بات سمجھ رہے ہو ناں۔''

وہ حیرت سے میرا چہرہ تکے چلا جا رہا تھا۔ آنکھوں میں بے یقینی کی کیفیت تھی۔ کہنے لگا۔ ''کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ باجی جان مجھے کسی سازش میں الجھا رہی ہیں؟''

میں نے پوچھا۔ ''یہ مطلب تم نے کیسے نکالا ہے؟''

وہ بولا۔ ''باجی جان مجھے یہ بتاتی رہی ہیں کہ آپ ہر صورت مجھے گرفتار کرنا چاہتے ہیں اور اُس طوائف والے معاملے میں مجھے کچھ نہیں تو سات آٹھ سال قید ضرور ہو جائے گی...... جبکہ آپ فرما رہے ہیں کہ ایسی کوئی بات ہی نہیں ہے۔''

میں نے کہا۔ ''تم جو نتیجہ نکالنا چاہو نکال سکتے ہو، لیکن فی الحال میں تمہارے سوال کا جواب نہیں دے سکتا۔ اس سازش میں باجی جان کا کردار ہے یا نہیں اور اگر ہے تو کیا، اس کا پتہ وقت آنے پر چل جائے گا۔ سرِ دست تم باجی جان سے اپنا رویہ بالکل نارمل رکھو...... صرف اس بات پر اڑ جاؤ کہ تم رنگون نہیں جاؤ گے۔''

مشکل تو پیش آئی لیکن میں نے کوشش کر کے باسط کو اعتماد میں لے لیا اور اسے کہا کہ بیرونِ ملک جانے سے انکار کر دے...... وہ مجھ سے اندر کی بات پوچھنے کے لیے بے قرار ہو رہا تھا لیکن میں نے اُسے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ فی الحال میں بھی اندھیرے میں ہوں۔

☆======☆======☆

اگلے روز چھٹی تھی۔ میں گھر ہی میں تھا۔ سر میں درد تھا۔ دوا کھا کر لیٹا ہوا تھا۔ اتنے میں بلال شاہ آ دھمکا۔ وہ سخت جھلایا ہوا تھا۔ آتے ساتھ ہی میرے لتّے لینے لگا۔

''بس خان صاحب! بہت ہو چکی۔ اب میرے لیے بہتر یہی ہے کہ یہ شہر چھوڑ کر چلا جاؤں۔ غضب خدا کا...... لگتا ہے ہم مجرم ہیں اور وہ موٹی الّو کی پٹھی تھانیدار ہے ہم پر۔ کل اُس نے آپ کے سامنے میری بے عزتی کی ہے اور آپ منہ میں گھنگنیاں ڈال کر کھڑے رہے ہیں۔ میرے خیال میں تو وہ مجھے جوتے بھی مارنے لگتی تو آپ خاموش کھڑے رہتے۔''

میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ ''تو کیا تم اُس سے جوتے کھا لیتے؟''

بلال شاہ کو فوراً غلطی کا احساس ہوا۔ بھڑک کر بولا۔ ''یہ تو پھر آپ دیکھ لیتے ناں کہ کون جوتے کھاتا ہے اور کون مارتا ہے۔ قسم خدا کی آپ کی وجہ سے چپ ہوں ورنہ اُس ہتھنی کو قتل کر کے ڈلہوزی نہ بھاگ جاؤں تو بلال شاہ نام نہیں۔''

بلال شاہ کی آنکھوں میں شعلے رقصاں تھے۔ میں نے اُسے چھیڑتے ہوئے کہا۔ ''جتنے رُعب دار تم اب نظر آ رہے، اتنے اُس موٹی کی سامنے نظر آؤ تو کیا مجال اُس کی کہ تمہارے سامنے چُوں بھی کرے...... لیکن اُس کے سامنے تو تم...... خیر چھوڑو اس بات کو۔''

بلال شاہ نے آنکھیں نکال کر کہا۔ ''دیکھیں خان صاحب! آپ مزہ لے رہے ہیں لیکن مزے مزے میں بات آپ کے ہاتھ سے نکل جائے گی...... اخبار سے پتہ چلنا ہے آپ کو کہ بلال شاہ نے موٹی کو قتل کر دیا ہے اور یہ قتل بھی ایسا یادگار ہو گیا کہ دنیا دیکھے گی۔''

بلال شاہ کا چہرہ خوفناک ہو رہا تھا، جیسے موٹی اُسے سامنے نظر آ رہی ہو اور وہ چھریاں مار مار کر اُس کی آنتیں باہر نکال رہا ہو...... میں نے بلال شاہ کو حقیقت کی دنیا میں واپس لانے کے لیے ذرا سنجیدہ لہجہ اختیار کیا اور کہا۔

''دیکھو بلال شاہ! باجی جان سے دشمنی میں تم تنہا نہیں ہو۔ وہ ہم دونوں کی قرض خواہ ہے۔ ہم اُس کا قرض اتاریں گے اور بمعہ سود اُتاریں گے لیکن اس کے لیے ذرا صبر تحمل کی ضرورت ہے۔ تم دیکھ ہی چکے ہو وہ کوئی ایویں شیویں شے نہیں ہے۔ وزیروں امیروں تک اس کی پہنچ ہے۔ ہمیں اُسے اوپر سے پکڑنا ہو گا، تب وہ قابو آئے گی۔''

بلال شاہ چڑ کر بولا۔ ''بس آپ کبھی اُسے اوپر سے پکڑیں کبھی نیچے سے اور وہ ہمیں دھوبی پٹکے مارتی رہے۔''

''بھئی مارتی ہے تو مارتی رہے۔ ہماری کون سی گنڈ لگ گئی ہے۔ کشتی جاری ہی ہے ناں۔ آج نہیں تو کل اسے ہمارے نیچے آنا ہی آنا ہے۔''

باجی جان کو نیچے لانے کا تصور بلال شاہ کے لیے فرحت بخش تھا۔ اس کی آنکھوں کے شعلے ذرا ٹھنڈے پڑنے لگے۔ ”بُو ہلی کتے کی طرح بلال شاہ کے دانت چمک رہے تھے۔ شاید وہ خیالوں ہی خیالوں میں باجی جان کے چیتھڑے اُڑا رہا تھا۔ میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں، باجی جان یہاں ایک مشن پر ہے، اور وہ مشن اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ ٹیلر ماسٹر احمد علی کی بیٹی فرحت کسی طرح وزیر پر بودھ کمار کی آغوش میں پہنچ جائے۔ ہمیں اس مشن کو ناکام بنانا ہے۔ اگر یہ مشن کامیاب ہو گیا تو سمجھو باجی جان آندھی سے طوفان بن جائے گی۔“

بلال شاہ پوری توجہ سے میری بات سن رہا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں فرحت اور باسط کو ایک دوسرے کے قریب لانا چاہتا ہوں، تاکہ اُن کی آپس کی غلط فہمیاں دور ہوں اور وہ باجی جان کے لیے ”نرم چارہ“ نہ بنے رہیں۔ میں نے بلال سے کہا کہ وہ علی الصبح کسی طرح فرحت سے رابطہ قائم کرے اور میری اس سے ملاقات کرائے۔ بلال شاہ نے یہ ذمہ داری قبول کر لی۔

دوسرے روز سہ پہر کے وقت وہ کامیابی سے فرحت کو میرے پاس لے آیا۔ طبیعت کی خرابی کے سبب میں آج بھی گھر ہی میں تھا۔ فرحت جھجکتی ہوئی اندر آئی اور چارپائی کے پاس کرسی پر بیٹھ گئی۔ ایک فائل کور اُس کے ہاتھ میں تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ بلال شاہ اُسے کالج سے سیدھا یہاں لے آیا ہے۔ میں نے بلال شاہ کو چائے بنانے کا کہا اور خود فرحت سے باتوں میں مصروف ہو گیا۔ پچھلی ملاقات میں وہ مجھ سے کافی بے تکلف ہو چکی تھی۔ اُس نے اپنے اور باسط کے بارے بہت کچھ مجھے بتا دیا تھا۔ لہٰذا بات شروع کرنے میں مجھے زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔ میں نے اُسے کہا۔

”فرحت، میں تمہارا بڑا بھی ہوں، دوست بھی اور ہمدرد بھی۔ یقین کرو، تمہیں دیکھتا ہوں تو لگتا ہے کہ جیسے تم ابھی ابھی مجھے میلہ چراغاں سے ملی ہو اور میں تمہاری کلائی پکڑ کر تمہیں اپنے گھر لے جا رہا ہوں......“

فرحت نے کہا۔ ”مجھے بھی یہی لگتا ہے کہ ایک بار پھر مجھ روتی بلکتی کو کسی نے گود میں اُٹھا لیا ہے اور سر پر پیار سے ہاتھ رکھا ہے......نواز صاحب! پلیز مجھے رستہ دکھائیے۔ میں آج پھر بھٹکی ہوئی ہوں۔“

میں نے کہا۔ ”تم بھٹکی ہوئی نہیں ہو۔ بس ذرا اِدھر اُدھر دیکھ رہی ہو۔ میں نے تمہارے حالات پر اچھی طرح غور کیا ہے اور ایک ہی بات سمجھ میں آئی ہے کہ تمہیں اور باسط کو زیادہ دیر

ایک دوسرے سے دور نہیں رہنا چاہیے۔ ورنہ یہ غلط فہمیاں بہت زیادہ بڑھ جائیں گی۔“

وہ بولی۔ ”میں تو خود اس سے ملنا چاہتی ہوں، لیکن وہ کہیں ملے بھی۔ مجھے تو یہ پتہ چلا ہے کہ وہ رنگون جانے کا پروگرام بنا رہا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”اب وہ نہیں جائے گا۔ یہ میں تمہیں گارنٹی دیتا ہوں لیکن تم اُسے جلد سے جلد مل کر اپنا اور اس کا دل صاف کر لو۔ وہ اچھا لڑکا ہے، بُرا لڑکا نہیں ہے لیکن اگر تم اُس سے دور رہیں تو وہ بُرا بن جائے گا۔ شاید اپنی زندگی ہی برباد کر لے......“

فری کے چہرے پر قوسِ قزح کے رنگ لہرانے لگے۔ وہ اپنے اور باسط کے بارے سوچ کر شرما رہی تھی۔ قریباً نصف گھنٹے کی گفتگو میں مَیں نے اُسے قائل کر لیا کہ وہ پرسوں کسی وقت باسط سے ضرور ملے گی۔“

اس واقعے کے بعد سات آٹھ دن گزر گئے لیکن فرحت کا کچھ پتہ چلا اور نہ باسط کی طرف سے ہی کوئی خبر آئی۔ معلوم نہیں اُن کی ملاقات ہوئی بھی تھی یا نہیں اور اگر ہوئی تھی تو اُس کا نتیجہ کیا نکلا تھا۔ طویل انتظار کے بعد میں نے بلال شاہ کو خبر لانے کے لیے بھیجا۔ وہ باسط کے گھر پہنچا۔ وہاں سے پتہ چلا کہ وہ دکان کے لیے کپڑا وغیرہ خریدنے لائل پور گیا ہوا ہے۔ یہ خبر حوصلہ افزا تھی۔ اس کا مطلب تھا میری بات نے باسط کے دل پر اثر کیا ہے اور وہ نئے سرے سے دکانداری شروع کر رہا ہے لیکن باسط اور فرحت کی ملاقات کے بارے کچھ پتہ نہیں چل سکا۔ میں نے بلال شاہ کو فرحت کی طرف بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ وہ حسبِ سابق بڑی ہوشیاری سے فرحت کو کالج کے راستے میں ملا اور اس تک میرا پیغام پہنچایا۔ فرحت نے کہا کہ اس وقت وہ مصروف ہے۔ ایک دو دن میں خود وقت نکال کر مجھ سے مل لے گی۔ بلال شاہ نے واپس آ کر مجھے یہ بھی بتایا کہ وہ بہت افسردہ نظر آ رہی تھی......فرحت کے لیے مجھے دو دن مزید انتظار کرنا پڑا۔ ایک سہ پہر وہ برقعے میں لپٹی تیز قدموں سے تھانے میں داخل ہوئی اور سنتری سے پوچھ کر سیدھا میرے کمرے میں آ گئی۔ اتفاقاً اُس وقت میں تنہا اور فارغ تھا۔ میں نے سنتری سے کہا کہ وہ دروازے پر چق گرا دے۔ چق گری تو فرحت نے نقاب اٹھا دیا۔ اُس کی خوبصورت آنکھیں سُرخ اور آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھیں۔ میں نے کہا۔ ”کیا بات ہے رو رہی ہو؟“ وہ چھوٹے سے رومال کے ساتھ ناک رگڑ کر سُوں سُوں کی آواز نکالنے لگی۔ اب تک کی ملاقاتوں سے میں اس نتیجے تک پہنچا تھا کہ اگرچہ فرحت برقع پہنتی ہے اور جلدی سے شرما جاتی ہے لیکن وہ خاصی حد تک بے باک اور روشن خیال لڑکی ہے۔ اپنے دل کی بات مجھ سے کہنے میں وہ خاطر خواہ دلیری سے کام لیتی تھی۔ میں اُس کی طرف سوالیہ

نظروں سے دیکھ رہا تھا وہ پلکیں جھکائے جھکائے تیزی سے بولی۔

''نواز صاحب! میں اب کبھی اُس کی طرف نہیں جاؤں گی۔ وہ مجھے دل سے نکال چکا ہے۔ بھلا چکا ہے مجھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ اتنا پتھر دل نہ بنتا۔ اس طرح بار بار مجھے نہ ٹھکراتا۔'' وہ ہچکیوں سے رونے لگی۔

میں نے پوچھا۔ ''آخر ہوا کیا ہے۔ تم اس کی طرف گئی تھیں؟''

وہ بولی۔ ''ہاں...... اور اس سے پہلے بھی میں ایک دفعہ یہ کوشش کر چکی ہوں۔ دو ڈھائی ماہ پہلے جب اُس نے میرے لگاتار خطوں اور پیغامات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ تو میں اُس کی طرف گئی تھی۔ اس سے پوچھنا چاہتی تھی کہ وہ مجھ سے کیا چاہتا ہے۔ کیوں اس طرح اپنی زندگی میں زہر گھول رہا ہے...... لیکن اس نے مجھے اپنی دکان میں دیکھا تو وہاں سے اٹھ کر ہی چلا گیا۔ اس کے ملازم لڑکے نے مجھے چائے وغیرہ پلائی۔ میں کوئی ایک گھنٹہ اُس کی دکان میں بیٹھی رہی لیکن وہ مڑ کر نہیں آیا۔ پچھلے جمعے آپ کے کہنے پر میں نے اُسے پیغام بھیجا تھا کہ میں اس سے ایک بہت ضروری بات کرنا چاہتی ہوں۔ وہ صرف ایک بار مجھ سے مل لے۔ میں نے کہا تھا کہ میں خود اس کی دکان پر آجاؤں گی۔ وہ ہفتے کے روز دو اور چار بجے کے دوران دکان پر ہی موجود رہے...... اگلے روز کوئی تین بجے اُس کی دکان پر پہنچی تو وہاں سکھ ملازم لڑکا بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے بتایا کہ بھاجی بارہ بجے لائلپور چلے گئے ہیں دکان کے لیے کپڑا لانے۔ میرے ساتھ میری ایک سہیلی بھی تھی۔ ہم دونوں چپ چاپ واپس لوٹ آئیں...... اب...... اب آپ ہی بتائیں نواز صاحب...... ایک لڑکی...... ایک لڑکی اس سے زیادہ اور کیا کر سکتی ہے۔''

فرحت کا چہرہ خجالت اور شرمندگی سے سرخ ہو رہا تھا۔ آنسو بار بار اُس کی آنکھوں سے ڈھلک آتے تھے۔ شاید اس نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ ایک لڑکی اس سے زیادہ اور کیا کر سکتی ہے۔ وہ ایک پردہ دار گھرانے کی مسلمان لڑکی تھی۔ اُس کا خاندان نیک نام تھا اور اس کا باپ محلے بھر میں سب سے شریف سمجھا جاتا تھا۔ پھر بھی وہ ساری رکاوٹیں توڑ کے اور اپنی فطری شرم و حیا پر قابو پا کر اپنے روٹھے محبوب کو منانے کی کوششیں کر چکی تھی۔ اپنی نیک نامی داؤ پر لگا کر اُس نے نہ صرف باسط کو خط لکھے تھے بلکہ خود چل کر اُس کے پاس پہنچی تھی...... وہ اپنے پچھلے رویے پر اس سے زیادہ اور کیا پچھتا سکتی تھی۔ میرے سمجھ میں نہیں آیا کہ باسط نے ایسا کیوں کیا ہے۔ پچھلی ملاقات میں مَیں نے اسے کافی سمجھانے کی کوشش کی تھی اور وہ سمجھ بھی گیا تھا۔ اگر سمجھتا نہ تو پھر نئے سرے سے دکان میں دلچسپی کیوں لیتا اور رنگون جانے کا ارادہ کیوں

بدلتا؟ اچانک میرے ذہن میں ایک نیا خیال آیا۔ میں نے فرحت سے پوچھا۔ ''تم نے باسط کی دکان پر جانے سے پہلے اُسے جو پیغام بھیجا تھا وہ کون لے کر گیا تھا؟''

فرحت نے نظریں جھکائے جھکائے جواب دیا ''خالہ جان۔''

میں ٹپٹا کر رہ گیا۔ ''خالہ جان'' سے فرحت کی مراد ''باجی جان'' تھی۔ وہ اُسی باجی جان کو اپنا پیغام بر بنائے ہوئے تھی جو اندر سے اس کی جڑیں کاٹ رہی تھی۔ یقیناً ایک مرتبہ پھر فرحت کا پیغام باسط تک نہیں پہنچا تھا اور اگر پہنچا تھا تو معلوم نہیں کس شکل میں پہنچا ہوگا۔ مجھے اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہوا۔ مجھے چاہیے تھا کہ میں فرحت کو باجی جان کے متعلق تھوڑا بہت ضرور بتا دیتا۔ درحقیقت یہ باجی جان ہی تھی جس نے ان دونوں کو ایک دوسرے سے دور کر رکھا تھا، ورنہ وہ کوئی ایسے دور بھی نہیں تھے...... میں نے فرحت سے کہا۔ ''میں سمجھ گیا ہوں کہ ہفتے کے روز تمہاری اور باسط کی ملاقات کیوں نہیں ہو سکی...... اگر تم مجھ پر بھروسہ رکھتی ہو تو باسط کی طرف سے اپنا دل بالکل صاف کر لو...... اب تم دونوں کا آمنا سامنا میں کراؤں گا۔ میں ایک پولیس انسپکٹر ہوں اور میری ذمے داریاں کچھ اور طرح کی ہیں لیکن میرا دل چاہ رہا ہے کہ میں تمہاری مدد کروں...... دیکھو فرحت...... تم باجی جان کو خالہ کہتی ہو اور اُس کی عزت کرتی ہو۔ عزت اُسی کی کی جاتی ہے جس کے لیے دل میں جگہ ہو۔ باجی جان نے تمہارے دل میں جگہ بنا رکھی ہے۔ میں باجی جان کے خلاف کوئی بات کروں گا، تو تمہیں برا لگے گا۔ اور میں ایسی بات کرنا بھی نہیں چاہتا۔ کیونکہ میں چاہتا ہوں کہ تم سب کچھ خود دیکھو اور محسوس کرو۔ میرا خیال ہے کہ ایک دفعہ تمہارا اور باسط کا آمنا سامنا ہو گیا تو بہت سی باتوں سے پردہ اٹھ جائے گا۔''

فرحت حیرت سے میری طرف دیکھنے لگی۔ میں اس کی حیرت سمجھ رہا تھا۔ اُسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں جو اشارہ کر رہا ہوں وہ درست ہے...... وہ ''باجی جان'' کے متعلق کوئی ایسی بات سوچ بھی نہ سکتی تھی۔ اسی دوران ایک کیس تھانہ میں آ گیا اور فرحت کو میرے پاس سے اٹھ کر جانا پڑا۔

اگلے روز شام کو میں سادہ کپڑوں میں باسط کی دکان پر پہنچا۔ گرومندر کے ایک بھرے پُرے بازار میں یہ دکان بڑے اچھے موقعے پر تھی۔ ایک قطار میں آٹھ دس قمقمے لگے ہوئے تھے۔ سامنے والی دیوار شیشے کی تھی۔ ان شیشوں کی وجہ سے دکان میں جگمگ ہو رہی تھی۔ کاؤنٹر پر باسط علی موجود تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ جلدی سے کھڑا ہو گیا۔ آگے بڑھ کر مصافحہ کیا۔ پھر ملازم لڑکے کو چائے لانے دوڑایا۔ دکان کے عقب میں ایک چھوٹا سا کمرہ تھا وہاں ہم آ بیٹھے۔

میں نے باسط سے پوچھا کہ ہفتے کی شام وہ کہاں تھا؟

اُس نے کہا۔ ”میں لائل پور چلا گیا تھا...... کپڑا لینے۔“

میں نے پوچھا۔ ”فرحت کا پیغام تمہیں نہیں ملا تھا؟“

”کون سا پیغام؟“ اُس نے منہ پھاڑ کر پوچھا۔

میرا اندازہ درست نکلا تھا۔ ’باجی جان‘ نے اسے سرے سے کوئی پیغام ہی نہیں پہنچایا تھا۔ میں نے کہا۔ ”فرحت نے تمہیں باجی جان کے ہاتھ جو پیغام بھیجا تھا۔ وہ تم سے کوئی بہت ضروری بات کرنا چاہتی تھی۔“

باسط کی آنکھوں میں حیرت اُمڈ آئی۔ ”مجھے تو باجی جان نے کچھ نہیں بتایا بلکہ مجھے تو ہفتے کو بھیجا ہی باجی جان نے تھا۔ باجی جان کہنے لگی، تم ہفتے کو چلے جاؤ، میں بھی تمہارے ساتھ امرتسر تک چلی جاؤں گی...... اُسے وہاں کسی مزار پر چادر چڑھانی تھی۔“

اب ساری بات کھل کر سامنے آ گئی تھی۔ باجی جان نے نہ صرف باسط کو فرحت کے پیغام سے بے خبر رکھا تھا بلکہ اُسے ہفتے کے روز لائل پور بھیجنے والی بھی وہی تھی۔ میں نے یہ ساری بات باسط کو بتائی...... اُس کی آنکھوں میں بے چینی کروٹیں لینے لگی۔ میں نے مختصر لفظوں میں فرحت کا ذکر بھی کیا اور اسے سمجھایا کہ وہ اس سے اتنی دور نہیں جتنا وہ سمجھ رہا ہے۔ جو فاصلے نظر آ رہے ہیں وہ صرف باجی جان کے پیدا کردہ ہیں۔ وہ دونوں ان فاصلوں کو بڑھانے کی بجائے پاٹنے کی کوشش کریں۔“

باسط بولا۔ ”انسپکٹر صاحب! اب آپ سے کوئی بات چھپی ہوئی نہیں رہی۔ آپ یہ بھی جان گئے ہوں گے کہ پچھلے پانچ چھ ماہ میں مَیں کس طرح فری کے پیچھے پیچھے پھرتا رہا ہوں۔ اس کی بے رخی برداشت کرتا رہا ہوں۔ جھڑکیاں تک سہتا رہا ہوں۔ سچ پوچھتے ہیں تو پورے چھ مہینے میں نے جھولی پھیلا کر اس سے محبت کی بھیک مانگی ہے لیکن اب میں نے یہ ارادہ کر لیا ہوا ہے کہ اس سے کچھ نہیں مانگوں گا۔ بس دل سے نکال دی ہے میں نے یہ بات...... اگر میری محبت سچی ہے اور قدرت نے میری تقدیر میں کوئی خوشی لکھ رکھی ہے تو فری خود میری محبت کا اعتراف کرے گی۔“

میں نے مسکراتی نظروں سے اس جذباتی نوجوان کی طرف دیکھا، پھر سنجیدگی سے کہا۔

”بھئی! محبت کا اعتراف وہ کر تو رہی ہے۔ تمہارے لیے رو رہی ہے، خود کو ہلکان کر رہی ہے۔ بار بار تم سے ملنے کے لیے آ رہی ہے۔ اس کے سوا اب کیا چاہتے ہو اور ایک بات یاد رکھو، مشرقی لڑکی کی بہت مجبوریاں ہوتی ہیں۔ وہ اپنی ہمت کے مطابق ان مجبوریوں سے لڑتی ہے

لیکن جب شکست کھا جاتی ہے تو چپ چاپ کسی کی ڈولی میں بیٹھ جاتی ہے۔ پھر تمہارے جیسے نوجوانوں کے پاس پچھتاوے کے سوا اور کچھ نہیں رہ جاتا۔“ میں دیر تک باسط کو اس انداز میں سمجھاتا رہا۔ ڈھکے چھپے طریقے سے میں نے وزیر پربودھ کمار کا ذکر بھی کر دیا اور اُسے بتایا کہ باجی جان نے کس انداز میں فرحت کا تعارف پربودھ کمار سے کروایا تھا، اور مجھے پربودھ کمار کی نیت میں کیا فتور نظر آیا ہے۔ پربودھ کمار کا ذکر سننے کے بعد باسط کی آنکھوں میں کروٹیں لیتی ہوئی بے قراری نمایاں ہو گئی اور یہی میں چاہتا تھا۔

☆======☆======☆

بلال شاہ اس کیس میں بہت سرگرم تھا لہٰذا میں نے بلال شاہ کے ذمے ہی یہ کام لگایا کہ وہ باسط اور فرحت کی ایک ملاقات کا انتظام کرے۔ بلال شاہ نے کنپٹی پر انگلی رکھ کر آنکھیں اوپر کو چڑھائیں اور نچلا ہونٹ عجیب انداز میں موڑ لیا۔ اس طرح وہ سوچ کے گھوڑے دوڑایا کرتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد آنکھیں سیدھی کر کے بولا۔

”بس جی۔ ہو جائے گی یہ ملاقات۔ سب سوچ لیا ہے میں نے۔“

”کیا سوچ لیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

وہ بولا۔ ”یہ فرحت بی بی جس کالج میں پڑھتی ہے اس کے پاس ہی ایک کلب ہے۔ بھلا سا نام ہے اُس کا...... ہاں شائین کلب۔ وہ گول چکر کے دائیں ہاتھ بڑا سا بورڈ لگا ہوا ہے۔ دیکھا ہے ناں آپ نے؟“

مجھے کچھ یاد نہ آیا کہ یہ شائیں کلب کون سا ہے۔ یہ بھی بھلا کوئی نام ہے۔ شائیں کلب...... شائیں شائیں ہوتا تو بات بھی تھی۔ بلال شاہ مجھے خشمگیں نظروں سے گھور رہا تھا۔ تاثرات سے ظاہر تھا کہ میری یادداشت کا ماتم کر رہا تھا۔ اچانک مجھے بلال شاہ کی بات سمجھ میں آ گئی۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”شاہ جی! دودھ جلیبیاں کھا کھا کر تمہارا دماغ ٹھس ہو گیا ہے۔ وہ کلب نہیں ہے، کیفے ہے یعنی ریستوران اور اُس کا نام شائیں نہیں شائین ہے۔ شائین کیفے...... وہی جو گول چکر کے داہنے ہاتھ پیلی بلڈنگ کے ساتھ ہے؟“

بلال شاہ زور زور سے اقرار میں سر ہلانے لگا۔ بولا۔ ”اُس کلب...... میرا مطلب ہے کیفے کا مالک میرا یار بیلی ہے۔ وہ بھی سیالکوٹ کا رہنے والا ہے ہم بچپن میں اکٹھے ہی اخروٹ اور قینچے کھیلتے رہے ہیں۔ میں اُس کلب...... میرا مطلب ہے کیفے میں اُن دونوں کی ملاقات کرا دیتا ہوں۔ بڑی خاموش سی جگہ ہے۔ کوئی ان کو وہ نہیں کرے گا...... کیا کہتے ہیں......؟“

”ڈسٹرب“ میں نے لقمہ دیا۔

"جی ہاں۔کھل کھلا کر گلاں باتاں کر لیں گے۔"

میں نے کہا۔"مجھے تم پر بھروسہ ہے۔جیسا بھی مناسب سمجھو کرو لیکن یہ کام ایک دو دن میں ہو جانا چاہیے۔"

وہ جوش سے بولا۔"کل ہی لو خان صاحب ہم تو ویری دشمنوں کو ایک دوسرے سے ملا دیتے ہیں...... وہ تو پھر...... پسند کرتے ہیں ایک دوسرے کو۔"

بلال شاہ ساری ذمے داری اپنے گھڑے جیسے سر پر لے کر میرے پاس سے چلا گیا۔

اگلے روز شام کو اُس نے آ کر بتایا کہ سارا معاملہ فٹ ہو گیا ہے کل سہ پہر ڈھائی بجے شائین کیفے میں باسط اور فرحت کی ملاقات ہو گی۔ دونوں کو راضی کر لیا گیا ہے اور کیفے کے مالک کو بھی ساری پٹی پڑھا دی گئی ہے۔ میں نے بلال شاہ سے تفصیلات پوچھیں جن کے نتیجے میں پتہ چلا کہ فرحت تو اس ملاقات پر جلد ہی راضی ہو گئی تھی مگر باسط بہت مشکل سے مانا تھا۔

دوسرے روز میں نے تین بجے سے ہی بلال شاہ کا انتظار شروع کر دیا۔ مجھے امید تھی کہ وہ کوئی اچھی خبر لے کر آئے گا۔

لیکن جب ساڑھے چار بجے کے قریب وہ تھانے میں داخل ہوا تو اس کا منہ بری طرح لٹکا ہوا تھا۔ کہنے لگا۔"سارا معاملہ ہی چوپٹ ہو گیا خان صاحب۔"

قریب ہی انسپکٹر باجوہ کھڑا تھا۔ کہنے لگا۔"کہیں ہماری چاچی کا پاؤں پھر تو بھاری نہیں ہو گیا۔"

بلال شاہ اور باجوہ میں خوب نوک جھونک رہتی تھی لیکن اس وقت بلال شاہ بالکل سنجیدہ تھا۔ باجوہ کو نظرانداز کرتے ہوئے بولا۔"وہ کھوتے کا پُتر تو پھر غائب ہو گیا۔"

"کون؟" میں نے پوچھا۔

"وہی...... پاگل کا بچہ باسط۔ وہ پہنچا ہی نہیں کلب میں...... میرا مطلب ہے کیفے میں۔ وہ بیچاری ایک گھنٹہ بیٹھ بیٹھ کر واپس آ گئی ہے۔ میں ابھی چھوڑ کر آیا ہوں اُسے گرومندر چوک میں۔ سارے راستے میں روتی رہی ہے۔"

یہ اطلاع حیران کن تھی۔ میں نے بلال شاہ سے پوچھا کہ باسط ہے کہاں۔ وہ بولا۔

"پتہ نہیں کہاں کھے کھا رہا ہے۔ میں اُس کی دکان سے ہو کر آیا ہوں۔ ملازم لڑکا بتا رہا تھا کہ بارہ بجے تک دکان پر ہی تھا۔ بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا، پھر ایک دم اُٹھ کر چلا گیا، کہنے لگا کہیں کام جا رہا ہوں۔"

باسط کا کردار کچھ عجیب طرح کا تھا۔ سمجھ نہیں آ رہی تھی وہ کیا چاہتا ہے۔ کسی وقت تو یوں

لگتا تھا کہ وہ فرحت سے ملنے کو سخت بے چین ہے اور اُس کی جدائی کسی سزا کی طرح کاٹ رہا ہے اور کسی وقت وہ اُس سے کنی کترا کر یوں نکل جاتا تھا جیسے کوئی تعلق واسطہ ہی نہ ہو۔ میں نے بلال شاہ سے کہا کہ وہ باسط کو ڈھونڈ کر لائے اور جلد سے جلد میری اُس سے ملاقات کرائے۔ بلال شاہ "بہت اچھا" کہہ کر چلا گیا لیکن پورے تین دن گزرنے کے باوجود وہ باسط سے مل سکا اور نہ یہ جان سکا کہ وہ کہاں گیا ہے۔ باسط کے گھر میں تالا لگا ہوا تھا۔ دکان کی چابی ملازم کے پاس تھی۔ وہ روزانہ دکان کھولتا تھا اور سارا دن مکھیاں مار کر چلا جاتا تھا۔ میرے کہنے پر بلال شاہ نے باسط کے بھائیوں سے بھی رابطہ قائم کیا، لیکن کچھ پتہ نہیں چلا۔ بھائیوں نے کہا کہ ایک برس ہونے کو آیا ہے انہوں نے اُس کی صورت نہیں دیکھی۔ جب تین روز گزرنے کے باوجود باسط کا کوئی کھوج کھرا نہیں ملا تو میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ کہیں اُسے زبردستی راستے سے نہ ہٹایا گیا ہو۔ وزیر پر بودھ کمار جیسے لوگوں کے لیے کچھ بھی ناممکن نہیں ہوتا اور پھر جب "باجی جان" جیسی عورتیں اُن کے ہاتھ میں ہوں تو وہ کیا "کارنامہ" انجام نہیں دے سکتے۔ میں صاف طور پر دیکھ چکا تھا کہ باجی جان اپنی منہ بولی بھتیجی اور باسط کو ایک دوسرے سے دور رکھنا چاہتی ہے، اور اس مقصد کے لیے ہر ہتھکنڈا استعمال کر رہی ہے۔ عین ممکن تھا کہ آخری حربے کے طور پر اُس نے باسط کو اغوا ہی کرا دیا ہو۔ وہ فرحت سے ملنے نکلا ہو اور راستے ہی میں وزیر با اختیار کے کارندوں نے اُسے اچک کر کسی کال کوٹھڑی میں پہنچا دیا ہو لیکن دوسری صورت بھی نظرانداز نہیں کی جا سکتی تھی۔ ممکن تھا وہ جذباتی لڑکا، دیوداس بن کر اپنی مرضی سے کسی طرف نکل گیا ہو۔

قریباً ایک مہینہ اسی طرح گزر گیا۔ کوشش کے باوجود باسط کا کچھ پتہ نہیں چلا۔ محلے میں جن لڑکوں سے اُس کی لڑائی ہوئی تھی اُن سے پوچھ گچھ کی گئی اس کے علاوہ میں نے طوائف کرن والا معاملہ بھی پیشِ نظر رکھا لیکن کہیں سے کوئی کھوج ہاتھ نہیں آیا۔ بلال شاہ اور باجوہ کی زبانی مجھے فرحت کے متعلق اطلاع ملتی رہتی تھی۔ وہ بدستور کالج جا رہی تھی۔ وزیر پر بودھ کمار نے اپنا وعدہ پورا کیا تھا اور بڑے ٹھاٹ باٹ سے فرحت کے کالج کا دورہ کیا تھا۔ ایک اخباری اطلاع کے مطابق اُس نے کالج کی لائبریری کے لیے ایک بڑی گرانٹ کا اعلان بھی کیا تھا۔ کالج کی انتظامیہ اس "عوامی خادم" سے بہت خوش تھی اور اُس کا ارادہ تھا کہ سالانہ تقسیم اسناد کے موقعے پر وزیر صاحب کو مہمانِ خصوصی بنایا جائے...... پر بودھ کمار اپنی شیروانیوں کے چکر میں ماسٹر علی احمد کے گھر کا بھی ایک چکر مزید لگا چکا تھا۔ دوسرے لفظوں میں "باجی جان" محبت کی اس بساط پر آہستہ آہستہ اپنے بادشاہ کو آگے بڑھا رہی تھی۔ اب اس

بازی میں باسط کو مات ہو جانا کوئی ناممکن بات نہیں تھی۔ باسط کی سب سے بڑی غلطی یا بدقسمتی یہی تھی کہ وہ اپنے رقیب کے لیے میدان کھلا چھوڑ گیا تھا...... انہی دنوں ایک اور واقعہ رُونما ہوا۔ اس واقعے کے سبب فرحت کے گرد حالات کا گھیراؤ مزید تنگ ہو گیا۔ فرحت کا ایک بھائی ریاض ادھر لاہور میں بی ایس سی کر رہا تھا۔ ایک روز وہ اپنے ایک ہندو دوست کی موٹر گاڑی لے کر مال روڈ کی طرف نکل گیا۔ مال روڈ ان دنوں کافی سنسان ہوا کرتی تھی۔ ریاض تیزی سے جا رہا تھا۔ بارش کے سبب سڑک گیلی تھی۔ فلیٹیز ہوٹل کے آس پاس کہیں گاڑی پھسل گئی اور بے قابو ہو کر فٹ پاتھ پر چڑھ دوڑی۔ ایک امیر انگریز خاتون اور اُس کی ایک سالہ بچی اس گاڑی کے نیچے آ کر جان بحق ہو گئیں۔ ریاض کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس کے پاس لائسنس تک نہیں تھا۔

اس پھڈے میں پڑ کر ماسٹر احمد علی جو پہلے ہی بیمار تھے چارپائی سے لگ گئے۔ گھر میں جو تھوڑی بہت پونجی تھی کچھ علی احمد کی بیماری پر لگی اور کچھ ریاض کے مقدمے پر خرچ ہو گئی۔ ریاض کے ساتھ بدقسمتی یہ ہوئی کہ جس گاڑی کا چلاتے ہوئے اس نے حادثہ کیا تھا، وہ چوری کی نکلی۔ ریاض کے ہندو دوست نے وہ کسی اُچکے سے اونے پونے خرید رکھی تھی۔ جب اُس نے خود کو پھنستے دیکھا تو گاڑی کی ملکیت سے صاف مکر گیا۔ مثل مشہور ہے کہ چور وہی ہوتا ہے جس سے سامانِ مسروقہ برآمد ہو۔ چونکہ سامانِ مسروقہ ریاض سے برآمد ہوا تھا اس لیے وہی مجرم ٹھہرا۔ انگریز حاکم ان معاملوں میں بڑا سخت تھا۔ امید نہیں تھی کہ اس چکر سے ریاض کی جان چھوٹ سکے گی۔

باجی جان کے لیے یہ سنہری موقع تھا۔ جو کام وہ کئی ماہ میں نہ کر سکتی تھی وہ ہفتوں میں ہوتا نظر آ رہا تھا۔ اُس نے فوراً وزیر پربودھ کمار سے رابطہ کیا اور اسے بتایا کہ یوں ٹیلر ماسٹر احمد صاحب ایک مصیبت میں گرفتار ہو گئے ہیں اور انہیں مدد کی سخت ضرورت ہے۔ ظاہر ہے پربودھ کمار تو پہلے ہی ایسے موقعے کے لیے رال ٹپکا رہا تھا۔ وہ اپنے شیطانی ارادوں کے ساتھ فوراً حرکت میں آ گیا۔ ایک وزیر کی حیثیت سے پربودھ کی پہنچ بہت اوپر تک تھی۔ اگر وہ چاہتا تو اس معاملے کو سنبھال سکتا تھا لیکن میرا خیال تھا کہ وہ اس معاملے کو سنبھالتے سنبھالتے دو ڈھائی مہینے ضرور لگا دے گا۔ اس دوران وہ مکڑے کی طرح فرحت کے گرد اپنے تار پھیلاتا رہے گا اور آخر اسے یوں بے بس کر دے گا کہ وہ بے جان شے کی طرح اُس کی جھولی میں جا گرے گی۔ میں اس فطرت کے لوگوں کو اچھی طرح جانتا ہوں اس لیے مجھے یقین تھا کہ ایسا ہی ہو گا۔

☆======☆======☆

وہ ایک نکھری نکھری صبح تھی۔ میں لاہور ریلوے اسٹیشن پر اُترا۔ مجھے یہاں کچہری میں ایک ضروری کام تھے۔ کچہری میں ہی میری ملاقات اُس انسپکٹر سے ہو گئی جو فرحت کے بھائی ریاض کا کیس کر رہا تھا۔ اس انسپکٹر کا نام ایشور سنگھ تھا۔ کپورتھلہ کے قریبی گاؤں پکی پوری کا رہنے والا تھا۔ وہ مجھے گرم جوشی سے ملا۔ باتوں باتوں میں ریاض کا ذکر شروع ہو گیا۔ ایشور سنگھ نے انکشاف کیا کہ اصل کار چور کا پتہ چل گیا ہے اور اُس نے اپنے جرم کا اقرار بھی کر لیا ہے۔ ایشور سنگھ اس شخص کا ریمانڈ لینے کچہری آیا ہوا تھا۔ مجھے یہ جان کر تھوڑی سی خوشی ہوئی۔ ظاہر ہے اب ریاض پر کیس اتنا سخت نہیں رہا تھا۔ بغیر لائسنس گاڑی چلانے اور حادثہ کرنے کے جرم میں اسے زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ دو برس کی قید ہو جاتی...... دوسرے لفظوں میں فرحت پر سے باجی جان اور پربودھ کمار وغیرہ کی گرفت اب کمزور ہو رہی تھی...... لیکن میرا یہ خام خیال...... خام نکلا اور خوشی عارضی ثابت ہوئی۔ ایشور سنگھ نے اپنی بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

(''لیکن اوس منڈے کی قسمت چنگی نہیں ہے۔ ایک کیس سے نکلا ہے تو دوسرے میں پھس گیا ہے۔'')

''کیا مطلب؟'' میں نے پوچھا۔

وہ بولا۔ ''ادھر چندی گڑھ میں کوئی منڈا غائب ہوا تھا پچھلے دنوں۔ شاید باسط علی نام تھا اُس کا۔ وہ منڈا ریاض کی بہین سے ملتا جلتا تھا۔ منڈے کے بھائیوں نے ریاض پر کیس کرا دیا ہے کہ اسے ریاض نے غائب کرایا ہے۔ یہ نیا کیس چندی گڑھ میں درج ہوا ہے۔ شاید گرومندر کے تھانے میں۔ اب پرسوں میں اُسے چندی گڑھ بھیج رہا ہوں۔''

یہ نئی خبر سن کر میں سناٹے میں رہ گیا۔ جس کسی نے یہ شوشہ چھوڑا تھا خوب سوچ سمجھ کر چھوڑا تھا۔ بھائی کے ہاتھوں بہن سے ناجائز تعلقات رکھنے والے کا اغوا فوراً سمجھ میں آ جاتا تھا۔ میرا دھیان ایک بار پھر پربودھ کمار کی طرف جانے لگا۔ عین ممکن تھا کہ باسط کے بھائیوں کو اس الزام تراشی پر اُکسانے والا ہاتھ پربودھ کمار کا ہی ہو۔ ایسے لوگ پسِ پردہ رہ کر ہر کام کر جاتے ہیں۔ نہ جانے کیوں مجھے یقین سا ہونے لگا کہ یہ کام پربودھ کمار نے ہی کیا ہو گا۔ وہ جال میں پھڑ پھڑاتے ہوئے پنچھی پر اپنی گرفت ڈھیلی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ فرحت اور اُس کے باپ کو بے بسی کے اُس مقام تک پہنچا دینا چاہتا تھا کہ وہ آنکھیں بند کر کے اپنا سب کچھ اُس کے سامنے ڈھیر کر دیں لیکن یہ ہو نہیں سکتا تھا۔ جب تک میں چندی گڑھ میں تھا اور

میرے جسم پر انسپکٹر کی وردی تھی۔ یہ نہیں ہو سکتا تھا۔ بلال شاہ کی عزت بے عزتی والا معاملہ اب بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ اب میرے سامنے فرحت تھی۔ گمشدہ، بھٹکی ہوئی اور ہراساں۔ وہ رو رہی تھی اور کراہ رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ شام اُتر آتی اور وہ عورت ذات رات کی سیاہی کو مقدر سمجھ کر اپنے چہرے پر مَل لیتی، مجھے اُسے روشنی میں لانا تھا...... میں نے جلدی جلدی کچہری میں اپنا کام ختم کیا اور ساڑھے بارہ بجے ہی واپس چندی گڑھ روانہ ہو گیا۔

چندی گڑھ پہنچ کر میں سیدھا گرومندر کے تھانے میں آیا۔ میں تھانیدار سے اُس نئے کیس کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا جو پچھلے دنوں فرحت کے بھائی ریاض پر بنایا گیا تھا لیکن تھانے پہنچ کر معلوم ہوا کہ تھانیدار تو کہیں گیا ہوا ہے۔ سب انسپکٹر کو بلا کر پوچھا تو وہ بولا۔

''نواز صاحب! آپ بھی کمال کرتے ہیں، آپ کے تھانے میں وزیر ہرل ہرل کرتے پھرتے ہیں اور آپ سیر سپاٹے پر نکلے ہوئے ہیں۔''

میں فوراً سمجھ گیا کہ سب انسپکٹر پر بودھ کمار کی بات کر رہا ہے۔ وہ خبیث کا بچہ پھر اپنے نجی دورے پر یہاں پہنچا ہوا تھا۔ میں نے سب انسپکٹر سے تفصیل چاہی تو اُس نے بتایا کہ ڈلہوزی سے صوبائی وزیر پر بودھ کمار صاحب آئے ہوئے ہیں ایشور کالونی گرومندر چوک کی گلی نمبر 10 میں انہیں کسی سے ملنا تھا...... اب شک شبے کی گنجائش نہیں رہ گئی تھی۔ میں فوراً اُلٹے پاؤں واپس مڑا اور رکشے پر سوار ٹیلر ماسٹر احمد علی کے گھر جا پہنچا۔ توقع کے مطابق یہاں خاصی گہما گہمی تھی۔ چوک میں اور گلیوں کے موڑوں پر ٹریفک کے سپاہی نظر آ رہے تھے۔ ماسٹر علی احمد والی گلی میں دو تین لمبی گاڑیاں کھڑی تھیں اور جھنڈے والی کار دور ہی سے دکھائی دے رہی تھی۔ گرومندر تھانے کا انسپکٹر اروڑا میرا سب انسپکٹر رضوان باجوہ اور کچھ دیگر اہلکار بھی موقعے پر موجود تھے۔ میں بھی جا کر کھڑا ہو گیا۔ انسپکٹر اروڑا نے بتایا کہ ماسٹر علی احمد صاحب خاصے بیمار ہیں۔ وزیر صاحب اُن کی عیادت کے لیے آئے ہوئے ہیں۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کون بیمار ہے اور کس کی خاطر یہاں آیا ہوا ہے۔ یہ ساری وضع داری، رکھ رکھاؤ اور حسنِ اخلاق اپنے شکار کو پھانسنے کے لیے تھا۔ اتنے میں وزیر صاحب کا پارسی سیکرٹری تیز قدموں سے باہر آیا۔

''انسپکٹر اروڑا کون ہے؟'' اس نے ہمارے پاس آ کر پوچھا۔

''میں ہوں جی۔'' انسپکٹر اروڑا نے کہا۔

''تم گرومندر تھانے میں ہو۔''

''جی ہاں۔'' اروڑا نے جواب دیا۔

''تمہیں پر بودھ صاحب اندر بلا رہے ہیں۔''

اروڑا فوراً روانہ ہو گیا۔ میں بھی اس کے ساتھ ہولیا۔ اندر ماسٹر احمد علی کی بیٹھک میں وزیر صاحب ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے صوفے پر بیٹھے تھے۔ بیٹھک کے عین درمیان ایک چارپائی پر ماسٹر علی احمد نیم دراز تھے۔ اُن کی پائنتی میں فرحت سکڑی سمٹی بیٹھی تھی۔ علی احمد کی کوئی رشتے دار خاتون بھی پاس ہی موجود تھی۔ مجھے دیکھ کر فرحت کی سوگوار آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے شناسائی کے آثار ابھرے لیکن پھر فوراً ہی اس نے نظر کا رخ بدل لیا۔ وہ ہلکے آسمانی رنگ کے سوٹ میں تھی۔ پھولدار دوپٹے میں اُس کے ٹوکرا بھر ریشمی بال مشکل سے سما رہے تھے۔ کمرے کا ماحول دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ پر بودھ کمار اس فیملی سے گھریلو قسم کے تعلقات قائم کرنے میں کامیاب ہو چکا ہے۔ وہ ماسٹر علی احمد کو بار بار بے تکلفی سے ''چاچا'' کہہ رہا تھا۔ اس نے انسپکٹر اروڑا کو اور مجھے بیٹھنے کا حکم دیا۔ پھر اروڑا سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

''اروڑا صاحب! چاچا جی کو میں اپنے بزرگوں کی طرح سمجھتا ہوں انہیں کوئی تکلیف ہو تو میں ڈلہوزی میں بیٹھا بے چین ہو جاتا ہوں...... مجھے پتہ چلا ہے کہ ان کے بیٹے ریاض پر اب اغوا کا کیس بنایا جا رہا ہے۔ یہ پرچہ تمہارے ہی تھانے میں کٹا ہے ناں؟''

انسپکٹر اروڑا نے فوراً ''ہاں'' میں جواب دیا۔

پر بودھ کمار بولا ''میں نے کبھی کسی کی جھوٹی سفارش کی ہے اور نہ انصاف کے راستے میں روڑے اٹکائے ہیں لیکن بے انصافی مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔ میرا من گواہی دیتا ہے کہ ملزم بے گناہ ہے۔ تم قانون کے دائرے میں رہ کر ضرور تفتیش کرو اور جو حقیقت ہے وہ سامنے لاؤ لیکن چاچا جی کے بیٹے سے تمہارے تھانے میں کوئی زیادتی ہوئی تو میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گا۔''

میں صاف دیکھ رہا تھا ہٹا کٹا انسپکٹر اروڑا دھیرے دھیرے کانپ رہا ہے۔ کہنے لگا۔

''جناب! آپ کیوں شرمندہ کر رہے ہیں۔ ہم تو خادم ہیں آپ کے۔ آپ ہمیں حکم دے سکتے ہیں۔''

پر بودھ کمار نے ایک معنی خیز نظر فرحت پر ڈالی اور اروڑا سے بولا۔ ''میں اس بارے میں تم سے بعد میں بات کروں گا۔ فی الحال یہ دماغ میں رکھو کہ پرسوں ریاض تمہارے تھانے میں آرہا ہے اُسے ایک کانٹے کی تکلیف بھی نہیں ہونی چاہیے۔''

انسپکٹر اروڑا خوشامدی انداز میں سر ہلانے لگا۔ وہ پر بودھ کمار سے کچھ زیادہ ہی مرعوب

نظر آرہا تھا۔ اتنے میں تھل تھل کرتی ہتھنی جیسی ''باجی جان'' کمرے میں آدھمکی۔ اُس کے ہاتھ میں دو شیروانیاں اور ایک چھوٹی لمبائی کی اچکن تھی۔ یہ کپڑے اس نے پربودھ کمار کے سامنے میز پر سجا دیئے اور بولی۔

''دیکھ لو وزیر صاحب، بھائی صاحب نے کپڑوں میں کیسے جان ڈالی ہے۔'' بھائی صاحب سے اس کی مراد ماسٹر علی احمد تھے۔

پربودھ کمار نے تعریفی نظروں سے کپڑے دیکھے۔ بڑی ملائمت سے ریشمی اچکن پر ہاتھ پھیرا۔ ''واہ...... کیا بات ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ چاچا جی کو قدر دان نہیں ملے۔ اگر یہ باہر کے ملک میں ہوتے یا ہندوستان کے ہی کسی بڑے شہر میں کام کرتے تو آج لاکھوں میں کھیلتے۔''

وزیر کے خوشامدی سیکرٹری نے ہاں میں ہاں ملائی۔ ''لاجواب کاریگری ہے۔''

وزیر نے بُرا سامنہ بنایا۔ ''کاریگری نہیں مہتا صاحب...... فن کاری ہے۔ کاریگر تو بہت مل جاتے ہیں لیکن فن کار کوئی کوئی ہوتا ہے۔ چاچا جی شیروانی سیتے نہیں اُسے تخلیق کرتے ہیں۔ تخلیق کا مطلب سمجھتے ہو تم؟'' پربودھ کمار کا یہ سوال اپنے سیکرٹری مہتا سے تھا۔ مہتا گڑبڑا کر رہ گیا۔ پربودھ کمار نے فرحت کی طرف دیکھ کر ایک فرمائشی قہقہہ لگایا۔ ''دیکھ رہی ہیں فرحت صاحبہ، ہماری گورنمنٹ کتنی جاہل ہے۔ وزیر صنعت کے سیکرٹری کو 'تخلیق' کا مطلب بھی معلوم نہیں، اس لیے تو میں کہہ رہا ہوں ہمارے ملک میں قدم قدم پر پرائمری سکولوں کی ضرورت ہے۔ ان پرائمری سکولوں کو چلانے کے لیے آپ جیسی ذہین اور باہمت لڑکیوں کو خوش دلی سے درس و تدریس کا پیشہ اختیار کرنا چاہیئے۔''

پربودھ کمار کی باتوں سے یہ انکشاف ہوا کہ وہ فرحت کے سامنے ایک اور دانہ پھینک چکا ہے۔ چندی گڑھ کے ایک فیشن ایبل علاقے میں پربودھ کمار کا پلاٹ تھا۔ وہ اس پلاٹ پر ایک پرائمری سکول بنانے کا ارادہ کر چکا تھا اور یہ عندیہ بھی ظاہر کر چکا تھا کہ اس سکول کو فرحت چلائے گی۔ یعنی وہ اُس سکول کی ہیڈ میسٹریس ہوگی۔ گوشت خور پودا چھوٹے سے کیڑے کو ہڑپ کرنے کے لیے لیس دار لعاب اُگلتا جا رہا تھا۔ اب کیڑا اُس لعاب میں پھنس رہا تھا، جکڑا جا رہا تھا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ فرحت کے چہرے پر پربودھ کمار کے لیے اب وہ پہلے جیسی بے رخی نہیں ہے۔ وہ اس کی باتوں کا جواب دے رہی تھی اور کبھی کبھی کسی بات پر مسکرا بھی دیتی تھی۔ تھوڑی دیر بعد پربودھ کمار رخصت ہونے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے رسماً فرحت سے کہا۔ ''آیئے آپ بھی ساتھ چلیں آپ کو سکول کا موقعہ دکھا دوں۔''

فرحت کی آنکھوں میں انکار نظر آیا لیکن انکار کرنے سے پہلے اُس نے اپنے والد کی طرف دیکھنا ضروری سمجھا۔ اتنے میں ''باجی جان'' تیزی سے بولی۔ ''ہاں ہاں چلی جاؤ کیا حرج ہے۔ تمہارے بہانے میں بھی ہو آؤں گی۔ واپسی پر تم رنگریز کی طرف سے ہو آنا......''

چالباز عورت نے پلک جھپکتے میں فرحت کو پربودھ کمار کے ساتھ جانے پر آمادہ کر لیا۔ وہ برقع لینے کے لیے اندر چلی گئی تو ''باجی جان'' خباثت سے مسکرائی۔ ''شرماتی ہے۔ بھلا اپنوں سے بھی کوئی شرماتا ہے۔ بیس سال کی ہو چکی ہے لیکن ابھی بچپنا نہیں گیا۔''

پربودھ کمار کھوئی کھوئی نظروں سے اُس دروازے کی جانب دیکھ رہا تھا جہاں سے فرحت باہر نکل گئی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں کسی بھوکے بھیڑیے کی آنکھوں کا عکس تھا۔ میں نے کن انکھیوں سے دیکھا ماسٹر احمد علی کے چہرے پر عجیب بے بسی نظر آ رہی تھی۔ ذرا دیر بعد فرحت واپس آ گئی اور پربودھ کمار، ماسٹر سے رخصت ہو کر باہر نکل آیا۔ باوردی عملے نے اٹین شین ہو کر سلیوٹ مارا۔ پربودھ کمار نے بے مثال انکساری کا مظاہرہ کرتے ہوئے خود فرحت اور باجی جان کے لیے گاڑی کا دروازہ کھولا۔ جب فرحت گاڑی میں داخل ہو رہی تھی پربودھ کی گرسنہ نگاہیں دیوانہ وار اُس کے جسمانی خدوخال کا مشاہدہ کر رہی تھیں۔ جیسے کوئی بھیڑ بکریوں کا بیوپاری جانور کو ہاتھ لگائے بغیر آنکھوں آنکھوں میں اُسے تول لیتا ہے۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ ہولسٹر سے ریوالور نکال کر چھ کی چھ گولیاں اس مجسم شیطان کے سر میں اتار دوں۔ کل کے اخبار میں سُرخی لگ جائے کہ ایک مسلمان لڑکی کے چکر میں ڈلہوزی سے چندی گڑھ کے پھیرے لگانے والے صوبائی وزیر کو بھرے بازار میں گولیوں سے چھلنی کر دیا گیا لیکن یہ تو ایک خواہش تھی۔ اسی بارے میں غالب نے کہا ہے ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے۔

جب پربودھ کمار کا قافلہ روانہ ہونے والا تھا، باجی جان نے جیپ کی کھڑکی میں سے سر نکالا اور آواز دے کر مجھے پاس بلایا۔ میں قریب گیا تو کہنے لگی۔ ''نواز، تجھ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔ اگر کل کسی وقت چار بجے کے بعد آسکو تو بہتر ہے، ورنہ میں تھانے آجاؤں گی...... بلکہ بہتر ہے میں ہی تھانے آجاؤں...... ٹھیک ہے...... کل چار بجے کے بعد میں آؤں گی۔ تم کہیں اِدھر اُدھر نہ جانا۔''

میں اندر سے کھول کر رہ گیا۔ حرام زادی کیسے حکم چلا رہی تھی لیکن اپنی یہ برہمی میں نے چہرے سے ظاہر نہیں ہونے دی۔ سعادت مندی سے اقرار میں سر ہلایا اور کھڑکی سے پیچھے ہٹ گیا۔

شاندار جیپ فراٹے بھرتی ہوئی گرومندر چوک کی طرف چلی گئی۔

☆======☆======☆

بہت سے سوال میرے ذہن میں کلبلا رہے تھے۔ باسط علی کہاں ہے؟ ریاض پر اُس کے اغوا کا الزام کس نے لگوایا ہے۔ باجی جان دراصل کون ہے اور وہ کل مجھ سے کیا خاص بات کرنے کے لیے آرہی ہے؟ اگلے روز چار بجتے ہی میں شدت سے اس کا انتظار کرنے لگا۔ وہ قریباً پانچ بجے آئی۔ حسبِ معمول تیز تیز چلتی اور اپنی گردن سے پسینہ پونچھتی ہوئی میرے سامنے کرسی پر آڈھیر ہوئی۔

"وہ تمہارا مچھندر کہاں ہے؟" اُس نے آتے ساتھ ہی بلال شاہ کے بارے میں پوچھا۔ بلال شاہ کوئی دو گھنٹے پہلے ہی دُم دبا کر وہاں سے نکل چکا تھا۔ میں نے کہا وہ یہاں نہیں ہے، اگر ضروری ہے تو میں بلوالیتا ہوں۔

وہ بولی۔ "دفع کریں، وہ بھی کوئی بندہ ہے جسے بلایا جائے......کوئی کام کی بات کرتے ہیں......چلو یہ دروازہ ذرا بند کر دو۔" میں نے فرمانبرداری سے اُٹھ کر دروازہ بند کر دیا۔ وہ کرسی پر کچھ اور پھیل کر بیٹھ گئی۔ کہنے لگی۔ "نواز، تجھ سے ایک کام پڑ گیا ہے۔ تجھے دس پندرہ روز کے لیے ڈلہوزی جانا پڑے گا۔"

"وہ کس لیے؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولی۔ "پربودھ کو تو تم جانتے ہی ہوناں۔ یہی اپنا وزیر ڈلہوزی والا......اُس کی ایک بیوی ہے۔ کوئی پہاڑن ہے شملے کی۔ پچھلے ڈھائی تین برس سے بیمار ہے۔ بس جنونی سی ہو گئی ہے۔ پربودھ نے بہت علاج معالجہ کرایا ہے لیکن اچھی نہیں ہوئی۔ اب وہ اُسے گھر میں بند رکھتا ہے۔ کبھی کبھی بہت چیخ و پکار کرتی ہے، گالیاں بکتی ہے اور توڑ پھوڑ پر اُتر آتی ہے۔ ایسے میں اُس کے دو ہی علاج ہوتے ہیں اسے بے ہوش کر دیا جائے یا کوئی پولیس والا اُس کے پاس ہو۔ عجیب بات یہ ہے کہ پولیس والے سے وہ بہت ڈرتی ہے۔ اُس کے ہوتے ہوئے کوئی ایسی ویسی حرکت نہیں کرتی، بھلی مانس بنی بیٹھی رہتی ہے۔ پربودھ کمار نے اُس کے لیے ایک پولیس والے کی پکی ڈیوٹی لگوا رکھی ہے۔ چمبا کا ایک سب انسپکٹر راجندر ہے وہ چوبیس گھنٹے اُس کے قریب رہتا ہے......اب راجندر کی شادی ہے، وہ دو تین ہفتوں کی چھٹی پر ہے۔ اُس عورت نے پربودھ کا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ کل مجھ سے کہنے لگا، باجی جان تم ہی کچھ کرو۔ میرا دھیان تمہاری طرف چلا گیا۔ میں نے سوچا تم سے پوچھ کر دیکھوں گی اگر تم مان جاؤ تو...... ویسے پربودھ کمار جیسے بندے کے کام آ کر تم اپنا ہی بھلا کرو گے۔ بڑا نرآدمی

ہے۔"

میں دل ہی دل میں اس ففے کٹنی کو صلواتیں سنا رہا تھا۔ پتہ نہیں کیا سمجھ رہی تھی اپنے آپ کو۔ جو کام وہ مجھے کرنے کے لیے کہہ رہی تھی وہ ایک معمولی چوکیدار کا تھا۔ کسی نے سچ کہا ہے حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی بھی انسان کو کبھی کبھی کنویں میں گرا دیتی ہے۔ باجی جان خود کو بہت بڑی شے سمجھ رہی تھی میں اور بلال شاہ جیسے اُس کی نظر میں کیڑے مکوڑوں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے تھے......بہرحال جو ہو رہا تھا اچھا ہی ہو رہا تھا۔ بے خبری میں باجی جان دھیرے دھیرے میری گرفت میں آتی جا رہی تھی۔ وہ اوپر والا مسبب الاسباب ہے۔ کبھی کبھی انسان کی مدد ایسے ذریعے سے کرتا ہے کہ اس کے گمان میں بھی نہیں ہوتا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے تک میں اس چکر کی وجہ سے سخت پریشان تھا۔ آگے بڑھنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا اور اب باجی جان مجھے خود دعوت دے رہی تھی کہ میں آگے بڑھوں اور وزیر صنعت کے گھر کا بھیدی بن جاؤں۔ میں نے اپنے دلی جذبات چھپاتے ہوئے عام سے لہجے میں کہا۔

"باجی جان! تم چاہتی ہو کہ میں تھانہ چھوڑ کر پربودھ کمار کے گھر میں جا بیٹھوں۔ یہ......یہ کام تو ایک کانسٹیبل بھی کر سکتا ہے۔"

وہ تڑاخ سے بولی۔ "اور تم کون سے ڈی آئی جی لگے ہوئے ہو۔ انسپکٹر ہی ہوناں یہ اور بات ہے کہ شکل صورت سے ذرا رعب دار لگتے ہو۔" وہ طنز کرنے کے ساتھ ساتھ مسکرا بھی رہی تھی۔ میرے ماتھے پر بل دیکھے تو سنجیدہ ہو کر بولی۔ "بات یہ ہے نواز......کہ اُس عورت کے پاس کوئی سمجھ دار بندہ ہونا چاہیے۔ بڑی ہی چالاک عورت ہے۔ پربودھ کمار کو ہر وقت اس کی طرف سے دھڑکا لگا رہتا ہے۔"

تھوڑی سی پس و پیش کے بعد میں نے "باجی جان" کی بات مان لی۔ "پس و پیش" کے ڈرامے میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے میں نے باجی جان سے تقاضا کیا کہ وہ پربودھ صاحب سے کہہ سن کر مجھے کسی "اچھے سے" تھانے کا چارج لے کر دے۔ باجی جان نے درویشانہ بے نیازی سے آنکھیں اوپر کو اٹھائیں اور بولی۔ "سب کچھ ہوگا......سب کچھ ہوگا۔ مجھ جیسی فقیرنی کا دل رکھو گے تو اوپر والا تمہارا دل رکھے گا۔"

کچھ دیر بیٹھ کر ایک پوری چائے دانی پی کر یہ فقیرنی جیسے آئی تھی، ویسے ہی تھل تھل کرتی واپس چلی گئی۔ اُس کے جاتے ہی بلال شاہ آدھمکا۔ وہ غصے میں لال پیلا ہو رہا تھا۔ مجھے بعد میں پتہ چلا کہ وہ تھوڑی دیر پہلے واپس آ گیا تھا اور ساتھ والے کمرے سے ہماری گفتگو پر کان لگائے ہوئے تھا......آتے ساتھ ہی بھڑک کر بولا۔ "بہت اچھا کر رہے ہیں آپ۔ کل وہ

آپ سے سودا سلف منگوائے گی اور مجھ سے ٹانگیں دبوائے گی...... غضب خدا کا...... وہ ایسے حکم چلا رہی ہے جیسے گورنر لگی ہوئی ہے تم پر...... بس خان صاحب...... بس...... بہت ہو چکی۔ اب مجھ سے اور برداشت نہیں ہوتی یہ بے عزتی۔"

میں نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔ "تو کیوں ہاتھ ڈالا تھا اس بھڑوں کے چھتے میں۔ میں نے بار بار منع کیا لیکن تم نے ایک نہ سنی۔ اُس وقت صلح کر لیتے تو آج یہ نوبت نہ آتی۔"

بلال شاہ غصے میں کانپنے لگا۔ "خاں صاحب! یہ بات ہے تو پھر آپ ابھی تماشہ دیکھ لیں۔ میں آج آپ کو کچھ کر کے دکھا دوں گا۔" وہ تیزی سے اٹھا اور لپکتا ہوا باہر نکل گیا۔ میں اطمینان سے اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا وہ ابھی واپس آ جائے گا۔ میں نے اس کی سائیکل سنتری کو دے کر ڈاک خانے بھیجا ہوا تھا اور بلال شاہ اپنی سائیکل کے بغیر دو قدم بھی نہیں جاتا تھا...... اگر سائیکل موجود ہوتی تب بھی زیادہ پریشانی کی بات نہیں تھی۔ باجی جان کو مقتول کر کے پھانسی چڑھنا اور درجن بھر بچوں کو یتیم کرنا بلال شاہ کے لیے کوئی آسان کام نہیں تھا۔ کچھ دن پہلے بھی وہ اس طرح آگ بگولا ہو کر میرے پاس سے گیا تھا۔ ارادہ باجی جان کو "لیرو لیر" یعنی ٹکڑے ٹکڑے کرنے کا تھا مگر گرو مندر چوک تک پہنچتے پہنچتے بلال شاہ کے "ادھ رڑکے" کا ٹائم ہو گیا تھا۔ اس نے سوچا ہوگا۔ "قاتل" تو بننا ہی ہے آخری بار کھل کھلا کر ادھ رڑکا ہی پی لیا جائے۔ جب اخبار ختم ہوا تو دوپہر ہو چکی تھی۔ یعنی دوپہر کے کھانے کا وقت تھا اور ایسے "مبارک وقت" میں بلال شاہ کوئی دوسرا کام کیسے کر سکتا تھا، وہ خراماں خراماں گھر واپس آ گیا تھا۔

"میری سائیکل کہاں ہے؟" بلال شاہ کی دہاڑتی آواز نے مجھے خیالوں سے چونکا دیا۔ وہ تن کر دروازے سے کھڑا تھا۔ جی میں آئی کہہ دوں۔ "قتل ہی کرنا ہے، ایک گھنٹے کے لیے کرائے پر لے جاؤ۔" مگر پھر میں نے یہ فقرہ ہونٹوں میں ہی دبا لیا۔ بلال شاہ کے شعلوں کو اس وقت تیل کے نہیں پانی کے چھینٹوں کی ضرورت تھی۔

بلال شاہ نے دھیمی آواز لیکن غصیلے لہجے میں کہا۔ "میں دیکھ رہا ہوں جب سے آپ چندی گڑھ میں آئے ہیں بھیگی بلی بنے ہوئے ہیں۔ لگتا نہیں کہ یہ امرتسر اور لاہور والا انسپکٹر نواز نہیں ہے...... آخر کیا ڈر ہے آپ کو؟"

میں نے کہا۔ "بلال پیارے، میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ مجھے کچھ دن اسی طرح بھیگی بلی بنا رہنے دو۔ یوں سمجھو کہ ہم نے ایک خطرناک مجرم کو پکڑنے کے لیے بہروپ بھر رکھا ہے۔"
وہ جل کر بولا۔ "مجھے تو لگتا ہے یہ بہروپ ہی آپ کا اصل روپ بن جائے گا۔"

"نہیں بنے گا...... نہیں بنے گا۔" میں نے بلال کو تسلی دی۔ اتنے میں ایک کانسٹیبل نے دروازے پر دستک دی اور ہمیں خاموش ہونا پڑا۔

☆======☆======☆

ڈلہوزی کا موسم ان دنوں خنک تھا۔ شدید بارشیں ہو رہی تھیں۔ خاص طور پر جس جگہ پر بودھ کمار کی کوٹھی تھی وہ تو بارش کا گڑھ تھا۔ محسوس ہوتا تھا یہاں بارش کے سوا اور کچھ ہوتا ہی نہیں۔ چاروں طرف خطرناک ڈھلوانیں، دیودار، چیڑ اور اخروٹ کے بلند و بالا درخت۔ ان درختوں سے کہیں کہیں جھلکتی ہوئی سرخ مخروطی چھتیں۔ جب بارش ان مکانوں کی چھتوں اور درختوں پر گرتی تھی تو عجب گونج دار آواز پیدا ہوتی تھی۔ پر بودھ کمار کی کوٹھی میں اُس کے بوڑھے والد سمیت کل چار افراد رہتے تھے۔ اس کے علاوہ دو گن مین تھے۔ تین گھریلو خدمت گار تھے اور ایک بڑی ہی خوفناک نسل کا رُوسی کتا تھا۔ اس کتے پر پہلی نگاہ ڈالتے ہوئے یوں لگتا تھا جیسے کسی جنگلی درندے کو دیکھ لیا ہے۔ میں کوٹھی میں پہنچا تو پر بودھ کمار کہیں گیا ہوا تھا۔ اس کے ایک سیکرٹری مہتا نے میرا نام پتہ پوچھا پھر مجھے کوٹھی کے اندر لے گیا۔ ان لوگوں کو میرے بارے میں پہلے ہی اطلاع مل چکی تھی۔

مجھے میرا کمرہ دکھا دیا گیا۔ یہ کمرہ ایک ہال نما کمرے کے عین سامنے تھا۔ اس ہال کمرے میں ایک دیوار گیر شیشہ لگا ہوا تھا۔ شیشے کی دوسری طرف لوہے کی گرل سی تھی۔ اس گرل میں سے کمرے کا سارا منظر نظر آ رہا تھا۔ ایک کوہستانی عورت جسے لڑکی کہنا زیادہ مناسب تھا اپنے لمبے بال کھولے گدے دار بستر پر اوندھی سوئی پڑی تھی۔ ایک تپائی پر کھانے کے برتن پڑے تھے۔ دوسری طرف صوفے پر ایک ادھ بُنا سویٹر اور سلائیاں وغیرہ رکھی تھیں۔ پورے کمرے میں بے ترتیبی تھی۔ چیزیں اِدھر اُدھر بکھری ہوئی تھیں۔ سیکرٹری مجھے کمرہ بتا کر چلا گیا۔ سفر کی تھکان کے سبب میرا دل لباس بدلنے کو چاہ رہا تھا لیکن "باجی جان" کی ہدایت کے مطابق مجھے جتنے روز یہاں رہنا تھا اسی وردی میں رہنا تھا۔

ملازم چائے اور بسکٹ وغیرہ لے آیا۔ چائے پی کر میں جوتوں سمیت صوفے پر دراز ہو گیا۔ یہاں سے شیشے والا وہ ہال نما کمرہ صاف نظر آ رہا تھا۔ لڑکی اُسی طرح بے سُدھ پڑی تھی۔ اس کے انداز سے مجھے شبہ ہو رہا تھا کہ وہ نیم بے ہوش ہے۔ غالباً اُسے دوا وغیرہ کھلائی گئی تھی۔

صوفے پر لیٹے لیٹے میں اُس ہال کمرے کی طرف دیکھتا رہا۔ نہ جانے کس وقت میری آنکھ لگ گئی...... دوبارہ جاگا تو سب سے پہلے نگاہ دیوار گیر کلاک پر پڑی۔ شام کے پانچ بجے

تھے میں قریباً دو گھنٹے سویا رہا تھا۔ دفعتاً چیخ و پکار کی مدھم آواز آئی۔ مجھے فوراً یاد آیا کہ میری بیداری کی وجہ یہ آواز تھی۔ جلدی سے اُٹھ کر میں نے ہال کمرے کی طرف دیکھا۔ پہاڑن لڑکی چیخ و پکار کر رہی تھی۔ کبھی اپنے کپڑے پھاڑنے کی کوشش کرتی تھی اور کبھی برتن اٹھا اٹھا کر دیواروں سے مارنے لگتی تھی لیکن یہ سب اشیاء پلاسٹک کی تھیں لباس بھی موٹے کھدر کا تھا اور ایسے انداز کا تھا کہ وہ کوشش کے باوجود پھاڑ یا اتار نہیں سکتی تھی۔ وہ کسی وقت ایک بہت خوبصورت لڑکی رہی ہو گی لیکن اب چہرے پر ویرانی اور وحشت کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ دفعتاً لڑکی کی نگاہ مجھ پر پڑی۔

جیسے اُسے بجلی کا جھٹکا لگا۔ وہ ٹھٹک کر پیچھے ہٹ گئی۔ اس کا کھلا ہوا منہ بند ہو گیا اور ہاتھ دو مُردہ شاخوں کی طرح لٹک کر پہلوؤں پر جا لگے...... بالکل گم صم، سہمی ہوئی وہ واپس بستر پر جا بیٹھی اور صوفے پر سے سویٹر اٹھا کر دھیرے دھیرے بُننے لگی۔

میں حیران نظروں سے اس عجیب و غریب کردار کو دیکھ رہا تھا کہ ایک ادھیڑ عمر ملازم میرے قریب آ بیٹھا۔ اس نے اپنا نام آنندی بتایا۔ کہنے لگا۔ ''صاحب جی! تم بی بی کو دیکھ کر حیران ہو رہے ہو لیکن ہمیں یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے اتنا عرصہ ہو گیا ہے کہ اب کوئی انوکھی بات نہیں لگتی۔ بڑی جلدی بندہ عادی ہو جاتا ہے ہر بات کا۔''

میں نے کہا۔ ''ہاں چاچا! یہ بات تو ہے۔ بندے کی آنکھ بڑی بھلکڑ ہوتی ہے۔''

آنندی کے ساتھ گفتگو کا سلسلہ چل نکلا۔ وہ اس گھر کا سب سے پرانا خادم تھا۔ پربودھ کُمار کی پہلی بیوی اُس کی آنکھوں کے سامنے مری تھی اور دوسری بیوی نے بھی سہاگن سے پاگل پن تک کا سفر آنندی کے سامنے ہی کیا تھا۔

آنندی نے بتایا کہ اس کا نام شوبھا ہے۔ تین برس پہلے پربودھ صاحب اسے شملے کے ایک گاؤں سے بیاہ کر لائے تھے۔ بڑی خوبصورت اور سمجھدار لڑکی تھی۔ صرف اتنی کمی تھی کہ پہاڑی بولی بولتی تھی۔ پربودھ صاحب نے اپنی زبان سکھانے کی لیے اس کے لیے ایک استانی رکھی ہوئی تھی۔ وہ ایک بیوہ گجراتن تھی۔ ہمیں معلوم نہیں تھا کہ اُسے نشے کی لت ہے۔ وہ نشے کی گولیاں کھاتی تھی۔ اُسی سے یہ نشہ بی بی کو بھی لگ گیا۔ بی بی اُسے پیسے دے دے کر نشہ خریدنے اور کھانے لگی۔ ہم سمجھتے رہے کہ وہ بیمار ہے پتہ اس وقت چلا جب پانی سر سے گزر چکا تھا۔ بی بی کے پیٹ میں بچہ تھا وہ بھی ضائع ہو گیا۔ پھر جب اس کا نشہ چھڑانے کی کوشش کی تو وہ ذہن ہی خراب کر بیٹھی...... اب بی بی ہر وقت اُس بچے کا سویٹر بُنتی رہتی ہے جو اس دنیا میں آیا ہی نہیں تھا اور صاحب جی کو گالیاں دیتی رہتی ہے کہ انہوں نے اس کا بچہ چھین کر مار

ڈالا ہے۔

میں نے آنندی سے پوچھا۔ ''صاحب کی کوئی اولاد نہیں؟''

بولا۔ ''یہی تو مصیبت ہے انسپکٹر صاحب! لاکھوں کی جائیداد اور وارث کوئی نہیں۔ سب مالک پر زور دے رہے ہیں کہ وہ شادی کر لیں۔ پہلے تو وہ مانتے ہی نہیں تھے مگر اب سنا ہے کہ چندی گڑھ میں کوئی لڑکی دیکھی ہے انہوں نے۔''

میرے کان کھڑے ہوئے۔ ''کون ہے وہ......؟ کوئی ہندو لڑکی ہے؟''

''پتہ نہیں جی۔'' آنندی نے سادگی سے جواب دیا۔ ''ویسے اچھے گھرانے کی ہے۔ مالک اسے چندی گڑھ میں کوئی سکول بھی کھول کر دے رہے ہیں۔''

میں سمجھ گیا کہ پربودھ کا نمک حلال نوکر کس کی بات کر رہا ہے۔ وہ اس بدنصیب فرحت کی بات کر رہا تھا۔ وہ اس عیاش وزیر کے بیڈروم میں آنے والی آخری لڑکی نہیں تھی اور نہ ہی تیسری تھی۔ اس سے پہلے نہ جانے کتنی آ چکی تھیں اور اس کے بعد نہ معلوم کتنی اور کو آنا تھا۔ نو شگفتہ پھولوں کو نوچ کر اپنی دسترس میں لانا اور پھر انہیں مسل کر خاک میں ملا دینا پربودھ جیسے بڑے آدمیوں کا مشغلہ ہوتا ہے۔ کیا معلوم پہلی دو بیویوں کے بطن سے بھی اس لیے اولاد پیدا نہ ہو سکی ہو کہ تیسری کے لیے گنجائش موجود رہے۔ فرحت کا حسین معصوم چہرہ میری نگاہ میں گھومنے لگا اور میں اس کے انجام کا سوچ کر کانپ گیا۔ آنندی کی باتوں سے پتہ چل رہا تھا کہ پربودھ فرحت کے سلسلے میں کافی پیش قدمی کر چکا ہے۔

اگلے روز شام کو پربودھ کوٹھی میں آ گیا لیکن میرے ساتھ اُس کی ملاقات نہیں ہوئی۔ اس کے ساتھ چند آدمی آئے تھے اور وہ ان کے ساتھ مصروف تھا۔ میں رات قریباً دس بجے تک اُس کا انتظار کرتا رہا۔ آخر شیشے کی دیوار کے اس پار مخبوط الحواس شوبھا گہری نیند سو گئی تو میں نے بھی ٹوپی اور جوتے اتارے اور صوفے پر نیم دراز ہو گیا۔ شوبھا کے پہریدار کی حیثیت سے مجھ پر یہ شرط عائد ہوتی تھی کہ میں صرف صوفے پر آرام کروں اور اپنے کمرے کی لائٹ ہر وقت آن رکھوں تاکہ کھلے دروازے میں سے ہر وقت شوبھا کو نظر آتا رہوں اور وہ کسی وقت بھی مجھے غیر حاضر نہ سمجھے۔ اُس لڑکی کی ذہنی حالت عجیب سی تھی۔ میری موجودگی میں وہ سہمی ہوئی بے حس و حرکت بیٹھی رہتی تھی لیکن جونہی میں اِدھر اُدھر ہوتا تھا۔ وہ مچلنے لگتی تھی اور اس کے چہرے پر بغاوت کے آثار نمودار ہو جاتے تھے۔ واقعی اسے قابو میں رکھنے کے لیے ایک پولیس والے کا سامنے رہنا ضروری تھا......

معلوم نہیں میں کتنی دیر سویا رہا۔ ہارن کی مسلسل آواز پر آنکھ کھلی۔ بارش مسلسل ہو رہی

تھی۔ مخروطی چھت پر جیسے کوئی آبشار گر رہا تھا۔ اس آبشار کے شور میں ہارن کی کرخت آواز ڈوب ڈوب کر ابھر رہی تھی۔ شاید گیٹ پر موجود چوکیدار بھی سو گیا تھا۔ میں اُٹھ کر کھڑکی میں سے جھانکنے لگا۔ بیرونی گیٹ کے نیچے سے کار کی روشنیاں پورچ میں آ رہی تھیں۔ ان روشنیوں میں موسلا دھار بارش کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ چوکیدار کی آنکھ بھی اب کھل گئی تھی۔ وہ بھاگ کر گیٹ پر پہنچا۔ پہلے کھڑکی میں سے جھانکا پھر جلدی سے گیٹ کھول دیا۔ ایک کار اندر آ گئی اور پورچ میں آ رکی۔ کار کے پچھلے دروازے میں سے اُترنے والے کو دیکھ کر میری رہی سہی نیند بھی بھاگ گئی اور میں پوری طرح چوکس ہو کے بیٹھ گیا...... وہ باجی جان تھی۔

باجی جان اتنی رات گئے اس افراتفری کے عالم میں ڈلہوزی کیا کرنے پہنچی تھی یہ ایک ایسا سوال تھا جس کا جواب حاصل کیے بغیر اب میرے لیے سونا مشکل تھا۔ باجی جان تیز قدموں سے رہائشی حصے کی طرف چلی گئی تو ڈرائیور گاڑی موڑ کر گیراج کی طرف چلا گیا...... میں صوفے پر چت لیٹ کر کوٹھی کے مختلف کمروں سے ابھرنے والی آوازوں پر غور کرنے لگا۔ آوازوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ پربودھ کمار بھی جاگ اٹھا ہے اور وہ ''باجی جان'' کے ساتھ اپنے ڈرائینگ روم میں موجود ہے۔

میں نے ایک نگاہ شوبھا پر ڈالی۔ وہ لحاف میں دبکی گہری نیند سو رہی تھی۔ میں چپل پہن کر بہ آہستگی کمرے سے نکلا اور اس راہداری میں آ گیا جو مکان کے پہلو سے گزرتی تھی۔ یہاں ایک قطار میں گملے رکھے ہوئے تھے اور چھاجوں بارش برس رہی تھی۔ میں چھجوں کے نیچے چلتا ایک کھڑکی کے سامنے پہنچا تو اندر سے باتوں کی آواز آ رہی تھی۔ آواز گو مدھم تھی لیکن میں نے کان دیوار کے ساتھ لگایا تو الفاظ سمجھ میں آنے لگے۔ باجی جان بڑے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

''وہ تو شکر ہے بھگوان کا اُس کے پاس رقم تھی۔ پورے پانچ ہزار روپے دے کر اس نے جان چھڑائی حرامی تھانیدار سے۔''

پربودھ بولا۔ ''میں تمہارے بھائی کو جانتا ہوں۔ اچھا بھلا سیانا بندہ ہے اگر ٹیلی فون نہیں کر سکتا تھا تو کسی کے ہاتھ پیغام بھیج دیتا مجھے......''

''بھیجا تھا پیغام اُس نے۔'' باجی جان بولی۔ ''یہاں آپ کے اُس سیکرٹری مہتا نے ٹال دیا۔ کہنے لگا کہ صاحب کہیں گئے ہوئے ہیں حالانکہ آپ کی کار بھی اندر کھڑی تھی۔ پھر اس نے ایک بندہ آپ کے فارم کی طرف دوڑایا وہاں بھی آپ کا کچھ پتہ نہیں چلا۔''

چند لمحے کمرے میں گہری خاموشی رہی۔ پھر پربودھ کی سوچ میں ڈوبی ہوئی آواز آئی۔

''یہ کس کی شرارت ہو سکتی ہے......؟''

باجی جان بولی۔ ''کسی کی بھی ہو...... لیکن یہ شرارت ہے خطرناک...... میرا تو خیال ہے اُس خبیث کا وہاں رہنا ٹھیک نہیں۔''

''ٹھیک کہتی ہو۔'' پربودھ نے جواب دیا۔ ''میں ایک آدھ دن میں اُس کا انتظام کر دوں گا...... باقی...... اُس تھانیدار کی بھی خبر لیتا ہوں۔ کیا نام بتایا ہے تم نے اُس کا؟''

''پاتال سنگھ'' باجی جان نے جواب دیا۔ ''سب انسپکٹر ہے، شرتی بابون کا۔''

کمرے میں چند لمحے خاموشی طاری رہی۔ ماچس کی کھڑکھڑاہٹ سنائی دے رہی تھی۔ شاید پربودھ سگریٹ سلگا رہا تھا۔ پھر وہ گھمبیر آواز میں بولا۔ ''تم نے تھانیدار کا ذکر کیا ہے تو مجھے ایک اور بات یاد آ گئی ہے۔ وہ تھانیدار نواز...... کوئی ٹھیک بندہ نہیں ہے۔''

''کس نواز کی بات کر رہے ہو؟'' باجی جان نے بے ساختہ پوچھا۔

''وہی جس کے بندے سے کپڑا ہوا تھا تمہارا۔ وہ پکڑ کر لے گئے تھے تمہیں، پھر میں نے ٹیلیفون کر کے جان چھڑائی تھی۔''

باجی جان نے کہا۔ ''لیکن اب تو وہ سیدھا ہو گیا ہے بالکل۔''

''یہی تو تمہاری غلط فہمی ہے۔'' پربودھ نے ڈرامائی لہجے میں کہا۔ ''وہ جیسا ہمیں نظر آ رہا ہے ویسا ہے نہیں۔''

''کیا مطلب'' باجی جان نے خوفزدہ ہو کر پوچھا۔

پربودھ بولا۔ ''مجھے اس کے بارے میں کچھ اور ہی طرح کی رپورٹ ملی ہے۔ اس سے پہلے وہ امرتسر میں تھا، وہاں بڑا پھنّے خاں قسم کا تھانیدار سمجھا جاتا تھا۔ بڑا ماماں بنا پھرتا تھا قانون کا۔ اس سے پہلے لاہور میں بھی اُس کی اسی طرح کی شہرت ہے۔'' پھر کسی الماری یا میز کا دراز کھلنے کی آواز آئی۔ پربودھ کمار نے کہا۔ ''یہ دیکھو...... اس خبر میں نام ہے اس کا۔ ذرا پڑھو یہ ساری خبر۔'' پربودھ نے غالباً کوئی پرانا اخبار باجی جان کو تھما دیا تھا۔

میری رگوں میں خون سنسنانے لگا۔ صورتِ حال تیزی سے ایک نیا رخ اختیار کرتی جا رہی تھی۔ میرا دھیان خود بخود اپنے ریوالور کی طرف چلا گیا ریوالور میرے ہولسٹر میں موجود تھا۔ باجی جان کی لرزاں سی آواز اُبھری۔

''آ...... آپ ملے نہیں اُس سے؟''

''کس سے؟''

"ن۔۔۔۔۔۔نواز سے۔۔۔۔۔۔وہ۔۔۔۔۔۔وہ ادھر ہی ہے۔"

"میں سمجھا نہیں۔"

"میں نے۔۔۔۔۔۔میں نے راجندر کی جگہ سنبھالنے کے لیے نواز خاں کو ادھر بھیج دیا تھا۔"

"کیا؟" پربودھ چیخ پڑا۔ "کہاں ہے وہ؟" پھر دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ پربودھ اور باجی جان تیز قدموں سے باہر نکل گئے تھے۔

"آنندی۔۔۔۔۔۔آنندی۔" پربودھ اپنے ادھیڑ عمر نوکر کو آوازیں دے رہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ اب میرے لیے اس چار دیواری میں خطرہ ہی خطرہ ہے۔ اگر میں پربودھ کمار کے گھیرے میں آ گیا تو عین ممکن ہے یہ رات میری زندگی کی آخری رات ثابت ہو۔ میں اس کوٹھی میں آ کر جو کچھ دیکھ چکا تھا اور جان چکا تھا وہ پربودھ کمار کو وزارت کی کرسی سے نیچے پھینکنے کے لیے بہت کافی تھا اور پربودھ کمار اس حادثے سے بچنے کے لیے آخری حد تک جا سکتا تھا۔

چھجوں کے نیچے نیچے چلتا میں عقبی باغ کی طرف آیا۔ باغ کی دیوار زیادہ بلند نہیں تھی۔ میں یہ پھلاند کر باہر نکل سکتا تھا۔ تاہم میرے دیوار تک پہنچنے سے پہلے ہی کوٹھی میں بھاگ دوڑ مچ گئی۔۔۔۔۔۔اس بات میں شبہے کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ مجھے تلاش کیا جا رہا ہے۔ میں باغ کے وسط میں تھا جب کسی نے عقبی صحن کی بتیاں روشن کر دیں۔ "وہ رہا" کسی نے پشتو لب و لہجے میں چلا کر کہا۔ ایک شخص بھاگتا ہوا میری طرف آیا۔ یہ پربودھ کے لمبے تڑنگے گن مینوں میں سے ایک تھا۔ رائفل اس کے ہاتھ میں تھی لیکن ایک باوردی انسپکٹر پر گولی چلانے کی اسے ہمت نہیں ہوئی۔ شاید وہ بھی کوئی ریٹائرڈ فوجی یا پولیس والا تھا۔ اس نے بندوق کے کندے سے مجھ پر بھرپور وار کیا۔ میں نے پیچھے ہٹ کر یہ وار بچایا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ دوسرا وار کرتا میں نے سر جھکایا اور بھاگ کر اس سے لپٹ گیا۔ میرے دھکے سے وہ پشت کے بل ایک درخت سے ٹکرایا۔ میں نے گھٹنے کی ایک بھرپور ضرب اُس کی ناف میں لگائی۔ وہ تکلیف سے دہرا ہوا تو میں نے دھکیل کر اسے دور پھینک دیا۔ بیرونی دیوار مجھ سے قریباً تین گز کے فاصلے پر تھی۔ میں بھاگ کر دیوار سے لٹکا اور اوپر چڑھ کر دوسری طرف کود گیا۔ اس طرف دور تک ڈھلوان چلی گئی تھی اور کوہستانی درخت تھے۔ میں ان درختوں میں گھس جاتا تو ایک کانگریسی وزیر تو کیا پوری کانگریس بھی مجھے نہ ڈھونڈ سکتی۔

میں درختوں کی طرف بڑھنا ہی چاہ رہا تھا کہ میرا سارا اطمینان خاک میں مل گیا۔ میری دائیں جانب ایک ٹارچ کی روشنی چمکی۔ ایک خوفناک غراہٹ گونجی اور کوئی چیز "دبڑ

دبڑ" بھاگتی ہوئی میری طرف آئی۔ خون میری شریانوں میں جم گیا۔ یہ وہی کنگ سائز روسی کتا تھا جو میں نے پرسوں گیٹ پر دیکھا تھا اور جس کی آواز اکثر وادی میں گونجتی رہتی تھی۔ میں نے پوری توجہ سے آواز کی سمت دیکھا۔ ایک پرچھائیں مجھ پر جھپٹ رہی تھی۔ اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے میں نے جست لگائی اور نشیب میں لڑھک گیا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا جس طرف میں لڑھکا ہوں وہاں کیا ہے۔ ڈھلوان ہے، سینکڑوں فٹ گہری کھائی ہے کہ کچھ اور۔ ذہن میں بس ایک ہی بات تھی کہ مجھے اس خونخوار جانور کے حملے سے بچنا ہے۔ میں بھیگے ہوئے پتوں پر لڑھکنیاں کھاتا کوئی بیس پچیس فٹ نیچے گیا اور کسی درخت کے تنے سے جا ٹکرایا۔

مجھے کچھ معلوم نہیں میں نے کس وقت پستول نکالا اور کس وقت اپنا بازو سیدھا کیا، بس اتنا یاد ہے کہ جب گہری تاریکی میں روسی کتے کی آنکھیں چمکیں اور میں نے اسے خود پر جھپٹتے پایا تو میری انگلی خود بخود ٹرائیگر پر حرکت کرنے لگی۔ خوفناک دھماکوں سے تین گولیاں کتے کے جسم میں پیوست ہو گئیں اور وہ اندھیرے میں لڑھک کر سیدھا میری گود میں آ گرا۔ اس کے تڑپتے پھڑکتے جسم کا وزن کسی گدھے سے کم نہیں تھا۔ دیوار کی دوسری جانب سے "بھاگو پکڑو" کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں نے خود کو کتے کے نیچے سے نکالا اور ڈھلوان پر اُترتا چلا گیا۔

مسلسل بارشوں اور خراب راستے کی وجہ سے مجھے چندی گڑھ واپس پہنچنے میں خاصی دشواری پیش آئی۔ میں پربودھ کمار کی کوٹھی سے رات کوئی ساڑھے گیارہ بجے نکلا تھا یا کہیے کہ فرار ہوا تھا۔ اگلے روز شام کوئی سات بجے میں واپس چندی گڑھ پہنچ سکا۔ واپس پہنچتے ہی میں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ سب انسپکٹر باجوہ کو شملہ کے اس گاؤں میں بھیج دیا جہاں سے پربودھ شوبھا کو بیاہ کر یا پتہ نہیں کیسے لایا تھا۔ مجھے باجوہ کی صلاحیتوں پر پورا بھروسا تھا، میں نے اسے سمجھا دیا کہ وہ کسی مقامی مخبر کے ذریعے اس بات کا کھوج لگائے کہ شوبھا نامی وہ لڑکی پربودھ کمار تک کیسے پہنچی اور اس کے پاگل پن کی کہانی کیا ہے۔

اس کام سے فارغ ہو کر میں نے اپنے ایس ایس پی صاحب سے رابطہ قائم کیا اور انہیں اب تک کی کارروائی سے آگاہ کر کے ضروری ہدایات لیں۔ ہدایات کا تو بس نام ہی تھا، اصل مقصد یہ تھا کہ انہیں اعتماد میں لیا جائے۔ ایس ایس پی صاحب کو بھی باجی جان کے کردار میں بے حد دلچسپی محسوس ہوئی۔ انہوں نے اس خستہ حال لیکن با اثر عورت کے بارے میں کچھ اُڑتی اُڑتی سی باتیں سن رکھی تھیں۔۔۔۔۔۔

اس رات پربودھ کمار کی ڈلہوزی والی کوٹھی میں باجی جان اور پربودھ کے درمیان جو ناقابلِ فہم گفتگو ہوئی تھی، اس سے مجھے کچھ اور پتہ نہ بھی چلا ہو تو اتنا ضرور چل گیا تھا کہ باجی جان مسلمان نہیں بلکہ ہندو ہے...... اپنی گفتگو میں اس نے ایک سے زیادہ مرتبہ ''بھگوان'' کا نام لیا تھا اور اس قسم کے دوسرے الفاظ استعمال کیے تھے۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ کسی ہوشیار بندے کو ڈلہوزی بھیجوں تا کہ وہ باجی جان کا صحیح حدود اربعہ معلوم کر کے آئے۔ اس مقصد کے لیے بلال شاہ کو بھی استعمال کیا جا سکتا تھا لیکن وہ گدھے کے سر سے سینگوں کی طرح غائب تھا۔ پتہ نہیں کہاں تھا۔ یہاں تک کہ گرومندر کے دودھ دہی والوں کو بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے۔

اسی دوران باجوہ اپنے مشن سے واپس آ گیا۔ وہ نہ صرف بہت جلدی واپس آ گیا تھا بلکہ بہت کامیاب بھی رہا تھا۔ شوبھا نامی اُس پہاڑن لڑکی کے بارے میں سبھی کچھ اسے معلوم ہو چکا تھا۔ شوبھا کی کہانی میری توقع کے عین مطابق تھی۔ اس میں چونکانے والی کوئی بات نہیں تھی۔ ہاں رُلانے والی بہت سی باتیں تھیں مختصر ترین لفظوں میں یہ کہانی کچھ اس طرح تھی کہ پربودھ کمار ایک یتیم بے آسرا لڑکی کا سرپرست بن کر اسے ڈلہوزی لے گیا تھا۔ گاؤں والوں کے سامنے اس نے اس بات کا عزم کیا تھا کہ وہ اس لڑکی زندگی سنوار دے گا لیکن یہاں آ کر اس نے لڑکی کی زندگی سنوارنے کی بجائے اپنی راتیں سنوارنی اور چکانی شروع کر دیں۔ وہ لڑکی کا سرپرست بنا تھا لیکن شہر میں آ کر اس کا پرستار بن گیا۔ اس کے نوخیز حسن سے اپنی خواہشوں کا پیٹ بھرنے لگا، یہاں تک کہ لڑکی کا پیٹ بھی خالی نہیں رہا۔ وہ حاملہ ہو گئی۔ بندہ دور اندیش تھا۔ اس سے پہلے کہ کام بگڑ جاتا اور اس کی شہرت داغدار ہوتی اس نے شوبھا کو پلو سے باندھ کر آگ کے گرد پھیرے لے لیے لیکن جو دل سے اُتر چکا ہو اسے پلو سے باندھ کر بھی ساتھ نہیں رکھا جا سکتا۔ شوبھا کی بدقسمتی تھی کہ وہ بیوی بننے سے پہلے ہی اپنے مرد کے دل سے اُتر چکی تھی۔

وہ جی بھر کر اس سے کھیل چکا تھا، اس کے اثاثوں کو لوٹ چکا تھا۔ اب تو یہ مجبوری کا بندھن تھا شوبھا سے نجات پانے کے لیے پربودھ کمار نے اسے ذہنی مریض بنا ڈالا۔ پابندیاں، مار پیٹ، قید تنہائی یہ سب مظالم اس پر توڑے گئے۔ یہاں تک کہ وہ نشہ کرنے لگی اور اپنی زندگی اپنے ہاتھوں پھونکتی چلی گئی اور اب پربودھ کمار اپنی دل بستگی کے لیے ایک نئی کلی ڈھونڈ چکا تھا تا کہ کل اسے بھی مسل کر کسی گٹر میں بہا سکے۔

پربودھ کمار کے خلاف اب میرے پاس اتنے ثبوت جمع ہو چکے تھے کہ میں اسے ناکوں

چنے چبوا سکتا تھا، لیکن مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ اتنی آسانی سے قابو میں آنے والا شخص نہیں۔ ضرور کوئی داؤ کھیلے گا۔ اس کی خاموشی بے معنی نہیں تھی اور پھر یہی ہوا۔ ایک روز فرحت شام کے جھٹپٹے میں برقع اوڑھے تھانے پہنچی۔ آج پھر اس کی آنکھوں سے ساون بھادوں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ میں نے اس سے رونے دھونے کی وجہ پوچھی۔ وہ جواب دینے کی بجائے مجھ سے سوال کرنے لگی۔

''آپ ہفتے کے روز ڈلہوزی میں تھے؟''

''کیوں...... تمہیں کس نے کہا ہے؟'' میں اندر سے چونک سا گیا۔

''پربودھ صاحب نے۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''وہ تمہیں کہاں ملا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ نہیں ملے تھے، میں اور ابا جان ان سے ملنے گئے تھے۔ ان کے چندی گڑھ والے دفتر میں...... ریاض کی ضمانت کی درخواست مسترد ہو گئی ہے۔'' وہ ایک بار پھر ہچکیوں سے رونے لگی۔ روتے روتے ہی بولی۔ ''میرے تایا کہتے تھے کوئی بڑا وکیل کرنا پڑے گا۔ ورنہ ہو سکتا ہے اُسے اللہ نہ کرے پھانسی کی سزا ہو جائے۔ اس پر اغوا اور قتل کا الزام لگایا گیا ہے۔ یہ کوئی چھوٹی بات نہیں ہے۔''

میں نے کہا۔ ''لیکن پربودھ کے پاس تم کیا کرنے گئی تھیں؟''

وہ بولی۔ ''یہی کہنے کہ وہ ہمارے لیے کچھ کریں۔ وہ کہنے لگے میں کیا کروں۔ مجھے تو خود مصیبت پڑی ہوئی ہے۔ وہ مرکزی تھانے کا انسپکٹر نواز میرے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ پرسوں ڈلہوزی میں اس نے میری کوٹھی پر ہلّہ بولا ہے۔ میرے چوکیدار کو زدوکوب کیا ہے، میرے کتے کو گولی ماردی ہے اور اب مجھ پر ہی الٹا سیدھا کیس بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔''

میں نے فرحت سے پوچھا۔ ''لیکن پربودھ کمار نے یہ باتیں تم سے کیوں کہیں...... میرا مطلب ہے...... اسے معلوم ہے کہ ہم ایک دوسرے کو جانتے ہیں؟''

وہ بولی۔ ''ہاں معلوم ہے انہیں۔ میں نے ہی خالہ جان (باجی جان) کو بتایا تھا کہ میں انسپکٹر نواز کو بچپن سے جانتی ہوں۔ اور وہ باسط کو راہِ راست پر لانے میں میری مدد کریں۔ خالہ جان نے یہ سب کچھ پربودھ صاحب کو بتا دیا ہوگا۔ پربودھ صاحب اب مجھے طعنہ دے رہے ہیں کہ تمہارا وہ بچپن کا چہیتا انسپکٹر نواز میرے پیچھے پڑ گیا ہے اور الٹا سیدھا کیس بنا رہا ہے۔''

فرحت نے جو کچھ کہا اس سے میں سمجھ گیا کہ پربودھ کمار نے فرحت کے ذریعے مجھے

ایک اہم پیغام دیا ہے۔ اور وہ پیغام بالکل صاف اور دوٹوک ہے......فرحت کا بھائی ریاض قانون کے شکنجے میں ہے (اس پر انگریز عورت اور بچے کو کچلنے کا الزام ہے) اس کے علاوہ باسط کو اغوا یا قتل کرنے کا الزام بھی ہے۔ وہ اسی صورت میں سزا سے بچ سکتا ہے کہ وزیر پر بودھ کمار اس کی مدد کرے اور پر بودھ کمار اس کی مدد تب ہی کرے گا جب میں اس کے خلاف کوئی کارروائی نہ کروں۔

وہ بہت جہاندیدہ شخص تھا۔ اس نے کچھ لو اور کچھ دو کے اصول پر عمل کرتے ہوئے ترازو کا پلڑا برابر کر لیا تھا۔ میں نے فرحت کے بھائی ریاض الحسن کا کیس اچھی طرح دیکھا تھا۔ وہ واقعی اس بری طرح پھنسا ہوا تھا کہ پر بودھ جیسے شخص کے بغیر پولیس کچہری کے چکر سے نکل نہ سکتا تھا۔ دوسری طرف پر بودھ کے جرم کو نظر انداز کر دینا بھی انصاف کے ساتھ ایک بہت بڑا مذاق تھا۔ وہ معصوم عورتوں کا شکاری تھا اور حسن کی شکارگاہ میں شیر کی طرح دندنا رہا تھا۔ شوبھا کی کہانی ایک ایسے جن کی طرح تھی جو پچھلے تین برس سے بوتل میں بند تھا۔ یہ جن باہر نکل آتا تو پلک جھپکتے میں پر بودھ کے اقتدار کی گردن مروڑ دیتا۔

میں نے اور باجوہ نے مسلسل ایک ہفتہ غور و فکر کیا۔ شطرنج کی بساط کی مانند پر بودھ نے اپنا مہرہ ایسی جگہ رکھا تھا کہ ہم اسے مارتے تو ہمارا اپنا مہرہ بے موت مرتا تھا......زندگی میں پہلی دفعہ مجھے محسوس ہونے لگا کہ مجھے اس معاملے میں سودے بازی کرنا پڑے گی......یعنی میں وہ سب کچھ بھول جاؤں جو پر بودھ کی کوٹھی میں دیکھ چکا ہوں اور بدلے میں پر بودھ ریاض کو سی آئی اے کی سختیوں اور جیل کے عذابوں سے بچا لے۔ فیصلہ بہت سخت تھا، لیکن مجھے کرنا تھا اور ایک دو روز کے اندر اندر کرنا تھا لیکن یہاں یہ سوال بھی پیدا ہوتا تھا کہ فرحت کا کیا بنے گا۔ یعنی یہ ''سودا'' طے ہو گیا تو پر بودھ کمار فرحت کا پیچھا چھوڑ دے گا یا نہیں۔ میں نے سوچا کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے مجھے پر بودھ سے دوٹوک اور صاف صاف بات کر لینی چاہیے۔ یعنی اس نے کیا دینا ہے اور ہم نے کیا لینا ہے۔ میری ملازمت میں یہ پہلا موقع تھا کہ میں اس طرح ایک ملزم سے سودے بازی پر مجبور ہوا تھا لیکن شکر کا مقام ہے کہ اس سودے بازی کا سبب کوئی لالچ نہیں تھا۔

ایک مجبور بہن اور بوڑھے باپ کے آنسو تھے۔ وہ خاموش التجائیں تھیں جو ان کے چہروں پر رشتوں کے کرب سے لکھی ہوئی تھیں۔

جس روز میں پر بودھ کمار سے رابطہ کرنے کے لیے ڈلہوزی جا رہا تھا میرے دل کی عجیب حالت تھی۔ سینے میں جیسے کوئی شے ٹوٹ پھوٹ سی گئی تھی لیکن ابھی میں نے تھانے سے

قدم نکالا ہی تھا کہ ایک شخص کو دیکھ کر بری طرح چونک گیا۔ یہ وہی شخص تھا جو اس کیس میں سب سے زیادہ سرگرمی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ باجی جان نے اس کی دم پر پاؤں رکھا تھا اور اب وہ غرا غرا کر اس کی پنڈلی کو ''چک مارنے'' کی کوشش کر رہا تھا۔ میرا خیال ہے آپ سمجھ گئے ہوں گے۔ میں بلال شاہ کی بات کر رہا ہوں۔ گدھے کے سینگوں کی طرح غائب ہوا تھا اور آج انگوٹھی کے جن کی طرح حاضر ہو گیا تھا۔

بلال شاہ کے ساتھ جو شخص تھا اسے دیکھ کر میری ساری پریشانیاں تہس نہس ہو گئیں......وہ باسط علی تھا۔ وہی باسط علی جو آج سے دو مہینے پہلے اس ''وعدے کی شام' اچانک غائب ہو گیا تھا اور جس کی گمشدگی کا الزام ریاض پر اس بری طرح آیا تھا کہ اس بیچارے کو جان کے لالے پڑ گئے تھے۔ میں بھاگ کر بلال شاہ کے پاس پہنچا۔ بلال شاہ کی گردن فخر سے پھولی ہوئی تھی۔ آنکھوں میں بولتی ہوئی چمک تھی جیسے کہہ رہا ہو۔ ''دیکھ لو خان صاحب! میں نے دودھ جلیبیاں اور اُدھ رڑ کے حرام نہیں کیے۔ میں نے جو دشمنی مُول لی تھی اسے خود ہی توڑ پہنچایا ہے۔''

میں نے باسط کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بلال شاہ! یہ کہاں سے ملا ہے تمہیں؟''

وہ بولا۔ ''دیکھ لیں جی۔ جہاں سے بھی ملا ہے لے آیا ہوں۔ سوچا تھا جاتے جاتے یہ آخری کام آپ کا کر ہی جاؤں'' بلال شاہ ناراض معلوم ہوتا تھا۔ میں اسے بازو سے کھینچتا ہوا اندر لے آیا۔

بلال شاہ کی ناراضگی دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کی تین گلاس سے ایک گھونٹ لسّی بھی کم ہوئی تو یہ ناراضگی دور نہیں ہو گی۔ ساتھ میں کلیجے وغیرہ بھی ہو جاتے تو بہتر تھا۔ میں نے یہ سارے انتظامات کیے۔ ساتھ ساتھ باتوں سے بھی مسکہ لگاتا رہا۔ آخر بلال شاہ کا موڈ روپے میں آٹھ آنے ٹھیک ہو گیا۔ موڈ کی بحالی کے بعد اس نے جو کہانی سنائی اس طرح تھی۔

''وہ دن رات باجی جان سے بدلہ لینے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ آخر ایک روز خاموشی سے ڈلہوزی روانہ ہو گیا تا کہ باجی جان کی اصل حقیقت جان سکے۔ یہاں پہنچ کر بلال شاہ پر انکشاف ہوا کہ باجی جان مسلمان نہیں ہندو ہے اس کا اصل نام پاروتی ہے اور وہ بازارِ حسن کی ایک بدنام طوائف ہے۔ باجی جان کے متعلق مزید معلومات حاصل کرنے کے لیے بلال شاہ باجی جان کے بھائی کے گھر پہنچا۔ یہ بھائی مستانہ نام کا ایک بدشکل بونا ہے لیکن اس نے ایک دراز قامت خوبصورت عورت سے شادی کر رکھی ہے اور ڈلہوزی کی ایک مضافاتی بستی ''نولکھا'' میں رہتا ہے۔ بلال شاہ مستانہ نامی اس بونے کے پاس پہنچا لیکن وہ

بہت بدتمیزی سے پیش آیا اور بلال کو دھکے دے کر گھر سے نکال دیا۔ بلال تو پہلے ہی بھرا بیٹھا تھا۔ اس نے ایک خالص 'پلسیوں والا' وار کیا۔ مستانے کے گھر میں رات کے وقت چرس سے بھرا ہوا ایک لفافہ پھینک دیا اور بعد میں مقامی تھانے میں فون کر کے اطلاع دے دی۔ بلال شاہ اس بد دماغ بونے کو تھوڑا سا مزہ چکھانا چاہتا تھا لیکن اسے معلوم نہیں تھا کہ کوئی اور چکر نکل آئے گا۔ مخبری پر پولیس مستانے کے گھر پہنچی تو اس نے انہیں تلاشی سے روک دیا۔ وہ ہر صورت پولیس والوں سے مُک مکا کرنا چاہتا تھا۔ چند روز بعد بلال شاہ کو معلوم ہوا کہ اس روز مستانے نے پولیس کو گھر میں گھسنے سے روکنے کے لیے ایک لمبی رقم دی تھی۔ اس موقع پر بلال شاہ جیسے خرانٹ کا چونکنا لازمی تھا۔ وہ یہ سوچ سوچ کر ہلکان ہونے لگا کہ باجی جان کے بھائی نے اپنے گھونسلے میں کس ہُما کے انڈے چھپا رکھے ہیں جو کسی کو اندر گھسنے ہی نہیں دیتا۔ بلال شاہ کا دھیان آناً فاناً فرحت کے گمشدہ محبوب کی طرف چلا گیا۔ آخر وہ ایک تجربہ کار مخبر تھا۔ اس کی چھٹی حِس نے گواہی دی کہ دال میں ضرور کچھ کالا ہے۔ وہ اس تاڑ میں رہنے لگا کہ مستانہ اور اس کی بیوی گھر سے باہر ہوں تو وہ اندر گھس کر دیکھے۔ آخر پرسوں شب اسے یہ موقع مل گیا۔ یہاں ایک بند کمرے میں اسے باسط علی زنجیروں میں جکڑا نظر آیا۔ اس کے سر اور داڑھی کے بال بے تحاشہ بڑھے ہوئے تھے۔ لباس چیتھڑے ہو رہا تھا اور چہرے پر چوٹوں کے نشان تھے۔ بلال شاہ نے کوشش کر کے اس کی زنجیریں کھولیں اور ساتھ لے کر باہر نکل آیا۔ ایک رات وہ دونوں ڈلہوزی میں ہی چھپے رہے۔ پھر موقع ملتے ہی وہاں سے بھاگ نکلے۔ پٹھانکوٹ سے انہیں چندی گڑھ کی بس مل گئی اور وہ آج صبح نو بجے چندی گڑھ پہنچ گئے۔

بلال شاہ کی روئیداد سن کر میرے کانوں میں وہ گفتگو گونجنے لگی جو چند روز پہلے میں نے نصف شب کو پربودھ کی کوٹھی میں سنی تھی۔ اس گفتگو میں باجی جان کے بھائی کا ذکرِ خیر تھا۔ باجی جان یقیناً اسی پولیس چھاپے کا ذکر کر رہی تھی جو بلال شاہ نے چرس برآمد کرانے کے لیے اس کے بھائی کے گھر پر ڈلوایا تھا۔

وہ اسے کسی کی شرارت سمجھ رہی تھی۔ پھر اس نے یہ بھی کہا تھا کہ اب اس خبیث کا وہاں رہنا ٹھیک نہیں۔ ''خبیث'' سے اس کی مراد یقیناً باسط علی ہی تھا۔ وہ باسط علی جو باجی جان کو اپنا سچا ہمدرد سمجھتا تھا اور اس پر جان نثار کرتا تھا۔ اب یہ بات پوری طرح ثابت ہو چکی تھی کہ باسط علی کو پربودھ اور باجی جان نے اغوا کرایا تھا اور اس اغوا کا مقصد یہ تھا کہ باسط اور فرحت کو قریب آنے سے روکا جائے۔

باسط علی کے برآمد ہو جانے سے ریاض کے لیے حالات بالکل سازگار ہو چکے تھے۔ اب مجھے کسی طرح کا ڈر خطرہ نہیں تھا۔ میں نے تمام صورتِ حال ایس ایس پی والٹر نیل کو بتائی اور اگلے ہی روز وزیر پربودھ کمار پر ایک نہایت ہی دھانسو قسم کا کیس کر دیا......اس کیس نے پربودھ کمار اور اس کی جماعت کے صوبائی عہدیداروں کے طوطے اُڑا دیئے۔ باجی جان بھی اس رگڑے میں آ گئی۔ باجی جان کے ساتھ اس کا ٹھگنا بھائی اور دراز قد بھاوج بھی دھر لیے گئے۔ ان تینوں پر اغواء حبسِ بے جا اور عصمت فروشی وغیرہ کے کیس بنے۔ باجی جان کا اب سارا کچا چٹھا سامنے آ چکا تھا۔ وہ کوئی درویش صفت عورت نہیں ایک بدقماش طوائف تھی۔

رنگین طبع پربودھ کمار سے اس کے رابطے تھے۔ قریباً چھ ماہ پہلے پربودھ کمار نے فرحت کو ایک بین الصوبائی مباحثے میں تقریر کرتے ہوئے دیکھا۔ وہ ہزار جان سے اس پر لٹو ہو گیا لیکن اسے یہ بھی معلوم تھا کہ یہ نوعمر مسلمان دوشیزہ اس سے اتنی ہی دور ہے جتنا مشرق سے مغرب۔ یہ دوری پربودھ کی ہوس کو بجھا نہ سکی۔ اسے تو مزا ہی مشکل ترین کام کرنے میں آتا تھا۔ اس نے ایک روز باجی جان یعنی پاروتی کو فرحت کی اخبار میں چھپی ہوئی تصویریں دکھائیں اور اشاروں اشاروں میں عندیہ ظاہر کیا کہ اس لڑکی پر کوئی جال پھینکو۔ کام بہت مشکل تھا لیکن باجی جان جانتی تھی اس میں نوٹ بھی بہت ملیں گے......آخر ایک روز اس نے کمرِ ہمت باندھی اور ایک اللہ لوک پہاڑن کے روپ میں ڈلہوزی سے چندی گڑھ پہنچ گئی۔ بعد کے واقعات آپ جانتے ہی ہیں کہ کس طرح اس نے ماسٹر علی احمد کے گھر میں اپنا اعتماد قائم کیا اور پھر آہستہ آہستہ حالات کو اپنے مطلب کی ڈگر پر لانے لگی۔ اگر اس روز اتفاقاً کپڑا مارکیٹ میں بلال شاہ اور باجی جان کی جھڑپ نہ ہوتی اور باجی جان ہاتھ دھو کر بلال شاہ کے پیچھے نہ پڑتی تو نہ جانے اس وقت حالات کیا ہوتے۔ باجی جان یقیناً چھپی رستم تھی لیکن اس کا حد سے بڑھا ہوا اعتماد اسے نقصان پہنچا گیا۔ وہ مجھے اور بلال شاہ کو کیڑے مکوڑوں کی طرح سمجھ رہی تھی لیکن ہم ایسے گئے گزرے بھی نہیں تھے۔ سی آئی اے سٹاف میں چھتر کھانے کے بعد بلال شاہ کا ڈنگ تو خاص طور پر بہت تیز ہو چکا تھا اور پھر اس نے سچ مچ باجی سے ٹکر لے کر دکھا دی۔

چند معزز افراد کے سمجھانے بجھانے پر ماسٹر احمد علی (یا شاید علی احمد مجھے ان کا نام ٹھیک طرح یاد نہیں) باسط علی کو داماد بنانے پر تیار ہو گئے۔ دو ماہ بعد ان کی شادی ہوئی۔ اس شادی میں بلال شاہ نے بہت ''گج وج'' کر شرکت کی اور دلہا دلہن کے ساتھ کھڑے ہو کر سپیشل

تصویریں کھنچوائیں۔ میں نے وہ تصویریں دیکھ کر پوچھا۔"ان کا کیا کرنا ہے؟"

بولا۔"اس حرام زادی کو جیل میں بھیجنی ہیں۔ ساتھ میں لڈو بھیجوں گا اور میٹھے چاول بھی۔ بلکہ یہ ساری چیزیں خود دے کر آؤں گا۔ آخر دشمنی بھی کوئی چیز ہوتی ہے خان صاحب!"

میں نے کہا۔"چھوڑو یار۔ جتنے پیسے ان چیزوں پر خرچ کرو گے اتنے میں تم تین روز دودھ جلیبی کھا سکتے ہو۔" وہ بولا۔"دودھ جلیبی تو روز ہی کھاتے ہیں جی، لیکن دشمن کو تیلی لگانے کا موقع تو روز نہیں ملتا ناں۔ خدا کی قسم خان صاحب، آپ کو معلوم نہیں میرے اندر اس ہتھنی کے لیے کتنا بارود بھرا ہوا ہے۔ کبھی کبھی تو سوچتا ہوں کاش میں زنانہ پولیس میں ہوتا۔ وہ میرے تھانے میں آتی چھتر مار مار کر اس کی چربی کھور دیتا...... کاش۔"

☆======☆======☆

بُری عورت

عورت شرم وحیا کا مجسمہ ہوتی ہے اور اپنی عزت کے لیے جان پر کھیل جاتی ہے لیکن جب کوئی عورت اپنی شرم وحیا سے دستبردار ہو جاتی ہے تو بڑے بڑے نیکو کار کو ننگا کر کے چوراہے میں کھڑا کر دیتی ہے۔

ایک کینہ پرور عورت کا قصہ جس نے ایک پولیس افسر کو ذلیل کرنے کے لیے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا۔

یہ واقعہ سیالکوٹ شہر کا ہے۔ ان دنوں میں سب انسپکٹر تھا۔ ایک روز مخبری ہوئی کہ تھانے سے کوئی ڈیڑھ کلومیٹر دور نوری اسٹریٹ میں ایک شخص جواء خانہ چلا رہا ہے۔ یہ اطلاع ایک گمنام خط کے ذریعے ملی تھی میں نے اپنے حوالدار کو اس اطلاع کی تصدیق کے لئے بھیجا۔ وہ پورے دو روز ٹوہ لگاتا رہا۔ آخر اس نے آ کر بتایا کہ اطلاع سو فیصدی درست ہے۔ واحدی نامی ایک شخص نے حلوے پوڑی کی دکان کے نیچے ایک تہہ خانہ میں یہ قمار خانہ کھول رکھا ہے۔ رات ساڑھے آٹھ بجے کے بعد یہاں جواری اکٹھے ہو جاتے ہیں اور خوب جواء ہوتا ہے۔

میں نے اسی روز ایک مختصر چھاپہ مار پارٹی ترتیب دی اور قریباً دس بجے حلوے پوڑی کی دکان پر چھاپہ مارا۔ یہ دراصل مٹھائی کی دکان تھی۔ واحدی سویٹ مارٹ کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ دکان کے پیچھے چند کرسیاں میز رکھے تھے۔ ان پر بیٹھ کر لوگ ناشتہ وغیرہ کرتے ہوں گے۔ اس وقت بھی ایک شخص بیٹھا چمچے سے گلاب جامن کھا رہا تھا۔ دکاندار ایک دس پندرہ سالہ لڑکا تھا۔ پولیس کو دیکھتے ہی وہ اس قدر گھبرایا کہ گدی سے اٹھ کر دوڑ لگا دی۔ دکان کے سامنے سے گزر کر ہم بغلی گلی میں آ گئے۔ یہاں ایک چھوٹا سا دروازہ تھا۔ لکڑی کے تختوں کی جگہ کنستروں کی چادر لگی ہوئی تھی۔ دروازہ توڑ کر ہم اندر گھسے اور ایک زینہ طے کر کے تہہ خانے میں پہنچ گئے۔ تہہ خانہ سگریٹوں کے دھوئیں سے بھرا ہوا تھا۔ آٹھ دس میزوں پر بیس پچیس بندے بیٹھے جواء کھیل رہے تھے۔ کسی کسی میز پر شراب کی بوتل بھی دکھائی دے رہی تھی۔ ہمیں دیکھ کر جواریوں کا وہی حال ہوا جو ہونا چاہئے تھا۔ وہ بوکھلاہٹ میں بُری طرح ناچ کر رہ گئے۔

''خبردار!'' میں نے بلند آواز سے کہا۔ ''کوئی ہلا تو شوٹ کر دوں گا۔''

میرے ہاتھ میں 32 بور کا ریوالور تھا۔ میرے تین رائفل مین بھی بندوقیں تانے کھڑے تھے۔ واحدی نامی شخص ایک کاؤنٹر کے پیچھے آنکھیں پھاڑے ہمیں دیکھ رہا تھا۔ پھر

اس نے پھرتی کا مظاہرہ کیا اور اچانک ہاتھ بڑھا کر مین سوئچ بند کر دیا۔ تہہ خانہ تاریکی میں ڈوب گیا۔ اس کی چال کامیاب رہی۔ جواری کرسیاں اور میز الٹاتے مختلف اطراف میں بھاگے۔ ہم نے آٹھ دس کو پکڑ لیا لیکن باقی بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ بعد ازاں پتہ چلا کہ تہہ خانے کا ایک دروازہ اور بھی تھا۔ بہرحال پکڑے جانے والوں میں اڈے کا مالک واحدی بھی شامل تھا اور ہمیں سب سے زیادہ اسی کی ضرورت تھی۔ وہ چوبیس پچیس سالہ جوان شخص تھا۔ رنگ صاف، چھاتی چوڑی اور چہرہ بھاری مونچھوں کی وجہ سے کافی سخت لگتا تھا۔ کسی وقت یہ شخص پہلوانی بھی کرتا رہا تھا مگر اب کالے دھندوں میں پڑ گیا تھا۔

تھانے لا کر اسے پھینٹی لگائی گئی تو اس نے اعتراف کر لیا کہ جوئے خانے کے علاوہ وہ اپنے گاہکوں کو افیم، شراب وغیرہ بھی مہیا کرتا ہے۔ اگلے روز عدالت میں پیش کر کے میں نے اس کا سات روزہ ریمانڈ لے لیا۔ ریمانڈ ختم ہوا تو اسے جوڈیشل ریمانڈ پر جیل بھیج دیا گیا۔

☆======☆======☆

اس روز مجھے چھٹی تھی۔ میں اپنے رہائشی کوارٹر کی چھت پر بیٹھا دھوپ سینک رہا تھا کہ میرے گھریلو ملازم بابا دیناں نے اطلاع دی کہ کوئی برقع پوش عورت مجھ سے ملنا چاہتی ہے۔ میں نے چھت کی منڈیر سے سر نکال کر دیکھا۔ ٹوپی والے دیسی برقعے میں کوئی عورت جھکی ہوئی کھڑی تھی۔ عمر رسیدہ لگتی تھی۔ میں نے بابے دینے سے کہا کہ اسے بیٹھک میں بٹھاؤ۔ تھوڑی دیر بعد گرم چادر میں بکل مار کر میں بھی بیٹھک میں چلا گیا۔ مجھے دیکھ کر عورت نے برقع الٹ دیا۔ میں دیکھ کر حیران ہوا کہ وہ ایک جوان خوبصورت عورت ہے۔ عمر زیادہ سے زیادہ چھبیس سال رہی ہو گی۔ تیکھے نقوش، لمبی گردن اور ناک میں لونگ چمک رہا تھا۔ یا تو وہ واقعی خوبصورت تھی یا دیسی برقعے سے نکلنے کی وجہ سے اتنی خوبصورت لگ رہی تھی۔ اس کا چہرہ پریشانیوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کوئی مسئلہ لے کر آئی ہے۔

''ہاں بی بی! کیا بات ہے؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے جھجک کر بابے دینے کی طرف دیکھا۔ میں نے بابے کو اشارہ کیا کہ وہ باہر چلا جائے۔ بابا چلا گیا تو عورت نے سر جھکایا اور اچانک اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ میں نے کہا۔

''بی بی! مسئلہ کیا ہے۔ اس طرح رونے سے مجھے الہام نہیں ہو جائے گا۔''

وہ بولی۔ ''جی میں واحدی کی بیوی ہوں۔'' اس کی آواز میں بڑا زبردست لوچ پایا جاتا تھا۔

"اوہ اچھا۔" میرے منہ سے نکلا۔ اب سارا معاملہ میری سمجھ میں آرہا تھا۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ پکڑے جانے والوں کے والی وارث اس طرح بھاگ دوڑ کیا ہی کرتے ہیں۔ کوئی رشوت پیش کرتا ہے، کوئی سفارش لاتا ہے، کوئی ذاتی تعلقات کا واسطہ دینے آجاتا ہے...... ہاں جب کوئی اکیلی خوبصورت لڑکی اس طرح آتی ہے تو وہ بہت خطرناک ہوتی ہے۔ میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔

"ہاں بی بی! میں کیا سیوا کر سکتا ہوں۔"

میرے خشک لہجے پر اس نے پلکیں اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ "میں اکیلی عورت ذات ہوں جی۔ کوئی بال بچہ ہے، نہ کوئی آگے پیچھے ہے۔ اب کہاں جاؤں۔ جو دیکھتا ہے بُری نظر سے دیکھتا ہے۔ شوہر کے بعد کوئی سہارا نہیں۔ آپ سب کچھ کر سکتے ہیں جی مجھ بے سہارا پر رحم کریں۔"

میں نے کہا۔ "بی بی! میں تو ایک ادنیٰ ملازم ہوں۔ وہی کرتا ہوں جو قانون مجھے کہتا ہے۔ تیرے شوہر نے جرم کیا ہے اسے پکڑا ہی جانا تھا۔ میں نہ پکڑتا تو جو میری جگہ ہوتا وہ پکڑ لیتا۔"

"وہ بے قصور ہے جی! بُرے یاروں کے کہنے میں آگیا تھا۔"

"بی بی! قصوروار ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ مجھے نہیں عدالت کو کرنا ہے۔ اگر وہ گناہ گار نہیں تو چھوٹ جائے گا۔ اس کے علاوہ تم کو اس طرح یہاں آنا بھی نہیں چاہئے تھا۔ یہ بڑی غلط بات کی تم نے۔"

وہ ایک بار پھر آنسو بہانے لگی اور مجھے مجبور کرنے لگی کہ میں اس کے لئے کچھ کروں۔ بہت مشکل سے سمجھا بجھا کر اور ڈانٹ ڈپٹ کر میں نے اسے واپس بھیج دیا۔

مجھے امید تھی کہ اب وہ دوبارہ نہیں آئے گی لیکن یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ پانچ چھ دن بعد وہ ایک روز پھر آدھمکی۔ میں تھانے سے آیا تو بابے دینے نے بتایا کہ وہ سفید برقعے والی عورت پھر آئی بیٹھی ہے، آپ کا انتظار کر رہی ہے۔ پہلے تو مجھے غصہ آیا۔ جی چاہا کہ کھینچ کر باہر نکال دوں۔ مگر پھر دل پر جبر کر کے اس کے پاس جا بیٹھا۔

"ہاں جی، اب کیا مسئلہ ہے؟" میں نے پوچھا۔

آج اس نے برقع اتار کر کندھوں پر ڈالا ہوا تھا اور ایک ہاتھ ٹھوڑی کے نیچے ٹکائے، چارپائی پر پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی۔ مجھے دیکھا تو دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر سسکیوں سے رونے لگی۔ میرے بار بار پوچھنے پر اس نے بتایا کہ رات کوئی دھم سے اس کے صحن میں آکودا۔

پہلے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹاتا رہا۔ پھر کھڑکی کو دھکا دے کر اس کی کنڈی گرا دی اور اندر چلا آیا۔ وہ دہشت سے گنگ ہو کر رہ گئی۔ اس نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور ہاتھا پائی کرنے لگا۔ مگر پھر اس نے خود کو چھڑا لیا اور زور زور سے چیخنے لگی۔ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹا اور کھڑکی سے کود کر بھاگ گیا۔

اس نے روتے ہوئے اپنا کندھا دکھایا۔ قمیص پھٹی ہوئی تھی اور سفید دودھیا بازو کہنی تک نظر آرہا تھا۔ وہ بولی۔ "بڑے سخت ہاتھ تھے جی اس کے، میرا سارا جسم نیلو نیل کر دیا۔ مجھے بڑی گندی گالیاں دی اور دھمکیاں دیں کہ وہ پھر آئے گا اور مجھے چھوڑے گا نہیں۔"

میں سوچ میں ڈوب گیا۔ عورت کا انداز مجھے بہت کچھ سمجھا رہا تھا۔ اب اتنا بھی بدھو نہیں تھا میں۔ وہ بہانے بہانے سے میرے جذبات ابھار رہی تھی۔ اپنا عریاں کندھا دکھا کر اور مرچ مسالے لگا کر بات بتانے سے وہ ایک خاص مقصد حاصل کرنا چاہتی تھی۔ مجھے یک دم ہی اندازہ ہوا کہ وہ بڑی "پہنچی" ہوئی عورت ہے۔ اس کی اصلیت جاننے کے لئے میں بھی انجان بن گیا۔ اس کے عریاں کندھے پر نظریں جمائے ہوئے میں نے کہا۔

"ہاں...... یہ تو بڑی زیادتی کی بات ہے۔ کیا تم نے اس شخص کو پہچانا نہیں؟"

"کہاں جی۔" وہ آنسو پونچھتی ہوئی بولی۔ "اس نے چہرہ پگڑی میں چھپا رکھا تھا۔ بڑا لمبا چوڑا غنڈہ تھا جی، کندھے سے پستول بھی لٹک رہا تھا۔"

"اب پھر کیا کیا جائے؟"

"میری تو جی ہمت نہیں کہ آج رات پھر اکیلی رہوں۔ سری نگر میں میرا ایک چاچا رہتا ہے۔ سوچتی ہوں اس کے پاس چلی جاؤں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر اب کہاں جاؤ گی؟"

اس نے عجیب نظروں سے میری طرف دیکھا۔ "آج کی رات یہیں پڑا رہنے دیں تو مہربانی ہوگی۔ اگر نکال دیں گے تو آپ کے دروازے پر بیٹھی رہوں گی۔"

وہ مجھے پکا اُلو کا پٹھا سمجھ رہی تھی۔ میں نے لگاوٹ سے کہا۔ "تو پھر ٹھیک ہے، اِدھر ہی سو رہو۔ میں بابے دینے کو کہتا ہوں وہ باہر برآمدے میں چارپائی ڈال لے گا۔"

وہ سمجھ گئی کہ تیر نشانے پر لگا ہے۔ اپنے عریاں کندھے پر سے جان بوجھ کر اوڑھنی کھسکا کر بولی۔ "جیسے آپ کی مرضی ویسے......"

"ویسے کیا؟"

"ویسے آپ میرے قریب ہوتے تو زیادہ تسلی رہتی۔"

میں سمجھ گیا کہ اب وہ سیدھی سیدھی باتوں پر آ گئی ہے۔ میں نے بھی مسکرا کر کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ جیسے تمہاری مرضی، میں سو جاؤں گا برآمدے میں۔''

اس کی آنکھوں میں چمک سی لہرا گئی۔ ایک ادا سے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں سے کاٹ کر بولی۔ ''سب کچھ آپ کے ہاتھ میں ہے جی۔ آپ چاہیں تو واحدی بچ سکتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''کیس تو بڑا بگڑ چکا ہے لیکن......''

''لیکن کیا جی؟'' اس نے ماہرانہ جنبش سے اوڑھنی سر سے ڈھلکا دی۔ اس کے لمبے بال اور جسمانی خدوخال نمایاں ہو گئے۔ میں نے آگے بڑھ کر ایک تھپڑ اس کے منہ پر مارا۔ وہ چکرا کر رہ گئی۔

''اٹھو یہاں سے۔'' میں نے کڑک کر کہا۔

وہ بوکھلا کر میرا منہ دیکھنے لگی۔ ''اٹھو'' میں دوبارہ گرجا۔ وہ جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ایک دم اس کی آنکھوں میں بے پناہ نفرت اور بیگانگی نظر آنے لگی۔ میں نے انگلی سے اشارہ کیا۔ ''وہ ہے باہر کا دروازہ اور خبردار آئندہ یہ دروازہ پار کرنے کی کوشش کی۔''

اس نے ایک لفظ زبان سے نہیں کہا۔ جھلائے ہوئے انداز میں اپنا برقع اٹھایا اور اسے پہنتے پہنتے تیز قدموں سے باہر نکل گئی۔

☆======☆======☆

پھر اس واقعے کو قریباً ڈیڑھ سال گزر گیا۔ میری تبدیلی پسرور کے ایک مضافاتی تھانے میں ہو چکی تھی۔ ان دنوں میں رسہ گیروں کے ایک گروہ کا قلع قمع کرنے میں مصروف تھا۔ ایک روز نارووال کے تھانے کا ایک سب انسپکٹر محمد نواز میرے پاس آیا۔ اس کے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ کہنے لگا۔

''استاد لنگڑ کو جانتے ہو؟''

میں نے ذہن پر زور دیا اور کوئی ایسا بیہودہ نام یاد نہیں آیا۔ کہنے لگا۔ ''یہ بڑا چھٹا ہوا بدمعاش ہے۔ کچھ ہی روز پہلے جیل سے رہا ہوا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''تو پھر میں کیا کروں؟''

محمد نواز بولا۔ ''یار! مجھے لگتا ہے یہ شخص تیرے پیچھے ہے۔''

''میرے پیچھے کیوں ہے؟''

نواز نے گہری سانس لی۔ ''میرا خیال ہے کہ ناموں کی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ تیرا نام بھی نواز ہے اور میرا بھی۔ دونوں سب انسپکٹر ہیں۔ یہ میرے سر پر پٹی دیکھ رہے ہو نا یہ اسی چکر میں

بندھی ہے۔''

مجھے یہ معاملہ کچھ پُراسرار محسوس ہوا۔ میں نے کہا۔ ''تفصیل سے بتا بات کیا ہے؟''

وہ بولا۔ ''پرسوں کی بات ہے۔ شام کو میری بیوی نے بتایا کہ گھر کے سامنے ہرے صافے والا ایک مشکوک سا آدمی گھومتا رہا ہے۔ اس کی چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی تھی اور شلوار قمیص پہنے ہوئے تھا۔ میں نے اس بات پر کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ اسی رات یعنی پرسوں رات میرے کان میں درد شروع ہو گیا اور میں دیر تک جاگتا رہا۔ وہ کوئی گیارہ ساڑھے گیارہ کا وقت تھا جب برآمدے کی طرف سے آہٹ سنائی دی۔ میں نے سوچا پولیس والے کے گھر چور کا کیا کام۔ کوئی بلی وغیرہ ہو گی مگر تھوڑی دیر بعد مجھے اٹھنا ہی پڑا۔ لالٹین لے کر برآمدے میں آیا تو ایک شخص ستون کے پیچھے کھڑا نظر آیا۔ جونہی میں نے لالٹین اونچی کی وہ تڑپ کر سامنے آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں دیسی ساخت کا پستول تھا۔ پھر ایک عجیب واقعہ ہوا۔ جیسے ہی اس نے میرا چہرہ دیکھا حیران سا رہ گیا۔ پستول سیدھا کرنے کی بجائے اس نے رخ موڑا اور بیرونی دروازے کی طرف بھاگ نکلا۔ میں نے اسے للکارا اور لالٹین نیچے رکھ کر اس کا پیچھا کیا۔ بدبختی سے میری چادر میرے پاؤں کے نیچے آ گئی اور اوندھے منہ گر کر میرا سر پھٹ گیا۔ اس نے تیزی سے دیوار پھاندی اور بھاگ نکلا۔ مجھے اس شخص پر بڑا طیش تھا۔ کل صبح سویرے میں نے کچے صحن سے اس کا کھرا اٹھوایا اور اپنے اے ایس آئی کو تفتیش پر لگا دیا۔ اس شخص کا ہرا صافہ بھی ہمارے صحن میں ہی رہ گیا تھا یہ صافہ دیکھ کر میرے تھانے کا ایک سنتری چونک گیا۔ اس نے بتایا کہ صافے والا شخص کل صبح سویرے تھانے کے پاس گھوم رہا تھا۔ اس نے سنتری سے پوچھا کہ تھانیدار صاحب کتنے بجے آتے ہیں۔ پھر پوچھنے لگا کہ یہ وہی نواز صاحب ہیں جو اس سے پہلے سیالکوٹ کے فلاں تھانے میں کام کرتے رہے ہیں۔ سنتری کو صحیح طرح پتہ نہیں تھا، اس نے ہوں ہاں میں جواب دے دیا۔ بعد میں یہی شخص ایک چائے خانے پر بھی پہنچا۔ یہ چائے خانہ تھانے کے بالکل سامنے واقع ہے۔ چائے خانے کے مالک سے بھی اس نے میرے بارے میں سن گن لی۔ اس شخص نے اسے پہچان لیا۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ استاد لنگڑ تھا۔''

محمد نواز نے سگریٹ سلگا کر ایک گہرا کش لیا اور بولا۔ ''کل مجھے یاد آیا کہ تمہیں بھی عام طور پر نواز ہی کہا جاتا ہے اور تم اس سے پہلے سیالکوٹ میں کام بھی کر چکے ہو۔ پھر مجھے رات کا منظر یاد آیا جب وہ اچکا میری شکل دیکھ دیکھتے ہی الٹے پاؤں بھاگ نکلا تھا۔ مجھے پکا یقین ہو گیا کہ یہ شخص تمہارے ہی پیچھے ہے۔ آج میں سپیشل اسی لئے تمہارے پاس آیا ہوں کہ تمہیں

خبردار کرسکوں۔"

محمد نواز کی بات پوری طرح میری سمجھ میں آرہی تھی۔ میں نے بہت غور کیا مگر استاد لنگڑ نام کا کوئی شخص ذہن میں نہیں آیا۔ ہوسکتا تھا میرے دوست سب انسپکٹر کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہو۔ یہ بھی ممکن تھا کہ کوئی تیسرا نواز بھی ہو۔ بہرحال میں نے سب انسپکٹر کا شکریہ ادا کیا اور اسے کھانا وانا کھلا کر واپس بھیج دیا۔ اگلے ہی روز مجھے ایک کیس کے سلسلے میں امرتسر جانا پڑ گیا۔ وہاں سے ایک ہفتے بعد واپسی ہوئی۔ واپس آیا ہی تھا کہ ساتھ والے گاؤں میں "پانی توڑنے" کے معمولی جھگڑے پر دوہرے قتل کی واردات ہوگئی۔ دو تین روز اس سلسلے میں مصروف رہا، کسی اور طرف خیال ہی نہیں گیا۔

☆======☆======☆

وہ ایک ٹھنڈی ٹھار رات تھی، میں دن بھر کا تھکا ہارا گھر گیا اور جاتے ساتھ ہی لحاف میں پڑ کر سوگیا۔ نہ جانے وہ کون سا پہر تھا۔ اچانک کسی وجہ سے میری آنکھ کھل گئی۔ مجھے مٹی کے تیل کی تیز بو آئی۔ پہلے تو میں سمجھا شاید کسی وجہ سے لالٹین الٹ گئی ہے لیکن چارپائی کے نیچے دیکھا تو لالٹین اپنی جگہ پر تھی اور اس کی مدھم روشنی کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ اچانک مجھے بابے دینے کی تیز چیخ سنائی دی اور اس کے ساتھ ہی سُرخ روشنی نظر آئی۔ "آگ" میرے ذہن نے پکار کر کہا۔ میں نے لحاف پرے پھینکا اور چپل گھسیٹ کر برآمدے میں آگیا۔ بھک بھک کی خوفناک آوازیں آئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے برآمدے کی چھت نے آگ پکڑ لی۔ یہ ایک چھوٹا سا رہائشی کوارٹر تھا۔ ایک کمرہ، ایک باورچی خانہ اور ایک سٹور جسے بابا دینا سونے کے لئے استعمال کرتا تھا۔ یہ سٹور اب دھڑا دھڑ جل رہا تھا۔ آگ برآمدے سے گزر کر کمرے میں پہنچ گئی تھی۔ چھتیں سرکنڈوں کی تھیں اور تڑتڑ کی آوازوں سے جل رہی تھیں۔ ہر طرف چنگاریاں سی اُڑ رہی تھیں۔ دھوئیں نے جیسے میرے پھیپھڑوں میں تیز خنجر اتار دیئے۔ میں نے بُری طرح کھانستے ہوئے بابے دینے کو آواز دی۔ وہ گرتا پڑتا برآمدے کے مشرقی کونے کی طرف جارہا تھا۔ ایک کونے سے ٹیں ٹیں کی مسلسل آواز آرہی تھی۔ یہ دراصل بابے دینے کا پالتو طوطا تھا۔ اپنی جان کی پرواہ کیے بغیر وہ طوطے کے پنجرے تک پہنچنا چاہتا تھا۔ یہ اس کی بیوقوفی تھی۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ اوندھے منہ دھڑام سے ایک مٹکے پر گرا اور اسے توڑتا ہوا زمین بوس ہوگیا۔ میں نے لپک کر دبلے پتلے بابے کو گود میں اٹھایا اور آگ کے گھیرے سے نکلنے کی کوشش کرنے لگا۔ جلتے ہوئے دروازے کو پھاند کر میں جونہی گلی میں پہنچا ایک ساتھ دو دھماکے ہوئے اور دو گولیاں سنسناتی ہوئی میرے سر پر سے گزر گئیں۔ بے اختیار

میں پہلو کے بل گرا۔ صرف تین گز کی دوری پر مجھے ایک لمبا تڑنگا شخص نظر آیا۔ اس کے چہرے پر منڈاسا تھا۔ وہ اپنے پستول والے ہاتھ کو جھٹک رہا تھا۔ شاید گولی نال میں پھنس گئی تھی۔ یہ لمحے میرے لئے قیمتی تھے۔ اس سے پہلے کہ پستول والے کے عقب سے برآمد ہونے والا اپنی کاربین میری طرف سیدھی کرتا میں اپنی ٹانگوں کی پوری قوت استعمال کر کے بھاگا اور پستول والے پر جا پڑا۔ کاربین والا بھی پستول والے کے پیچھے تھا اس لئے وہ بھی ساتھ ہی گرا۔ گاؤں والے بھاگ بھاگ کر گھروں سے نکل رہے تھے۔ انہوں نے جب مجھے دو افراد سے گتھم گتھا دیکھا تو میری مدد کو آگے بڑھے۔ کاربین والے کو دو نوجوانوں نے گھیر لیا۔ ان کے ایک تیسرے ساتھی نے بھاگنے کی کوشش کی تو لوگ اس کے پیچھے بھاگے۔ ریوالور والا ابھی تک مجھ سے لپٹا ہوا تھا۔ اس کے جسم میں خاصی قوت تھی۔ لگتا تھا وہ بے پناہ طیش میں ہے۔ طیش مجھے بھی کم نہیں تھا۔ میں نے پورے زور سے کلائی مروڑ کر پستول اس کے ہاتھ سے چھڑا دیا اور اوپر تلے کئی ٹکریں اس کی ناک پر ماریں۔ جونہی میری کمر پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑی۔ میں نے پیچھے ہٹ کر ایک زوردار گھٹنا اس کے پیٹ میں رسید کیا اور دایاں ہاتھ گھما کر اس کے جبڑے پر مارنا چاہا۔ اس نے کچھ مزید جھک کر یہ وار بچالیا اور جھکے جھکے میری ٹانگ پکڑ لی لیکن اس سے پہلے ہی میرا بایاں گھٹنا کام کرگیا۔ اس کے جبڑے پر ایک زوردار چوٹ لگی اور وہ ڈکراتا ہوا آگ کے بالکل پاس جاگرا...... میں نے اس کے سینے پر چڑھ کر اسے بے بس کردیا۔

میرے دیہاتی کوارٹر کو آگ لگانے والے کل تین افراد تھے۔ ان میں سے ایک بھاگ گیا اور دو اپنے اسلحے سمیت پکڑے گئے۔ لوگوں نے ان دونوں کو بُری طرح مارا۔ اگر میں بچاؤ نہ کرتا تو شاید اسی جگہ ان کا قصہ تمام ہوجاتا۔ لوگوں نے قریبی جوہڑ سے پانی لے کر آگ بجھانے کی سرتوڑ کوشش کی۔ پھر بھی چھوٹے سے کوارٹر کا نصف حصہ جل کر راکھ ہوگیا۔ کوارٹر میں میرا کوئی زیادہ سامان نہیں تھا۔ دو چارپائیاں، ایک صندوق اور روزمرہ استعمال کی کچھ چیزیں لیکن ایک نقصان کا بے حد افسوس ہوا۔ بابے دینو کا پالتو طوطا پنجرے میں ہی پھڑک پھڑک کر کوئلہ ہوگیا۔ اس کے علاوہ میں نے چند مرغیاں پال رکھی تھیں وہ بھی جل گئیں۔

دونوں گرفتار شدگان کو رات ہی تھانے پہنچا دیا گیا تھا۔ صبح سویرے ان سے ملاقات ہوئی۔ رات لڑائی کے دوران پستول والے کا صافہ کھل گیا تھا اور مجھے اس کی شکل کچھ جانی پہچانی لگی تھی۔ صبح تھانے آکر غور سے دیکھا تو کچھ یاد آنے لگا۔ اس شخص سے سیالکوٹ میں

کہیں ملاقات ہوئی تھی۔ اتنے میں میرے اے ایس آئی نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"نواز صاحب! یہی استاد لنگڑ ہے۔ ڈیڑھ سال جیل کاٹ کر آیا ہے۔ وہاں جیل میں بڑا اودھم مچا رکھا تھا اس نے۔"

مجھے اپنے دوست سب انسپکٹر کی کہی ہوئی ساری باتیں یاد آ گئیں۔ اس کا مطلب تھا اس کی اطلاع درست تھی۔ میں نے اپنی نظریں استاد لنگڑ کے چہرے پر جما دیں۔ چوڑی پیشانی، تھوڑی سی پھولی ہوئی ناک جلتی ہوئی بادامی آنکھیں اور گھنی ڈاڑھی...... اچانک مجھے سب کچھ یاد آ گیا۔ میں نے استاد لنگڑ کو پہچان لیا۔ وہ واحدی تھا۔ وہی جسے میں نے جواء خانہ چلانے کے الزام میں پکڑا تھا اور جس کی بیوی نے بعد میں مجھے الٹی پٹی پڑھانے کی کوشش کی تھی۔ میں نے اس کے چہرے کی طرف انگلی اٹھائی۔ "تم واحد علی عرف واحدی ہو نا؟"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور نفرت سے زمین پر تھوک دیا۔ مجھے اس کے انداز پر بے پناہ طیش آیا۔ میں نے آگے بڑھ کر ایک زور کا تھپڑ اس کے منہ پر جمایا۔ اس کا اوپری ہونٹ پھٹ گیا اور خون بہہ نکلا۔ وہ چیخا۔

"مار لے...... مار لے مجھے۔ میں تیرے بس میں ہوں لیکن قسم خدا کی تجھے چھوڑوں گا نہیں۔ چھوٹی چھوٹی بوٹی کر دوں گا تیری اور چیل کوؤں کو کھلاؤں گا۔ اگر نہ کھلاؤں تو واحدی میرا نام نہیں۔"

وہ سخت تپا ہوا تھا۔ میں نے فالتو عملے کو باہر بھیج دیا اور اکیلے میں اس سے پوچھ گچھ شروع کی۔ میرے ساتھ صرف اے ایس آئی فرزند علی تھا۔ مجرم کے دونوں ہاتھ الٹی ہتھکڑی میں تھے اور وہ سٹول پر بیٹھا تھا۔

میں نے کہا۔ "ہاں اب ذرا کھل کر بتاؤ...... کیا بدمعاشی ہے یہ؟ کیوں آگ لگائی ہے؟"

وہ دانت پیس کر بولا۔ "اس کا جواب اپنے آپ سے پوچھ کتے۔"

میرا خون کھول اٹھا۔ کبھی کبھی تحمل سے کام لینا بڑا مشکل ہو جاتا ہے۔ میں نے صبر کا گھونٹ بھرا اور کہا۔

"کتے! تُو بھی ذرا اپنی زبان سنبھال اور اگر تیری پوشل پر کسی کا پیر آ گیا ہے تو اس کا نام بتا۔ کوئی تو وجہ ہو گی تیرے باؤلے ہونے کی......"

اس نے بے تحاشا گالیاں بکنا شروع کر دیں۔ میں نے اور اے ایس آئی نے بڑی

کوشش کی کہ وہ کسی طرح کچھ بتانے پر تیار ہو جائے لیکن ناکامی ہوئی۔ اس نے جیسے کچھ نہ بکنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ میں نے مجبوراً اسے حوالدار کے حوالے کر دیا۔ وہ اسے گھسیٹ کر حوالات میں لے گیا اور اچھی خاصی چھینٹی لگائی۔ وہ مار کھاتا رہا اور چلاتا رہا۔ اس کی ہٹ دھرمی میں کوئی فرق نہیں آیا۔

میں نے اپنے اے ایس آئی سے کہا۔ "اس کا نام تو واحدی ہے۔ میں نے خود اسے جواء چلانے کے الزام میں جیل بھجوایا تھا یہ استاد لنگڑ کیسے بن گیا؟"

اے ایس آئی نے کہا۔ "جیل میں اس نے ایک نمبردار قیدی سے جھگڑا کیا تھا۔ نمبردار قیدی نے لاٹھیاں مار مار کر اس کی ٹانگ توڑ دی۔ یہ سات آٹھ مہینے لنگڑا کر چلتا رہا۔ اسی وجہ سے اس کا نام استاد لنگڑ پڑ گیا۔ اب ٹانگ تو ٹھیک ہو گئی ہے مگر نام بگڑ چکا ہے۔"

میں نے کہا۔ "نام کے ساتھ ساتھ حرام زادہ خود بھی بگڑ چکا ہے۔ اچھا خاص بدمعاش ہو گیا ہے اب تو۔"

دوپہر کے بعد میں نے حوالات میں جا کر دیکھا۔ حوالدار نے اس کی ٹھیک ٹھاک مرمت کی تھی اور کچھ نہیں تو طوطے اور مرغیوں کے جلنے کا بدلہ تو لے ہی لیا تھا۔ مگر اس کی اکڑ فوں برقرار تھی۔ میں اس کے پاس بیٹھ گیا۔

"دیکھ واحدی! تُو نے کوئی چھوٹا موٹا جرم نہیں کیا۔ ایک سرکاری اہلکار کے گھر کو آگ لگائی ہے اور اسے قتل کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ یہ جرم تجھے پھانسی کے تختے پر بھی لے جا سکتا ہے لیکن مجھے لگتا ہے کہ تُو کسی زبردست غلط فہمی کا شکار ہے۔ کیا تجھے تیری عورت نے کچھ کہا ہے؟"

وہ خونی لہجے میں غرایا۔ "مت نام لے اپنی ناپاک زبان سے اس شریف عورت کا۔ تُو نے اس کی عزت پر ہاتھ نہیں ڈالا خود کو کتے کی موت مارا ہے، میں تیرا وہ حشر کروں گا......"

اس کی آواز بیٹھ گئی اور وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ ساتھ ساتھ وہ مجھے دھمکیاں بھی دے رہا تھا۔ اچانک ہی نہ جانے کیوں مجھے اس سفاک شخص پر بے پناہ ترس آیا۔ میرا اندازہ درست نکلا تھا۔ اسے اس کی عیار عورت نے ایک خطرناک چکر میں الجھا دیا تھا۔ وہ رو رہا تھا اور بیٹھی ہوئی آواز میں چیخ رہا تھا۔

"تُو نے میری بیوی کی بے بسی سے فائدہ اٹھایا۔ مجھے چھڑانے کے بدلے اسے بے آبرو کیا۔ تُو انسان نہیں شیطان ہے۔ تیرے جیسے درندے کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔ میں تجھے قبر میں پہنچا دوں گا۔"

میں جتنا بھی حیران ہوتا کم تھا۔ نہ جانے اس ففے کٹنی نے کیسے کیسے شوہر کے کان بھرے تھے۔ وہ آتش فشاں بنا ہوا تھا۔ شکر تھا کہ چیخ چیخ کر اس کا گلا پہلے ہی بیٹھ چکا تھا ورنہ اس کی پاٹ دار آواز میری بدنامی کا اشتہار پورے تھانے میں لگا دیتی۔ سنا تو بہت دفعہ تھا لیکن زندگی میں پہلی بار تجربہ ہوا کہ بُری عورت اگر بُرائی پر اُتر آئے تو کس قدر خطرناک ہوتی ہے۔
جب چیخ چیخ کر واحدی کی آواز بالکل ہی بیٹھ گئی اور وہ نڈھال ہو گیا تو میں نے حوالدار کو بلایا اور اسے کہا کہ ملزم کی الٹی ہتھکڑی کھول دے۔ حوالدار نے پہلے حیرت سے میری طرف دیکھا اور پھر ہدایت پر عمل کیا۔ ہتھکڑی کھول کر وہ باہر چلا گیا اور دروازہ بند کر دیا۔ میں نے واحدی سے کہا کہ وہ اٹھ کر کرسی پر بیٹھ جائے۔ وہ خاموشی سے بیٹھ گیا۔ میں نے کہا۔ ''اگر تمہارے دل میں کوئی حسرت ہے تو اب بھی نکال سکتے ہو۔ میں باندھ کر مارنے والا تھانیدار نہیں ہوں...... لیکن بہتر ہے کہ ہم بھلے مانسوں کی طرح بیٹھ کر بات کر لیں۔'' وہ خاموش رہا۔ کبھی تو لگتا تھا کہ ایک دم مجھ پر پل پڑے گا اور کبھی پُرسکون دکھائی دینے لگتا تھا۔ میں نے حوالدار سے دو سگریٹ منگوائے اور ایک سگریٹ سلگا کر اسے دیا۔ ''دیکھو واحدی!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تم نے جس طرح میرے گھر کو آگ لگائی ہے اور باہر نکلنے پر مجھے گولیوں سے بھوننے کی کوشش کی ہے، تم کسی بھی طرح رحم کے قابل نہیں ہو۔ تم پر سخت سے سخت کیس بن سکتا ہے، بلکہ اگر تم کسی ایسے ویسے تھانیدار کے ہتھے چڑھ جاتے تو وہ پولیس مقابلے کے بہانے تمہیں ٹھنڈا بھی کر سکتا تھا۔ کہنے سے میرا مطلب ہے کہ میں تمہیں خاصی رعایت دے رہا ہوں اور تم اس رعایت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرو۔'' واحدی کی نگاہوں میں ابھی تک الاؤ بھڑک رہے تھے۔ میں نے کش لے کر کہا۔
''سب سے پہلی بات تو یہ کہ میں نے تمہاری بیوی سے کوئی بدسلوکی نہیں کی اور تمہیں جس نے بھی یہ اطلاع دی ہے غلط ہے، بلکہ کہوں گا کہ تمہیں گمراہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ تمہاری باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ تمہیں اپنی بیوی سے بے حد محبت ہے، جس سے محبت ہو اس کے خلاف کوئی بات بھی کانوں کو سچی نہیں لگتی۔ اگر میں تمہاری بیوی کے بارے میں کچھ کہوں گا تو تم ہرگز یقین نہیں کرو گے۔ لہٰذا بہتر ہے کہ فی الحال اس بارے میں خاموش رہوں۔ تم پورے ڈیڑھ سال بعد جیل سے واپس آئے ہو۔ ہو سکتا ہے تمہیں بہت سے حالات کا علم نہ ہو۔ ایک دو دن ٹھہر جاؤ، میں ایسا ثبوت دوں گا کہ تمہاری آنکھیں کھل جائیں گی۔''
وہ ارنے بھینسے کی طرح مجھے گھور رہا تھا۔ نہایت خطرناک لہجے میں بولا۔ ''تم...... کہنا کیا چاہتے ہو؟''

میں نے کہا۔ ''کچھ نہیں...... صرف آپ جناب سے اتنی درخواست ہے کہ دو ڈھائی دن ذرا سکون سے حوالات میں تشریف رکھیں۔ میں تصویر کا دوسرا رخ آپ کے سامنے پیش کروں گا۔''
وہ میری بات کچھ سمجھا اور کچھ نہیں۔ اسے الجھن میں چھوڑ کر میں حوالات سے باہر آ گیا۔ میرا ذہن سوچوں کا اکھاڑہ بنا ہوا تھا۔ اگر واقعی اس عورت نے مجھ پر یہ الزام لگایا تھا تو میرے لئے یہ بے حد خطرناک بات تھی۔ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ جس دن واحدی کی بیوی دوسری دفعہ میرے پاس آئی تھی۔ میں اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ وہ اچھے کردار کی عورت نہیں۔ یہ بات درست تھی کہ اس کا خاوند پھنسا ہوا تھا اور یہ بھی صحیح تھا کہ وہ اسے کسی طرح چھڑانا چاہتی تھی مگر اس نے جو طریقہ اختیار کیا تھا وہ ثابت کرتا تھا کہ وہ بدقماش عورت ہے۔ مجھے آج بھی یقین ہے کہ خاوند کے بعد اس کے تعلقات کسی نہ کسی سے ضرور رہے ہوں گے۔ وہ ان عورتوں میں سے تھی جو اپنی جوانی کی ہر ہر رات کا حساب رکھتی ہیں۔ اچانک مجھے یاد آیا کہ قریبی چوکی کا ایک اے ایس آئی نوازش علی سیالکوٹ کا رہنے والا ہے اور اسی علاقے کا رہائشی ہے جہاں سے ڈیڑھ سال قبل واحدی کی گرفتاری عمل میں آئی تھی۔ میں نے شام کے وقت نوازش علی کو اپنے تھانے بلایا، میں چاہتا تھا کہ وہ واحدی کی بیوی کے متعلق کچھ تفتیش کرے۔ میں نے اس سے واحدی کا ذکر کیا تو وہ بُری طرح چونک گیا۔ کہنے لگا۔
''کہیں آپ مہتاب کے خاوند کا ذکر تو نہیں کر رہے جو دو ہفتے پہلے جیل سے چھوٹا ہے؟''
میں نے کہا۔ ''ہاں وہی جسے استاد لنگڑ بھی کہتے ہیں۔''
نوازش کے چہرے پر دبادبا جوش نظر آنے لگا۔ بولا۔ ''جناب! میرا اپنا بھی قیافہ ہے کہ وہ ٹھیک عورت نہیں ہے۔ شاید آپ کو سن کر حیرانی ہو کہ وہ ہماری ہی گلی میں دو تین گھر چھوڑ کر رہتی ہے۔ اس نے سری نگر سے اپنی کسی چاچی کو اپنے ساتھ رہنے کے لئے بلا رکھا ہے۔ یہ بھی ایک چنڈال سی بوڑھی عورت ہے۔ بوڑھی کا کوئی رشتے دار اکثر اس سے ملنے آیا کرتا ہے یہ ایک تیس بتیس سالہ شخص ہے۔ شاید شوکت نام ہے اس کا۔ ایک روز میں نے مہتاب کو اس شخص کے ساتھ سینما سے نکلتے دیکھا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اس لفنگے کے ساتھ مہتاب کا کوئی چکر ہے۔''
نوازش کی اطلاع نے مجھے خوش کر دیا۔ میں نے کہا۔ ''یار تُو نے میرے بڑے مطلب کی بات کی ہے۔ تُو ذرا سیالکوٹ جا کر اس معاملے کی سی آئی ڈی کر۔ میں چاہتا ہوں کہ کسی

طرح واحدی کو اس کی بیوی کا اصل چہرہ دکھایا جائے۔ وہ بڑی نیک پروین سمجھتا ہے اس کو...... چھٹی کی بات ہے تو چھٹی میں تجھے لے دیتا ہوں۔ ایک دو دن آرام بھی کر لینا۔''

وہ بولا۔ ''لیکن ایک بات ہے نواز صاحب۔ جب سے واحدی جیل سے چھوٹا ہے شوکا مجھے کم کم ہی نظر آیا ہے۔ ہوسکتا ہے واحدی کے جیل سے آنے کے بعد ان دونوں نے قطع تعلق کر لیا ہو۔''

میں نے کہا۔ ''اگر ایسا ہے بھی تو یہ تعلق پھر قائم ہوسکتا ہے۔ ایک دو روز میں یہ مشہوری ہو جائے گی کہ واحدی پھر پکڑا گیا ہے اور اس دفعہ اس پر لمبا ہی کیس پڑ گیا ہے۔ اس کے علاوہ میرا اے ایس آئی بھی سیالکوٹ جا کر واحدی کی بیوی سے سرسری پوچھ گچھ کرے گا۔ اگر واقعی اس عورت کا کسی سے یارانہ ہے تو واحدی کی گرفتاری کے بعد وہ بے فکر ہو جائے گی اور دوبارہ میل جول شروع کر دے گی۔ میں اسے رنگے ہاتھوں پکڑنا چاہتا ہوں۔''

نوازش میری بات سمجھ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''ٹھیک ہے جناب، میں کل ہی سیالکوٹ چلا جاتا ہوں اور اس معاملے کی ٹوہ لگاتا ہوں۔''

☆======☆======☆

یہ معاملہ طے ہو گیا تو میں نے اے ایس آئی فرزند علی کو دو سپاہیوں کے ساتھ سیالکوٹ بھیج دیا اور اسے کہا کہ وہ واحدی کی بیوی مہتاب سے پوچھ گچھ کرے۔ میں نے اے ایس آئی کو اصل بات نہیں بتائی اور اسے کہا کہ مجھے شک ہے ملزم نے پرانی عداوت کی وجہ سے مجھ پر حملہ کیا ہے۔

اے ایس آئی فرزند علی اسی روز سیالکوٹ چلا گیا۔ جب کہ نوازش علی نے اگلے روز بوریا بستر گول کیا...... فرزند علی کی واپسی دوسرے روز شام کو ہو گئی۔ اس نے مہتاب سے لمبی چوڑی گفتگو کی تھی۔ مختصر لفظوں میں اس نے بتایا۔

''وہ بظاہر شریف لیکن اندر سے چال باز عورت نظر آتی ہے۔ اپنی ایک رشتے دار بڑھیا کے ساتھ وہ نوری اسٹریٹ کے ایک کشادہ مکان میں رہتی ہے۔ یہ مکان واحدی کا ہے۔ واحدی سے اس کی شادی کوئی ڈھائی سال پہلے ہوئی تھی۔ یہ واحدی کی دوسری اور مہتاب کی بھی دوسری شادی ہے۔ مہتاب کا پہلا خاوند خودکشی کر کے مر گیا تھا۔ واحدی نے اپنی بیوی کو گھر سے نکال رکھا ہے۔ نہ پہلی بیوی سے اس کی کوئی اولاد تھی نہ اس سے ہے۔ مہتاب ایک فیشن پرست عورت ہے۔ اچھا کھانے اور اچھا پہننے کا شوق رکھتی ہے۔ اس کے رہن سہن سے صاف پتہ چلتا ہے کہ اس کے خرچے بہت زیادہ ہیں۔ اس کا پہلا خاوند ریلوے میں ملازم

تھا۔ آمدنی تھوڑی تھی۔ مہتاب کی شاہ خرچیوں نے اسے قرضے تلے دبا دیا تھا۔ ہوسکتا ہے اس کی خودکشی کی وجہ بھی یہی ہو۔ جہاں تک واحدی کا تعلق ہے، دوسری شادی سے پہلے وہ ٹھیک ٹھاک شریف آدمی تھا۔ مٹھائی کی دکان کرتا تھا اور پہلوانی کا بھی شوق رکھتا تھا۔ پھر مہتاب سے اس کی آنکھ لڑ گئی۔ یہ عورت روگ بن کر اس سے چمٹ گئی۔ واحدی آئے دن پہلی بیوی سے جھگڑنے لگا آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ اس نے بیوی کو طلاق دے دی۔ مہتاب سے شادی کے بعد وہ کچھ عرصہ تو ٹھیک رہا۔ پھر افیم کھانے لگا اور جواء بھی شروع کر دیا۔ کرتے کرتے اس نے اپنی دکان کے نیچے جواء خانہ کھول لیا اور منشیات کا دھندا کرنے لگا۔ واحدی کا چال چلن بگاڑنے اور اسے بدمعاش بنانے میں زیادہ ہاتھ اسی عورت کا ہے۔''

فرزند علی بڑی تفصیلی معلومات لے کر آیا تھا۔ میں نے اسے شاباش دی۔ میری شاباش وصول کرنے کے بعد اے ایس آئی خاموش سا ہو گیا۔ لگتا تھا مجھ سے کوئی بات چھپا رہا ہے۔ میں نے پوچھا تو کہنے لگا۔

''جناب! ایک گڑبڑ ہو گئی ہے۔''

''کیا؟'' میں نے زور دے کر پوچھا۔

اس نے کہا۔ ''جناب! وہ خبیث عورت...... آپ پر الزام لگا رہی ہے۔''

یکا یک میرے تمام خدشے حقیقت کا روپ دھار گئے۔ اس کا مطلب تھا وہ کھلم کھلا مقابلے پر آ گئی تھی۔

''کیا کہتی ہے وہ؟''

''جناب! بڑی بدزبان عورت ہے۔ اگر مجھے آپ کا ڈر نہ ہوتا تو کھال کھینچ لیتا اس کی۔ وہ کہتی ہے کہ آپ نے زبردستی کی ہے۔ جب آپ سیالکوٹ میں تھے وہ آپ کے پاس اپنے خاوند کی رہائی کی درخواست لے کر آئی تھی۔ آپ نے اسے ڈرا دھمکا کر کمرے میں بند کر دیا اور دو دن بعد چھوڑا۔''

میرے کان شائیں شائیں کرنے لگے۔ زندگی میں مجھے جس بات سے سب سے زیادہ خوف آتا تھا وہی ہو گئی تھی۔ مجھ پر عزت دری کا الزام لگایا جا رہا تھا اور کھلم کھلا لگایا جا رہا تھا۔ ایک ایسا شخص جس نے ہمیشہ دوسروں کو نصیحتیں کی تھیں آج خود گناہ گاروں کی صف میں کھڑا تھا۔ میرا خون کھول کر رہ گیا۔ جی چاہا کہ وہ عورت سامنے ہو تو گدی سے اس کی زبان کھینچ لوں۔ کتنا بڑا جھوٹ تھا یہ۔ کتنی بے باکی سے کتنا شرمناک الزام لگایا گیا تھا۔

میں نے خود پر قابو پا کر اے ایس آئی سے پوچھا۔ ''اور کیا کہتی ہے وہ؟''

اے ایس آئی نے کہا۔ ”جناب! وہ تو بہت بھڑکی ہوئی ہے۔ کہتی ہے میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر کے رہوں گی۔ میرے ساتھ جو ہونا تھا وہ ہو چکا...... اب جو...... آپ کے ساتھ ہوگا وہ دنیا دیکھے گی۔“

اے ایس آئی کا چہرہ بجھا ہوا تھا اور آنکھوں میں میرے لئے ہمدردی تھی۔ میں نے مزید تفصیلات پوچھنے کے بعد اسے باہر بھیج دیا۔ ذہن میں ایک ہی سوال گونج رہا تھا۔ ”اب مجھے کیا کرنا چاہئے؟“

ابھی اسی ادھیڑ بُن میں بیٹھا تھا کہ تھانے سے باہر جیپ کے رکنے کی آواز آئی۔ میں نے کمرے سے باہر آ کر دیکھا۔ ایک انسپکٹر صاحب دو ہیڈ کانسٹیبلوں کے ساتھ تشریف لا رہے تھے۔ انسپکٹر صاحب میرے لئے اجنبی تھے۔ میں نے انہیں سیلوٹ کیا۔ انہوں نے سر سے پاؤں تک مجھے گھورا۔

”نواز خان! تمہارا ہی نام ہے؟“ میں نے اقرار میں جواب دیا۔ انہوں نے بے رخی سے فرمایا۔ ”تمہیں شہر چلنا ہوگا، ایڈیشنل ہوم سیکرٹری صاحب نے تمہیں بلایا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”لیکن جناب! مجھے یہاں ایک دو کام تھے...... اگر اجازت ہو تو......“

وہ بات کاٹ کر بولے۔ ”کام شام چھوڑو۔ گاڑی میں بیٹھو اوپر سے آرڈر آیا ہے۔“

چار و ناچار میں نے چارج اے ایس آئی کو دیا اور انسپکٹر صاحب کے ساتھ جیپ میں جا بیٹھا۔ کوئی ایک گھنٹے بعد ہم سیالکوٹ پہنچے اور مختلف سڑکوں سے گزر کر ایک دفتر کے سامنے جا رکے۔ مجھے سیدھا ایڈیشنل سیکرٹری صاحب کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ کمرے کے باہر ہرگوش کمار اگروال کی نیم پلیٹ لگی تھی۔ اگروال صاحب تیس پینتیس سال کے تھے۔ پیشانی سے بال اُڑے ہوئے، ہونٹ تمباکو نوشی سے سیاہ، جسم تھوڑا سا موٹا، چہرے پر عینک۔ ایسا شخص جو دیکھنے میں ”باس“ قسم کی چیز نظر آتا ہے۔ انہوں نے بڑی سرد مہری سے مجھے سر سے پاؤں تک گھورا۔ پھر ایک کرسی پر بیٹھنے کا حکم صادر فرمایا۔ مجھے یہاں تک لانے والے انسپکٹر صاحب بھی ایک کرسی پر تشریف فرما ہو چکے تھے۔ کمرے میں گہری خاموشی طاری تھی۔ سیکرٹری صاحب نے ایک دو جگہ ٹیلی فون کئے پھر سگار سلگا کر ایک نگاہِ غلط انداز مجھ پر ڈالی اور انسپکٹر سے پوچھا۔

”ہاں...... یہی ہے وہ بندہ؟“

انسپکٹر نے ”جی سر“ کہا۔ اتنے میں اردلی نے ایک فائل لا کر سیکرٹری صاحب کے سامنے رکھ دی۔ میں نے اچٹتی سی نظر ڈالی۔ یہ میری ہی فائل تھی۔ جس میں میرے محکمانہ

کوائف وغیرہ درج تھے۔ کچھ دیر فائل کو دیکھنے کے بعد سیکرٹری صاحب نے چشمہ اتارا اور کہا۔

”ہاں بھئی، اب کیا ارادے ہیں تمہارے؟“

میں نے اطمینان سے کہا۔ ”جناب! کن ارادوں کے بارے میں آپ پوچھ رہے ہیں؟“

”اچھا...... سوال بھی اب تم ہی کرو گے۔“ انہوں نے زہر خند سے فرمایا۔ ”بڑی اکڑ ہے تمہاری گردن میں...... فکر نہ کرو ٹھیک ہو جائے گی۔ اتنی مار پڑے گی کہ سب کچھ ناک کے راستے بہہ جائے گا۔“

میں نے کہا۔ ”جناب! میرا قصور تو بتائیے۔“

جواب ملا۔ ”اچھا تو قصور بھی بتانا پڑے گا۔ تیری کوئی ماں بہن ہوتی تو میں بڑی تفصیل سے بتاتا تیرا قصور۔ اب کیا بتاؤں۔ ڈوب مر شرم سے اگر کوئی غیرت ہے تیرے اندر، خوب نام روشن کیا ہے محکمے کا۔“

میرے تن بدن میں آگ سی لگ رہی تھی۔ زندگی میں کبھی کسی کی ایسی باتیں نہیں سنی تھیں۔ جی چاہا اٹھ کر جھپٹ پڑوں اور سیکرٹری صاحب کی ٹائی پکڑ کر ایسا گھسیٹا ماروں کہ جناب اپنی توند سمیت اُڑ کر باہر جا گریں۔ بڑی مشکل سے یہ لہجہ برداشت کیا۔ سیکرٹری صاحب کچھ دیر میرے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھتے رہے۔ پھر انہوں نے نیا سگار سلگایا اور دو تین کش لینے کے بعد لہجہ بدل کر بولے۔

”نواز خان! میں لمبی چوڑی بات نہیں کروں گا اور نہ ہی میرے پاس وقت ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ ہر مجرم کی طرح تیرے پاس بھی اپنے جرم کی بڑی صفائیاں ہوں گی کہ جی ایسے نہیں ہوا تھا، ایسے ہوا تھا۔ تب نہیں ہوا تھا جب ہوا تھا۔ یہ سب فضول کی باتیں ہیں۔ سچ یہ ہے کہ تُو ایک مجبور عورت کی عزت سے کھیلا ہے۔ چاہئے تو یہ تھا کہ تجھے ابھی ہتھکڑی لگا کر مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا جاتا۔ بہر حال ہمیں بہت کچھ سوچنا پڑتا ہے۔ اس سے تیری ہی نہیں محکمے کی بھی ناک کٹتی ہے۔ تجھے تو شرم نہیں آئی لیکن ہمیں کچھ نہ کچھ حیا کرنی پڑے گی۔ میں نے تیرے ایس پی صاحب سے بھی بات کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ تجھے اس دفعہ...... کسی طرح سزا سے بچا لیا جائے۔ تیرا کیا خیال ہے؟“

میں نے کہا۔ ”جناب! آپ اپنی بات مکمل کریں۔ میں اپنا خیال بعد میں بتا دوں گا۔“

ایڈیشنل سیکرٹری صاحب کو میرا جواب پسند نہیں آیا تاہم انہوں نے سگار کا ایک کش

لے کر میری فائل میں چند ورق الٹے اور بولے۔ ''پہلی بات تو یہ ہے کہ مدعیہ کے شوہر کو فوراً چھوڑ دو۔ اس کے خلاف جتنے کیس بنائے ہیں تم نے، وہ بھی خارج کر دو۔ تھانے کا چارج اپنے ماتحت کو دے کر کچھ روز کے لئے اِدھر اُدھر ہو جاؤ لیکن ایک اہم بات اور ہے۔ جانے سے پہلے تمہیں مدعیہ سے زبانی اور تحریری معافی مانگنی ہوگی...... اس کے بعد کچھ سوچیں گے کہ تمہارے لئے کیا ہو سکتا ہے۔''

سیکرٹری صاحب کی بات ختم ہوئی تو میں نے کہا۔ ''جناب! جہاں تک اس عورت کے شوہر کو چھوڑنے اور کیس خارج کرنے کا تعلق ہے۔ میں کوئی کام قانون سے ہٹ کر نہیں کروں گا۔ ہاں...... اگر آپ میرا تبادلہ کرانا چاہتے ہیں تو کرا دیں۔ رہی معافی کی بات تو نہ میں نے قصور کیا ہے نہ معافی مانگوں گا۔''

میرے خود سر لہجے نے سیکرٹری صاحب کا پارہ ایک دم بلندیوں پر پہنچا دیا۔ انہوں نے چہرے کا رنگ بدلا اور شعلہ بار نگاہوں سے مجھے گھورنے لگے۔ ''مطلب کیا ہے تمہارا؟'' انہوں نے خطرناک لہجے میں پوچھا۔

''یہی کہ مجھ پر سراسر بہتان باندھا گیا ہے اور اگر آپ یہ معاملہ عدالت میں لے جانا چاہتے ہیں تو خوشی سے لے جا سکتے ہیں۔''

وہ گرجے۔ ''تجھے پتہ ہے تُو کیا کہہ رہا ہے اور اس کا کیا نتیجہ نکلے گا؟''

میں نے کہا۔ ''جب قصوروار نتیجے سے نہیں ڈر رہا تو بے قصور کیوں ڈرے۔''

''تو تم خیر سے بے قصور ہو؟''

''بے قصور ہی نہیں، سچا بھی ہوں اور سچ کبھی چھپ نہیں سکتا۔''

سیکرٹری صاحب آپے سے باہر ہو گئے۔ ان کے ہونٹ پھڑک رہے تھے۔ لگتا تھا ابھی دل کا دورہ پڑ جائے گا۔ چیخ کر بولے۔ ''حرام زادے! میں تجھے جیل میں سڑا دوں گا۔ تُو سمجھتا کیا ہے اپنے آپ کو۔'' پھر انسپکٹر سے مخاطب ہوئے۔ ''انسپکٹر! پیٹی اتار کر ہتھکڑی لگاؤ اس طرم خان کو۔''

انسپکٹر جو کسی حد تک میرا طرف دار نظر آتا تھا۔ گھبرا کر بولا۔ ''نواز خان! ذرا تمیز سے بات کرو۔ بڑے صاحب تمہاری بھلائی کی بات کر رہے ہیں اور تم نے جاہلوں والی دلیلیں شروع کر دی ہیں۔''

سیکرٹری صاحب مزید غرائے۔ ''انسپکٹر! میں کہتا ہوں ہتھکڑی لگاؤ اس کو۔ یہ لاتوں کا بھوت ہے باتوں سے نہیں مانے گا۔''

انسپکٹر نے کہا۔ ''سر، بیوقوف ہے، میں اسے سمجھاتا ہوں۔ ابھی سمجھ جائے گا۔''

سیکرٹری صاحب کچھ دیر طیش سے کانپتے رہے پھر بولے۔ ''تو لے جاؤ اسے باہر اور اچھی طرح کان کھول کر لاؤ اس کے۔''

انسپکٹر نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ ''چلو نواز خان۔ میرے ساتھ آؤ۔''

سیکرٹری صاحب نہ جانے انگریزی میں کیا کیا بڑبڑا رہے تھے۔ انسپکٹر مجھے لے کر باہر آ گیا۔ ایک کمرے میں بٹھا کر کہنے لگا۔

''میرا نام تجمل ہے۔ تمہارا پیٹی بھائی ہوں اس لئے دکھ ہو رہا ہے۔ میں نے تمہاری فائل دیکھی ہے۔ اچھے بھلے سیانے بندے ہو تم۔ اپنے دماغ کو استعمال کرنے کی کوشش کرو۔ ایسے ہٹ دھرمی دکھاؤ گے تو نوکری بھی جائے گی اور چمڑی بھی۔''

میں نے کہا۔ ''میں ایس پی صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''ایس پی صاحب اس وقت سرگودھا گئے ہوئے ہیں۔ مجھے ہی ایس پی سمجھ لو۔ جو کہنا ہے مجھ سے کہو۔''

''انسپکٹر! سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ واحدی کی بیوی نے سفید جھوٹ بولا ہے اور مجھ پر سراسر الزام لگایا گیا ہے۔ آپ ان لوفر عورتوں کو جانتے ہی ہیں، جب......''

''میں اچھی طرح جانتا ہوں۔'' انسپکٹر تجمل نے بات کاٹی۔ ''اسی لئے تم سے کہہ رہا ہوں کہ اس عورت کے شر سے بچنے کی کوشش کرو۔ عورت جب اپنی شرم حیا اتار دیتی ہے تو بڑے سے بڑے نیکوکار کو ننگا کر کے چوراہے میں کھڑا کر دیتی ہے۔ کل وہ میرے سامنے یہاں آئی تھی۔ سیکرٹری صاحب کے ساتھ اس کے خاندانی مراسم ہیں۔ وہ بہت زیادہ غصے میں تھی۔ بڑے قہر میں باتیں کر رہی تھی۔ کہتی تھی کچھ بھی ہو جائے۔ اب اس انسپکٹر کو دن میں تارے دکھا کر چھوڑوں گی اور بھی کئی لوگوں سے تعلقات ہیں اس کے۔ سیکرٹری صاحب نے تمہارے ایس پی کو ٹیلی فون کیا۔ پتہ نہیں ان کے درمیان کیا باتیں ہوتی رہیں۔ اس عورت نے بھی ایس پی صاحب سے باتیں کیں۔ اس کے بعد وہ چلی گئی۔ بعد میں سیکرٹری صاحب نے مجھے بلایا اور کہا کہ انہوں نے اس عورت کو بڑی مشکل سے رام کیا ہے ورنہ وہ تو سیدھی اخباری نامہ نگاروں کے پاس جا رہی تھی۔ سیکرٹری صاحب نے مجھ سے کہا کہ میں جاؤں اور پسرور سے تمہیں لے آؤں۔ تاکہ اس معاملے کو کسی طرح دبایا جا سکے...... اور اب تم ہو کہ آگ کو اور ہوا دے رہے ہو۔ میاں نواز، یہ بڑا نازک معاملہ ہے۔ بات بڑی دور تک نکل جائے گی۔''

میں نے اطمینان سے کہا۔ ''تجمل صاحب! اس کا مطلب ہے کہ ایک بدکردار عورت

جھوٹ بول کر کسی شریف آدمی کی عزت بھی اتار سکتی ہے۔ کم از کم میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ اگر مجھ پر یہ لڑائی تھوپ دی گئی ہے تو میں ضرور لڑوں گا۔"

انسپکٹر کچھ دیر گہری نظروں سے مجھے دیکھتا رہا۔ آخر بولا۔ "اچھا...... تم کل تک اچھی طرح سوچ سمجھ لو۔ ہوسکتا ہے تب تک تمہارے ایس پی صاحب بھی آ جائیں۔ میں سیکرٹری صاحب کو کہہ سن کر منا لیتا ہوں کہ تمہیں تھوڑی سی مہلت دے دیں۔"

میں خود بھی یہ مہلت چاہتا تھا۔ سوچنے کے لئے کچھ کرنے کے لئے۔ میں نے انسپکٹر سے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ آپ سیکرٹری سے بات کر لیں۔"

☆======☆======☆

میں ابھی واپس اپنے مضافاتی تھانے پہنچا ہی تھا کہ قریبی چوکی کا اے ایس آئی نوازش علی آدھمکا۔ میں نے اسے مہتاب کی ٹوہ پر لگا رکھا تھا۔ نوازش بڑا پُرجوش دکھائی دے رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا اسے کوئی خاص کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ وہ آتے ساتھ ہی کرسی گھسیٹ کر میرے سامنے بیٹھ گیا اور بولا۔

"نواز صاحب! ایک دھماکہ خیز خبر ہے۔"

"کیا؟"

"وہ شیطان کی چیلی پکڑی گئی ہے۔"

"کس کے ساتھ؟" میں نے بے ساختہ کہا۔

"ایک ایسے شخص کے ساتھ جس کے ساتھ آپ سوچ بھی نہیں سکتے۔"

میں نے کہا۔ "یار! تفصیل سے بتاؤ اور شروع سے تاکہ میرے پلّے کچھ پڑ سکے۔"

اس نے کہا۔ "جناب! تین دن سے میں نے مہتاب پر نگاہ رکھی تھی۔ ہمارے گھر سے اس کا گھر صاف نظر آتا ہے۔ چھت پر چڑھ جائیں تو ان کے صحن کا کچھ حصہ بھی دکھائی دینے لگتا ہے۔ میں نے سردی کے باوجود چھت پر ہی ڈیرہ ڈال رکھا تھا۔ مہتاب کے گھر آنے جانے والے ہر شخص پر میری نظر تھی۔ میرا خیال تھا کہ واحدی کی گرفتاری کی خبر سن کر مہتاب کا شناسا شوکا ضرور آئے گا اور میں کوئی کھوج خبر ڈھونڈ لوں گا۔ مگر شوکے نے شکل ہی نہیں دکھائی۔ میں بڑا مایوس تھا۔ کل سہ پہر میں نے دیکھا کہ ٹوپی والے دیسی برقعے میں ایک عورت مہتاب کے گھر سے نکلی ہے۔ پہلے تو میں یہی سمجھا کہ اس کی چاچی ہوگی۔ پھر اس کی چال نے مجھے شک میں ڈالا۔ میں اپنے گھر سے نکلا اور اس کا پیچھا شروع کر دیا۔ میں نے اس کی جوتی پہچان لی وہ مہتاب ہی تھی۔ بڑی سڑک پر پہنچ کر اس نے ایک سالم تانگہ لیا اور نئی

آبادی کی طرف چل دی۔ میں نے بھی ایک سالم تانگے میں اس کا پیچھا شروع کر دیا۔ آخر کار وہ ایک کوٹھی کے سامنے جا رکی۔ کرایہ دے کر وہ تیزی سے کوٹھی کے اندر چلی گئی۔ میں نے گیٹ پر نیم پلیٹ پڑھی یہ کسی ایڈیشنل سیکرٹری ہرگھوش کمار اگروال کی کوٹھی تھی۔ سامنے ہی ایک باغیچہ تھا۔ میں نے اس میں بیٹھ کر انتظار شروع کر دیا۔ مہتاب کوئی ڈھائی گھنٹے وہاں رہی۔ شام سات بجے سے لے کر تقریباً ساڑھے نو بجے تک۔ پھر ایک سفید کار گیٹ سے برآمد ہوئی۔ اس میں مہتاب پچھلی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ میرا اندازہ ہے کہ وہ گاڑی اسے ہمارے محلے سے کچھ فاصلے پر اتار گئی ہوگی کیونکہ جب میں گھر پہنچا تو مہتاب ابھی واپس آئی ہی تھی۔"

نوازش علی کی بات سن کر میرے ذہن میں اودھم سا مچ گیا۔ ہرگھوش اگروال کا نام ہتھوڑے کی طرح میرے سر پر برس رہا تھا۔ اب ساری بات سمجھ میں آ رہی تھی۔ اس عیار عورت نے اپنے حسن کا چارہ دکھا کر سیکرٹری صاحب کو پیچھے لگا لیا تھا اور اب سیکرٹری صاحب تن من دھن سے اس کی مدد پر تل گئے تھے...... واہ کیا چال تھی، کیا شکار تھا۔ پکی بات تھی کہ اس رات ہرگھوش کمار اگروال نے مہتاب کے ساتھ ٹھیک ٹھاک موج میلہ منایا تھا۔ وہ بدبخت شے ہی ایسی تھی۔ مجھے ڈیڑھ سال پہلے کا وہ منظر یاد آ گیا۔ جب اس نے میرا بیڑا غرق کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کا جسم دلکش تھا اور وہ اس جسم کے ایک ایک حصے کو ہتھیار کی طرح استعمال کرتی تھی۔ اسے معلوم تھا کس وقت کون سا ہتھیار استعمال کرنا ہے اور کون سا چھپانا ہے۔ میں آج تک خدا کا شکر کرتا ہوں کہ اس رات اس عورت کے جال سے بچ نکلا تھا۔ یقینی بات ہے کہ اگروال صاحب ایسا نہیں کر سکے تھے۔ انہوں نے اس کے بے شمار خطرناک ہتھیاروں کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے ہوں گے۔ اس جادوگرنی کی گود میں اپنا گنجا سر رکھ کر انہوں نے وعدہ کیا ہوگا کہ وہ میری ایسی کی تیسی کرنے میں اس کی پوری مدد کریں گے۔ مجھے وہ نفرت آج بھی یاد تھی جو میرے دھتکارنے کے بعد اس عورت کی آنکھوں میں نمودار ہوئی تھی۔ وہ ایسی نفرت تھی جو ایک لمحے میں پیدا ہوتی ہے مگر سالہا سال تک برقرار رہتی ہے۔ اب یہی نفرت ایک خوفناک الزام بن کر مجھ پر حملہ آور ہو چکی تھی۔

☆======☆======☆

میں نے جیسے تیسے رات کاٹی اور اگلے روز صبح سویرے پھر سیالکوٹ روانہ ہو گیا۔ میں نے ایس پی صاحب کی رہائش گاہ کا رخ کیا۔ میری خوش قسمتی کہ وہ گھر ہی مل گئے۔ تھوڑی ہی دیر پہلے وہ سرگودھا سے آئے تھے۔ بہت تھکے ہوئے تھے۔ سونے کے لئے لیٹے تھے لیکن میرا نام سن کر انہوں نے فوراً مجھے اندر بلا لیا۔ ان کا نام امیر حسین تھا۔ بڑے سخت لیکن بڑے اچھے

آدمی تھے۔ان کی آنکھوں میں میرے لئے ہمیشہ اپنائیت پائی جاتی تھی۔مگر آج یہ آنکھیں بھی کچھ بدلی سی تھیں۔

کسی تمہید کے بغیر کہنے لگے۔''نواز خان! جو کچھ ہوا ہے، بہت بُرا ہوا ہے۔ مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی۔''

میں نے کہا۔''سر! آپ بھی یہی بات کرر ہے ہیں۔ آپ تو مجھے مدت سے جانتے ہیں۔''

وہ بولے۔''کس کو جھوٹا سمجھا جائے اور کس کو سچا۔''

میں نے انہیں الف سے یے تک سارا واقعہ سنا دیا۔ یہ بھی بتا دیا کہ مدعیہ کے شوہر نے کتنی سفاکی سے مجھے قتل کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ بھی بتا دیا ہے کہ وہ ذلیل عورت اب اگروال صاحب کو پھنسانے کے بعد کیا کھیل کھیل رہی ہے۔

اگروال صاحب کے پھنسنے کا سن کر امیر حسین صاحب بہت حیران ہوئے۔ غصے سے بولے۔''تمہارے پاس کیا ثبوت ہے اس بات کا؟''

میں نے کہا۔''جناب! آپ جانتے ہیں میں نے کبھی کوئی بات بغیر ثبوت کے نہیں کی۔ اگر آپ چاہتے ہیں تو میں شام سے پہلے پہلے آپ کے سامنے ثبوت پیش کرسکتا ہوں۔''

وہ سوالیہ نظروں سے میرا چہرہ دیکھنے لگے۔ انہیں پتہ تھا اگر میں یہ کہہ رہا ہوں تو کر گزروں گا۔ کچھ دیر گہری سوچ میں ڈوبے رہنے کے بعد انہوں نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔

''نواز خان! تم بڑی غلط لائن پر جا رہے ہو۔ میں نہیں چاہتا کہ خواہ مخواہ کسی چکر میں مارے جاؤ۔ تم پر الزام لگا ہے تو اس کی صفائی پیش کرو۔ دوسروں پر کیچڑ اچھالنے سے تمہارے کپڑے صاف نہیں ہو جائیں گے۔ ایک بات یاد رکھو۔ رائی کا پہاڑ یوں ہی نہیں بنتا۔ رائی ہوتی ہے تو پہاڑ بنتا ہے۔ تھوڑا بہت قصور تمہارا ضرور ہوگا جو یہ بات نکلی ہے۔ بہرحال اب بہتر یہی ہے کہ اگروال صاحب کے کہنے پر عمل کرو۔ اس عورت سے معافی مانگ لو۔ معافی مانگنے سے کسی کا کچھ بگڑ نہیں جاتا۔''

میں نے کہا۔''سر! کس بات کی معافی مانگوں۔ اس بات کی کہ میں نے کسی کی عزت خراب نہیں کی اور بے حیائی میں کسی کا ساتھ نہیں دیا۔''

ایس پی صاحب نے کہا۔''دیکھو نواز خان! اگر میرے پاس آئے ہو تو میری بات بھی مانو۔ افسر سمجھ کر نہ سہی بڑا سمجھ کر سہی، تم اگروال کو نہیں جانتے۔ وہ بہت دور تک جا سکتا

ہے..... میرے کہنے پر تم معافی مانگ لو۔ جھک جانے میں بڑائی ہوتی ہے اور اکڑنے میں چھوٹا پن۔''

مجھے لگا ایک خبیث عورت اپنے ہزار ہاتھوں سے میرا گلا دبا رہی ہے اور مجھے ذلیل و خوار کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی ہے۔ پولیس میں بھرتی ہونے کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ میں اس قدر پریشان ہوا۔ پہلی بار مجھے اندازہ ہوا کہ اس محکمے میں رہ کر بندے کو کیسے کیسے عذابوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ ایس پی صاحب کی نصیحتیں سن کر میں ان کی کوٹھی سے باہر نکلا۔ طبیعت سخت پریشان تھی۔ سو طرح کے خیال ذہن میں آرہے تھے۔ پیدل ہی لاری اڈے کی طرف چل نکلا۔ کوئی دو تین فرلانگ آگے گیا تھا کہ ایک خوبصورت نسوانی آواز آئی۔

''سنیے'' مڑ کر دیکھا، نقاب والے کالے برقعے میں ایک لڑکی نما عورت پیچھے کھڑی تھی۔ وہ کافی گھبرائی ہوئی تھی۔ اس کے سفید نازک ہاتھ کانپ رہے تھے۔

''کیا بات ہے بی بی؟'' میں نے پوچھا۔

وہ گھبرائی ہوئی آواز میں بولی۔''میں مہتاب کی سہیلی ہوں جو واحدی کی بیوی ہے۔ مجھے پتہ چلا تھا کہ آج آپ ایس پی صاحب کے گھر آئیں گے۔ میں صبح سے یہاں آپ کا انتظار کر رہی تھی۔ مجھے پتہ ہے مہتاب جو کچھ کر رہی ہے۔ میں آپ کے فائدے کی ایک بات کرنا چاہتی ہوں۔''

''کیا بات ہے؟''

وہ بولی۔''یہاں نہیں کرسکتی۔ تھوڑی ہی دور میرا گھر ہے وہاں میری ماں کے علاوہ کوئی نہیں۔ آیئے وہاں چل کر بیٹھتے ہیں۔''

مجھے خیال آیا کہ یہ کوئی چال نہ ہو۔ وہ میری ہچکچاہٹ دیکھ کر بولی۔''آپ مجھے اپنی بہن سمجھ سکتے ہیں۔ خدا کی قسم، میں آپ کے بھلے کی بات کر رہی ہوں۔ آیئے میرے ساتھ۔''

کچھ دیر سوچنے کے بعد میں اس کے ساتھ چل دیا۔ ایک گراؤنڈ سے گزر کر ہم نے ایک نالے کا پُل پار کیا اور سرکاری ملازمین کے کوارٹروں میں آگئے۔ میں وردی میں نہیں تھا۔ اسی لئے کسی نے ہم دونوں پر کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ ایک کوارٹر کے سامنے پہنچ کر لڑکی نے خود ہی دروازہ کھولا اور ایک چھوٹے سے صحن سے گزار کر مجھے ایک کمرے میں لے آئی۔''بیٹھیے۔'' وہ آواز میں جلترنگ بجا کر بولی۔''میں امی کو بلاتی ہوں۔'' اس نے نقابِ الٹ دیا تھا۔ وہ بیس چوبیس سال کی کوئی پڑھی لکھی استانی نظر آتی تھی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ کسی دفتر میں ملازمت کرتی ہو۔ مجھے کمرے میں بٹھا کر وہ باہر نکل گئی۔ اچانک مجھے شک ہوا کہ وہ جاتے جاتے دروازہ

باہر سے بند کر گئی ہے۔ میں نے اٹھ کر دروازہ دیکھنا چاہا تو اچانک باہر سے رونے پیٹنے کی آوازیں آئیں۔ پھر ایک لرزہ خیز چیخ بلند ہوئی۔ میں نے دروازے کو دبایا۔ وہ باہر سے بند تھا۔ میں نے زور لگا کر دونوں تختوں میں درز پیدا کی اور باہر جھانکا۔ منظر ششدر کر دینے والا تھا۔ برآمدے میں ایک جوان عورت کھڑی چلا رہی تھی۔ اس کے جسم کے کئی حصے پھٹے ہوئے لباس میں سے جھانک رہے تھے۔ ڈیڑھ سال پرانی بات ہونے کے باوجود میں پہچان گیا۔ وہ مہتاب کے سوا اور کوئی نہیں تھی۔ وہ پکار رہی تھی۔

''بچاؤ...... بچاؤ۔ یہ غنڈہ مجھے قتل کر دے گا۔ بچاؤ'' میں نے تیورا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ میرے قدموں میں کوئی نو انچ لمبے پھل کا ایک چاقو پڑا تھا۔

میری ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ پلک جھپکتے میں سب کچھ سمجھ میں آ گیا۔ اس بدبخت عورت نے مجھے ذلیل و خوار کرنے کے لئے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا۔ وہ رو رہی تھی اور چلا رہی تھی۔ ''بچاؤ...... بچاؤ'' اب اس کی سہیلی بھی اس کا ساتھ دے رہی تھی۔ بیرونی دروازہ کھلا اور دو عورتیں بھاگتی ہوئی اندر پہنچ گئیں۔ ان کے پیچھے چند مردوں کے ہراساں چہرے نظر آئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے مکان کے صحن میں اچھا خاصا مجمع لگ گیا۔ ایک شخص نے اپنی گرم چادر مہتاب کے جسم پر ڈال دی وہ رو رو کر دہائی دینے لگی۔

''وہ مجھے مار ڈالے گا۔ اس کے پاس خنجر ہے۔ وہ دروازہ توڑ دے گا۔ پولیس کو بلاؤ۔ ہائے...... کوئی پولیس کو بلائے۔'' لوگ خوفزدہ نظروں سے بند دروازے کی طرف دیکھ رہے تھے جیسے کمرے میں کوئی بھوت بند ہے۔

''شاہ جی! نس کے آؤ'' ایک لمبے شخص نے بیرونی دروازے کی دہلیز پر کھڑے ہو کر ہانک لگائی۔ دو سنتری بھاگتے ہوئے اندر آ گئے۔ ایک کے کندھے پر رائفل تھی۔ ''کیا ہوا؟'' ایک سنتری نے مونچھوں کو بل دے کر پوچھا۔

مہتاب رو رو کر اپنی کہانی سنانے لگی۔ ''اس کا نام نواز خان ہے۔ پولیس میں کام کرتا ہے۔ بڑی : یر سے میرے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ میرے گھر والے کو اس نے جیل میں ڈال رکھا ہے۔ اب مجھے مارنے کے لئے یہاں آ گیا ہے۔''

مین کمرے کے اندر پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا کروں۔ بڑی ہوشیاری سے جال پھیلایا گیا تھا۔ میں کمرے میں بند تھا اور چاقو (خنجر) میرے قدموں میں پڑا تھا۔ مہتاب کا پھٹا ہوا لباس دیکھ کر اور اس کی آہ و پکار سن کر کوئی شخص بھی اندازہ لگا سکتا تھا کہ یہاں کیا ہوا ہے۔ پولیس والوں کے خلاف تو لوگ ویسے بھی فٹافٹ بھڑک اٹھتے ہیں۔ یہ

بھی نہیں سوچتے کہ پولیس کی وردی کے اندر کوئی شریف آدمی بھی ہو سکتا ہے...... پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔ مگر غصے میں ایسے مقولوں پر کون غور کرتا ہے۔ لوگوں کا غم و غصہ دم بدم بڑھتا جا رہا تھا۔ اب کوئی پندرہ بیس آدمی صحن میں جمع ہو چکے تھے۔ ان میں دونوں سنتری بھی شامل تھے۔ ایک سنتری کے ہاتھ میں پکی رائفل صاف نظر آ رہی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ یہ سنتری بھی اس سازش کا حصہ ہیں ورنہ موقع پڑنے پر ایسی صورتیں کہاں نظر آتی ہیں۔ ان لوگوں کو اس وقت آنا ہوتا ہے جب مجرم واردات کے بعد گھروں کو پہنچ چکے ہوتے ہیں۔ غالباً یہ لوگ مجھے رنگے ہاتھوں پکڑنے کے لئے کہیں قریب ہی موجود تھے۔ اس سے ایک اور بات بھی ثابت ہوتی تھی، یہ خوفناک سازش مہتاب کی نہیں بلکہ کسی بااختیار شخص کی تیار کردہ تھی۔ وہ بااختیار شخص ایڈیشنل سیکرٹری اگروال کے سوا اور کون ہو سکتا تھا۔ صورتِ حال کی اصل سنگینی کھل کر سامنے آ رہی تھی۔ کمرے میں ایک دروازے کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔ میں چوہے دان میں پھنسا ہوا تھا اور باہر بپھرے ہوئے لوگ تھے۔ ابھی تو ان کی تعداد زیادہ نہیں تھی مگر تھوڑی دیر بعد یہاں زبردست ہجوم ہونے والا تھا۔ اگر مجھے کچھ کرنا تھا تو فوراً کرنا تھا۔ وقت میرے خلاف جا رہا تھا۔ سخت سردی میں میری پیشانی پسینے سے تر ہو گئی۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں خوفزدہ تھا مگر کوئی ذلت اٹھانے سے مرجانا میرے نزدیک بہتر تھا۔ میں نے فوری فیصلہ کیا، نیچے جھک کر اپنی چپل کے تسمے اچھی طرح باندھے۔ سیاہ دستے والا خنجر اٹھا کر اپنے ہاتھ میں لیا اور دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ دروازے کے باہر گالیاں گونج رہی تھیں اور تین چار لاٹھی بردار آدمی سنتریوں کے ساتھ دروازے کے بالکل پاس آ گئے تھے۔ ایک پہلوان نما شخص نے جی داری سے کہا۔

''سوچتے کیا ہو سنتری جی۔ دروازہ کھولو۔ دیکھ لیتے ہیں کتنا سورما ہے۔''

ایک دوسرے شخص نے جس کے ہونٹ پان میں رنگے ہوئے تھے۔ صحن میں پڑا ہوا چارہ کاٹنے والا ٹوکا اٹھا لیا اور تڑخ کر بولا۔

''کھولو جی بوہا۔ اسی جگہ ٹوٹے نہ کر دوں تو نام نہیں میرا۔'' پھر وہ جوش کھا کر خود ہی آگے بڑھا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا دروازے پر آ گیا۔ میں خود بھی یہی چاہتا تھا کہ یہ کام اب زیادہ لیٹ نہ ہو۔ اس شخص نے ایک جھٹکے سے کنڈی ہٹائی اور دروازے کو زور سے دھکا دیا۔

''نکل اوئے باہر تیری......'' ابھی الفاظ اس کے منہ میں تھے کہ میری زوردار ٹانگ اس کے سینے پر پڑی۔ وہ اچھل کر رائفل بردار سنتری پر گرا۔ میں تیزی سے باہر نکلا۔ پہلوان نما

شخص نے لاٹھی گھما کر پورے زور سے میرے سر پر مارنا چاہی میں پہلے سے تیار تھا جھک کر یہ طوفانی وار بچایا اور بیرونی دروازے کی طرف بھاگا۔ ایک دوسرا شخص پہلو سے جھپٹا، میں نے خنجر کو خوفناک انداز میں حرکت دی۔ وہ ٹھٹک کر رکا۔ یہ لمحے غنیمت کے تھے۔ میں گولی کی رفتار سے بیرونی دروازے کی طرف بھاگا۔ دروازے پر ایک ہٹا کٹا شخص کھڑا تھا مگر جسم کے مقابلے میں اس کا دل بہت چھوٹا تھا۔ میرے ہاتھ میں خنجر اور چہرے پر غضب دیکھ کر وہ کوشش کے باوجود اپنی جگہ کھڑا نہ رہ سکا۔ پہلے ذرا سا آگے پیچھے ہوا پھر شاندار پھرتی سے پیچھے ہٹ کر اس نے میرے لئے راستہ چھوڑ دیا۔

''پکڑو...... پکڑو۔'' میرے پیچھے چیخ و پکار گونجی۔ ایک فائر بھی ہوا لیکن بہت دیر سے، اس وقت میں گلی کا موڑ مڑ چکا تھا اور پختہ سڑک سامنے ہی نظر آ رہی تھی۔ میرے دونوں طرف لوگ ہکا بکا کھڑے تھے۔ پکی سڑک پر پہنچتے ہی میں ایک موٹر رکشہ کے آگے کھڑا ہو گیا۔ مجھے دیکھ کر دبلے پتلے سکھ رکشہ ڈرائیور کا رنگ سفید ہو گیا اس وقت مجھے پتہ چلا کہ خنجر ابھی تک میرے ہاتھ میں ہے۔ میں نے خنجر کوٹ کی جیب میں رکھا اور رکشے میں بیٹھ گیا۔

''جلدی چل اوئے کُکڑ۔'' میں نے غرا کر کہا۔ ڈرائیور نے گیئر لگایا اور ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گیا۔

مختلف سڑکوں پر رکشہ گھمانے کے بعد میں ایک بار پھر ایس پی صاحب کی کوٹھی پہنچ گیا۔ دروازے پر بیل دی تو نوکر نے مجھے اندر بٹھایا۔ کچھ دیر بعد ایس پی صاحب بھی آ گئے۔ وہ شب خوابی کا لباس پہنے ہوئے تھے۔

''تم پھر آ گئے۔'' انہوں نے قدرے بےزاری سے کہا۔

میں نے اٹھ کر سلوٹ کیا اور کہا۔ ''سر! بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے میرے ساتھ۔'' وہ سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگے۔ میں نے کہا۔ ''سر، سیکرٹری صاحب غلط ہتھکنڈوں پر آ گئے ہیں۔ ابھی کچھ دیر پہلے میں آپ سے مل کر لاری اڈے کی طرف جا رہا تھا کہ ایک برقع پوش لڑکی ملی۔ بڑی گھبرائی ہوئی تھی۔ کہنے لگی میں مہتاب کی جاننے والی ہوں۔ آپ مجھے اپنی بہن کہہ سکتے ہیں۔ آپ کے فائدے کی بات کرنا چاہتی ہوں، مجبور کر کے وہ مجھے گھر لے گئی۔ ابھی میں اندر پہنچا ہی تھا کہ کسی کمرے سے مہتاب نکل آئی اور صحن میں کھڑی ہو کر چیخ و پکار کرنے لگی۔ میں نے جلدی سے صحن میں آنا چاہا تو پتہ چلا کمرے کا دروازہ باہر سے بند ہے۔''

میں نے پورا واقعہ تفصیل سے ایس پی صاحب کے گوش گزار کیا۔ وہ سخت پریشانی کے عالم میں سنتے رہے۔ ان کی کشادہ پیشانی پر فکر کی لکیریں تھیں۔ میں خاموش ہوا تو کہنے لگے۔

''نواز خان! تُو غلط محکمے میں آ گیا ہے۔ مجھے نہیں لگتا کہ تُو پولیس میں چل سکے گا۔ تجھے اپنا آپ بدلنا ہو گا یا نوکری بدلنی ہو گی۔ میں نے تجھے سمجھایا تھا کہ وقت پڑنے پر لوگ گدھے کو بھی باپ بنا لیتے ہیں۔ تُو اس عورت سے معذرت کر لے تو تیرا کچھ بگڑ نہیں جائے گا۔ بات جہاں ہے وہیں دب جائے گی...... پر تیرے دماغ میں کچھ اور ہی خناس سمایا ہوا ہے۔ تُو کیا سمجھتا ہے اگروال کو نیچا دکھا سکے گا۔ بھول ہے تیری۔ وہ تیرے جیسوں کو جیب میں لئے پھرتا ہے۔ اب بھی وقت ہے میری بات مان لے...... کوئی بندہ زخمی تو نہیں ہوا تیرے ہاتھوں۔''

میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ وہ بولے۔ ''اگر تُو کہے تو میں اگروال سے رابطہ کرتا ہوں۔ وہ معاملے کو سنبھال لے گا۔''

میں نے کہا۔ ''سر! مجھے سوچنے کے لئے تھوڑا سا وقت چاہئے۔''

ایس پی صاحب سگریٹ کا دھواں فضا میں چھوڑ کر گہری نظروں سے میری طرف دیکھتے رہے۔ کچھ دیر بعد بولے۔ ''تُو بڑا ڈھیٹ ہے نواز خان۔ میں سمجھ رہا ہوں تیری بات۔ تیرے جیسے نوجوان کی یہی مصیبت ہوتی ہے۔ کسی کے تجربے سے فائدہ نہیں اٹھاتے۔ ہر تجربہ خود کرتے ہیں چاہے پھانسی ہو جائے تجربے تجربے میں۔ ٹھیک ہے بھائی کرو تجربے...... اب میرے لائق کیا خدمت ہے؟''

میں نے کہا۔ ''سر! شرمندہ نہ کریں۔ میں تو آپ کو سب کچھ صاف صاف بتا چکا ہوں۔''

انہوں نے اوپر تلے چند اور کش لئے۔ ''دیکھو نواز خان! میں نہیں مانتا کہ ابھی جو کچھ ہوا ہے اس کے پیچھے اگروال کا ہاتھ ہے اور اگر ایسا ہے تو پھر تجھے گرفتاری کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ میرا خیال ہے اب تک چھاپہ مار پارٹی تیرے گاؤں کی طرف روانہ ہو چکی ہو گی...... کیا نام ہے تیرے تھانے کا؟'' میں نے تھانے کا نام بتایا۔ انہوں نے پوچھا۔ ''مہتاب کا شوہر کہاں ہے؟''

میں نے کہا۔ ''وہ جوڈیشنل ریمانڈ پر جیل میں ہے۔''

وہ ایک بار پھر گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ بولے۔ ''کیس تو تم پر صاف بن رہا ہے۔ مدعیہ سے تمہاری پرانی رنجش ثابت ہوتی ہے۔ جیوری کے ذہن میں آ سکتا ہے کہ مدعیہ کے شوہر نے جیل سے چھوٹنے کے بعد تم سے بازپُرس کی تو تم نے طیش میں آ کر مدعیہ کو ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کی سہیلی کے گھر سے گواہوں کی موجودگی میں تمہارا فرار ہونا تمہاری پوزیشن کو اور بھی کمزور کرتا ہے۔ بہرحال۔''

کچھ دیر غور کرنے کے بعد ایس پی صاحب نے اپنے کسی ملازم مجید کو آواز دی۔ وہ آ گیا تو ایس پی صاحب نے کہا۔ ''مجید! نواز خان کو لے جا اور شریف کالونی والے مکان میں چھوڑ آ۔ یہ لے مکان کی چابی۔'' انہوں نے ایک چابی ملازم کو دی اور مجھ سے مخاطب ہو کر بولے۔ ''تم اس کے ساتھ چلے جاؤ۔ کہیں اِدھر اُدھر جانے کی کوشش نہ کرنا۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ تمہاری ضمانت قبل از گرفتاری ہو جائے۔ وہاں ٹیلی فون موجود ہے۔ اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے رِنگ کر لینا۔ مگر اپنا نام وغیرہ نہیں بتانا۔ میری بات سمجھ رہے ہونا۔'' میں نے اثبات میں جواب دیا اور سیلوٹ کر کے ملازم مجید کے ساتھ باہر آ گیا۔

☆======☆======☆

یہ کوئی ایک کینال کا خوبصورت بنگلہ تھا۔ کارنر پلاٹ تھا۔ بڑی اچھی لوکیشن تھی۔ سامنے ایک وسیع و عریض گراؤنڈ تھا جہاں سارا دن ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کے بچے کھیلتے رہتے تھے مگر مجھے یہ سارے نظارے ایک آنکھ نہیں بھا رہے تھے۔ کل تک جو شخص قانون کا محافظ بن کر مجرموں کو پکڑ رہا تھا آج خود ایک مجرم کی طرح چھپا ہوا تھا۔ ایک بدذات عورت نے چند ہفتوں میں کیا سے کیا کر دیا تھا۔ ایس پی صاحب نے اب تک صرف ایک بار فون کیا تھا اور کہا تھا کہ تسلی رکھو میں کوشش کر رہا ہوں۔ تیسرے روز کی بات ہے۔ صبح سویرے مجید کسی عورت کو لے آیا۔ اس نے عورت کو ساتھ والے کمرے میں بٹھایا اور مجھ سے کہنے لگا۔

''نواز صاحب! آپ کی والدہ ملنے آئی ہیں۔''

میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ جی چاہا بھاگ نکلوں۔ بے قصور ہونے کے باوجود میں خود کو قصور وار محسوس کر رہا تھا۔ ''وہ یہاں کیسے پہنچی؟'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

مجید نے بتایا۔ ''انہیں کسی نے بتایا تھا کہ آپ لائن حاضر ہو گئے ہیں۔''

یہ میرے سر پر دوسرا دھماکہ تھا۔ گویا میں لائن حاضر بھی ہو چکا تھا۔ غم و غصے کی ایک شدید لہر میرے تن بدن کو جھنجھوڑ گئی۔ مجید نے کہا۔ ''آپ کی والدہ آپ کو تلاش کرتی ہوئی پہلے پسرور گئیں پھر یہاں ایس پی صاحب کے پاس پہنچیں۔ رو رو کر ان کا بُرا حال ہو رہا تھا۔ بہت غصے میں تھیں کہہ رہی تھیں۔ اسے میرے سامنے لاؤ، میں اپنے ہاتھ سے اس کا گلا گھونٹ دوں گی۔ ایس پی صاحب نے سمجھایا بجھایا تو غصہ کچھ ٹھنڈا ہوا۔ رات وہ اُدھر کوٹھی میں ہی رہیں۔ اب آپ سے ملانے لایا ہوں۔''

میں کتنی ہی دیر اس جگہ کھڑا سوچتا رہا۔ پھر اپنی بے گناہی نے حوصلہ دیا اور میں دوسرے کمرے میں ماں کے پاس پہنچ گیا۔ ماں کے بارے میں کیا لکھوں۔ ہر بیٹے کو ماں اچھی لگتی

ہے۔ یہ ایسا رشتہ ہے جس کی تعریف میں ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں نے کروڑہا الفاظ لکھے ہیں اور لکھتے رہیں گے۔ میں صرف اتنا کہوں گا کہ میری ماں میری زندگی کی قیمتی ترین متاع تھی۔ وہ آنکھوں میں آنسو بھرے میرے سامنے کھڑی تھی۔ اس نے ٹٹولنے والی نظروں سے مجھے دیکھا۔ یہ نظریں میرے جسم کے آر پار گزر گئیں۔ اس نے آگے بڑھ کر میرا ہاتھ تھاما اور اپنے سفید سر پر رکھ لیا۔

''نواز، سچ سچ بتا تُو نے کچھ کیا ہے؟''

میں نے اپنا ہاتھ ماں کے سر پر ڈھیلا چھوڑ دیا۔ سر اٹھا کر فخر سے ماں کی آنکھوں میں دیکھا اور پورے اعتماد سے جواب دیا ''نہیں ماں۔''

ماں نے آنکھیں بند کیں اور اس کے رخساروں پر آنسوؤں کی دھاریں بہہ نکلیں۔ اس نے مجھے گلے سے لگا لیا اور میری چھاتی چومنے لگی۔ ''مجھے یقین تھا میرے پُتر...... مجھے یقین تھا۔'' اس نے رُندھی ہوئی آواز میں کہا۔

ماں کوئی ایک گھنٹہ میرے ساتھ رہی۔ میں نے اسے تسلی تشفی دی اور پوری طرح مطمئن کر کے واپس بھیجا۔ میں نے کہا۔ ''ماں! تیرا بیٹا سچا ہے اور تیری دعائیں اس کے ساتھ ہیں۔ ہرگوش اگروال تو کیا ساری خدائی بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ تُو بے فکر ہو کر گھر جا۔ میں ان شاء اللہ جلد ہی سرخرو ہو کر آؤں گا۔''

ماں چلی گئی۔ مجھے پوری امید تھی کہ میری ضمانت قبل از گرفتاری ہو جائے گی۔ مگر یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ اسی شام ایس پی صاحب کا ملازم خاص شاہنواز کرمانی (یہ شخص بعد میں صوبائی اسمبلی کا رکن اور پھر وزیر بھی بنا) ایک وکیل کے ساتھ کوٹھی پہنچا اور اس نے ایس پی صاحب کی ترجمانی کرتے ہوئے بتایا کہ مجھے گرفتاری دینا ہی پڑے گی۔ معاملہ اوپر تک پہنچ گیا ہے۔ اس نے مجھے پریشان دیکھ کر کہا۔ ''ایس پی صاحب نے عبدالقدوس صاحب کو وکیل مقرر کیا ہے۔ یہ یہاں کے گنے چنے مسلمان وکیلوں میں سے ہیں۔ جلد ہی تمہاری ضمانت کرا لیں گے۔''

اس کے بعد اس نے وکیل صاحب سے میرا تعارف کرایا۔ وکیل عبدالقدوس اپنے کام کے خاصے ماہر تھے۔ انہوں نے میرا حوصلہ بڑھانے میں کافی مدد کی۔ انہوں نے مجھے سمجھایا کہ میں خود تھانے پہنچ کر گرفتاری دوں اور اپنے بیان میں لکھواؤں کہ ایک شخص جو خود کو مہتاب کا پرانا عاشق بتاتا ہے میرے پیچھے لگ گیا تھا اور میں اس کے خوف سے چھپا ہوا تھا۔ آج موقع ملتے ہی پیش ہو گیا ہوں۔ قدوس صاحب کی ہدایت کے مطابق مجھے یہ بھی کہنا تھا کہ

مہتاب کا وہ عاشق ان لوگوں میں موجود تھا جنہوں نے مہتاب کی سہیلی کے گھر بند کمرے کے سامنے مجھے گھیر رکھا تھا اور مجھے اندیشہ ہے کہ یہ ساری چال اسی شخص کی تھی۔

وکیل صاحب کا مطلب یہ تھا کہ اس سارے فسانے میں سیکرٹری صاحب کی کارستانی مہتاب کے کسی نامعلوم عاشق کے سر تھوپ دی جائے۔ قانونی چکروں میں یہ سب کچھ کرنا ہی پڑتا ہے۔ میں اپنی مختصر سروس میں ایسے بہت سے جھمیلوں سے گزر چکا تھا۔ بہرحال سب کچھ وکیل صاحب کی ہدایت کے مطابق ہوا۔ اسی روز رات کوئی دس بجے میں نے مقامی تھانے میں پیش ہو کر گرفتاری دے دی۔ لطف کی بات یہ ہوئی کہ مجھے گرفتار کرنے والا انسپکٹر تجمل حسین تھا۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں یہ شخص میرے لئے ہمدردی کے جذبات رکھتا تھا۔ اس نے سات روزہ ریمانڈ کے دوران میرے ساتھ کوئی توہین آمیز سلوک نہیں کیا۔ ایک روز میرے پاس حوالات میں آیا اور کہنے لگا۔

''یار! یہ پٹی باندھ لے اپنے بازو پر جلدی جلدی۔'' اس کے ہاتھ پر سفید ڈاکٹری پٹی تھی اور لکڑی کے کچھ ملبے کے ٹکڑے تھے۔ میں نے حیرانی سے کہا۔ ''یہ کیا ہے؟'' اس نے کہا۔ ''اوپر سے بڑا پریشر تھا تمہارے گٹے گوڈے سینکنے کا۔ کل بھی سیکرٹری صاحب کا فون آیا تھا۔ میں نے کہا بہت مارا ہے، بازو ٹوٹ گیا ہے اس کا گر کر...... اب سمجھ رہا ہے نا بات؟ بازو تیرا ٹھیک ٹھاک ہے اور سیکرٹری صاحب کہیں اِدھر نکل آئیں تو میرے دونوں بازو توڑ دیں گے۔ چل جلدی کر باندھ پٹی۔ میں نے ایکسرے کا انتظام بھی کر لیا ہے۔'' ایک لفافے سے ایکسرے نکال کر اس نے میرے سامنے رکھ دیا۔ پتہ نہیں کس کا ایکسرے تھا۔ چار و ناچار مجھے اپنے اچھے بھلے بازو پر پٹی بندھوانی پڑی۔

قدرت خدا کی اس روز شام کے وقت سیکرٹری صاحب مقامی ڈی ایس پی کے ساتھ ایک بڑی کار پر تھانے تشریف لے آئے۔ انہوں نے بڑی خونی نظروں سے میرا معائنہ کیا۔ حوالات میں میرے اور اگروال کے درمیان جو گفتگو ہوئی اس کی تفصیل پڑھنے والوں کے لئے طوالت کا باعث بنے گی۔ مختصراً یوں سمجھ لیں کہ وہ بڑا خبیث افسر تھا۔ ایسے لوگ اپنے شکار کو جال میں تڑپتے مچلتے دیکھ کر روحانی خوشی محسوس کرتے ہیں۔ اس نے ہر قانون قاعدے کو پسِ پشت ڈال کر بے دردی سے میری پسلیوں میں ٹھوکریں بھی ماریں اور گالیاں دیں۔ جاتے جاتے گرج کر بولا۔ ''تیرے جیسے عقل کے اندھے مُسلوں کو ٹھیک کرنا مجھے اچھی طرح آتا ہے۔ تُو نے ناک سے لکیریں نہ نکالیں تو میرا نام اگروال نہیں۔ قہر بھگوان کا ایک شریف شادی شدہ عورت کو برباد کر کے رکھ دیا اور جب اس نے فریاد کی تو چھرا لے کر آ چڑھا اس پر۔

میں تو تجھے ایسا سبق دوں گا تیری سات پشتیں یاد رکھیں گی۔'' میں خاموشی سے سب کچھ سنتا رہا۔ اس کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتا تھا۔ اگروال کی باتیں سن کر یوں لگتا تھا کہ جیسے کوئی پنڈت خدا خوفی اور پرہیزگاری پر بھاشن دے رہا ہو حالانکہ اس پنڈت کا اپنا حال خدا ہی بہتر جانتا تھا۔ جو شخص مہتاب جیسی عورت کے ساتھ ڈھائی گھنٹے تنہائی میں گزار سکتا تھا اس کے کردار کی کوئی ضمانت نہیں تھی۔ ابھی ایس پی صاحب، وکیل صاحب اور میرے سوا کسی کو معلوم نہیں تھا کہ سیکرٹری صاحب کے تعلقات مہتاب سے قائم ہیں اور یہی وجہ تھی کہ وہ بڑھ چڑھ کر باتیں کر رہا تھا۔

کوئی ڈیڑھ ہفتے بعد عدالت نے میری درخواست ضمانت منظور کر لی۔ میں رہا ہو کر واپس سیالکوٹ آ گیا۔ سر پر ایک بھاری بوجھ تھا اور بے گناہی کے باوجود چہرے پر گناہ کی چھاپ لگی ہوئی تھی۔ وہ دن میرے لئے بہت اذیت ناک تھے۔ کچھ سوجھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ جب تک میری بے گناہی ثابت نہیں ہوتی گھر جاؤں گا نہ گھر والوں کو چہرہ دکھاؤں گا۔ میں وہیں سیالکوٹ میں ایک دوست کے ہاں مقیم ہو گیا۔ ایس پی صاحب کے ساتھ میرا رابطہ صرف ٹیلی فون پر تھا۔ وہ در پردہ ہر طرح میری مدد کر رہے تھے لیکن ان کی بھی کچھ مجبوریاں تھیں اور میں ان مجبوریوں کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ سیشن کورٹ میں میرے کیس کی سماعت شروع ہو گئی۔ میرے وکیل قدوس صاحب کی خواہش تھی کہ کسی ٹھوس ثبوت کے بغیر اگروال صاحب کو اس معاملے میں ہرگز نہ گھسیٹا جائے ورنہ سخت مشکل پیش آئے گی اور ٹھوس ثبوت ہمارے پاس کوئی تھا نہیں۔ ایک اے ایس آئی کے سوا کوئی اس بات کا گواہ نہیں تھا کہ واحدی کی بیوی نے اگروال کے گھر تنہائی میں کچھ وقت گزارا ہے اور وہ دونوں ایک دوسرے کے منظورِ نظر ہیں۔ یہ اے ایس آئی بیچارا کسی صورت اگروال صاحب کے خلاف گواہی دینے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا اور اگر وہ ایسا کرتا بھی تو ایک گواہی کی کیا اہمیت تھی۔ ایسے معاملات میں زیادہ گواہوں کی ضرورت ہوتی ہے اور ناجائز تعلقات ثابت کرنے کے لئے ایسی شہادتیں درکار ہوتی ہیں جن کا ذکر ان صفحات میں کرنا ممکن نہیں۔ ایک بات طے تھی کہ جب تک یہ ثابت نہیں ہوگا کہ اگروال اس کیس میں پارٹی ہیں میری پوزیشن کمزور سے کمزور تر ہوتی جائے گی۔

☆======☆======☆

وہ ایک ٹھٹھرتی ہوئی رات تھی۔ میں نے بگلہ مارکہ سگریٹ کے دو طویل کش لئے اور اپنی بڑھی ہوئی ڈاڑھی کھجا کر دیوار سے ٹیک لگا دی۔ یہ میرے شناسا چندر سنگھ کا گھر تھا۔ چندر

سنگھ میرے ساتھ پولیس ٹریننگ کے لئے بھرتی ہوا تھا۔ مگر ایک ہی ماہ بعد اسے ٹریننگ چھوڑنا پڑ گئی تھی۔ وہ آج کل اپنے مرحوم پتا کی جگہ کھیلوں کا سامان فروخت کرتا تھا۔ وہ میرے لئے بڑی بھاگ دوڑ کر رہا تھا۔ رات آٹھ بجے تک چندر کی بیوی نے مجھے چار پانچ مرتبہ چائے پلائی۔ ان دنوں میں بہت چائے پینے لگا تھا۔ وہ چائے پلاتی رہی اور میں پیتا رہا۔ وہ بھی جاگ رہی تھی اور میں بھی۔ ہمیں چندر کا انتظار تھا۔

چندر کوئی سوا آٹھ بجے واپس آیا۔ وہ بہت خوش تھا۔ لگتا تھا اس کے پاس کوئی کام کی اطلاع ہے۔ میں نے اسے مہتاب اور واحدی کے حالات معلوم کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ اس نے مجھے مفصل رپورٹ دیتے ہوئے بتایا۔

”یار جی! تمہاری جگہ نئے آنے والے تھانیدار نے استاد لنگڑ (واحدی) کا کیس خارج کر دیا ہے اور آج کل وہ رہا ہے۔ یہ سب کچھ اگروال صاحب کے کہنے پر ہوا ہے۔ اگروال نے دو دفعہ خود جیل میں واحدی سے ملاقات کی تھی...... اب پچھلے ہفتے اگروال نے واحدی کو کسی کام سے بہاولپور بھیج دیا ہے۔ ایک محلے دار کی زبانی پتہ چلا ہے کہ واحدی وہاں کوئی کاروبار سیٹ کر رہا ہے، اسے پولیس کی وردیاں سپلائی کرنے کا بہت بڑا ٹھیکہ مل گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ ٹھیکہ بھی اسے اگروال کی کوششوں سے ملا ہوگا۔“

چندر سنگھ کی حاصل کردہ معلومات بڑی قیمتی تھیں اور ان سے ایک خاص طرف اشارہ ہوتا تھا۔ چندر نے مزید بتایا۔

”یار جی! پتہ چلا ہے کہ رہا ہونے کے بعد واحدی تین چار دن تجھے ڈھونڈتا رہا تھا۔ وہ بڑے طیش میں تھا۔ کہتا تھا مر جاؤں گا یا مار دوں گا۔ (واحدی کے طیش کی وجہ وہی تازہ واقعہ تھا جو چند دن پہلے مہتاب کی سہیلی کے گھر پیش آیا تھا)

میں نے پوچھا۔ ”پھر کیا ہوا؟“

”پھر کیا ہونا تھا۔ تم ان دنوں ایس پی صاحب کی شریف کالونی والی کوٹھی میں تھے۔ وہ ڈھونڈ ڈھانڈ کر تھک گیا۔ بعد میں اگروال نے اسے بہاولپور بھجوا دیا۔“

میں نے سگریٹ کا ایک کش لے کر کہا۔ ”یار چندر، اگر واحدی شہر میں نہیں ہے تو اس کا مطلب ہے ضرور کچھ ہوگا۔“

”کیا مطلب؟“

”یہی کہ گنجے اگروال کی ٹنڈ میں ضرور خارش ہوگی اور وہ عشق کے تیل سے مالش کروانے کے لئے مالش کرنے والی کو ضرور بلائے گا۔“

چندر بولا۔ ”تمہارا مطلب ہے مہتاب کو؟“

”بالکل۔“

”میں بھی یہی سوچ رہا تھا یار جی! واحدی کو شہر سے باہر بھجوانے کا مقصد اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے۔ وردیوں کا ٹھیکہ تو سیالکوٹ میں بھی مل سکتا تھا۔“

میرے اندر امید کی لہر سی پیدا ہونے لگی تھی۔ میں نے کہا۔ ”چندر یار! اس گنجے کو رنگے ہاتھوں پکڑنا ہے اور پورے ثبوت کے ساتھ۔“

چندر بولا۔ ”جگر! تیرے لئے جان بھی حاضر ہے۔ بتا مجھے کیا کرنا ہے؟“

میں نے کہا۔ ”یار تُو روپے میں بارہ آنے اے ایس آئی ہے۔ ذرا اپنی ٹریننگ کا کرشمہ دکھا۔ اس اُلو کی پٹھی پر نظر رکھ۔“

چندر بولا۔ ”یار کیوں نہ اس اُلو کے پٹھے کو حقیقت بتائی جائے میرا مطلب ہے واحدی کو۔ اسے بھی تو پتہ چلے کہ کیا ہو رہا ہے اس کے گھر میں۔ زنانی اس کی ہے اور نگرانیاں ہم کرتے پھریں۔ میرا تو خیال ہے ایک دفعہ اسے بیوی کے کرتوتوں کا یقین آ جائے تو سارا ٹینٹا ہی ختم ہو جائے۔ پھر وہ جانے اور اس کی بیوی کے عاشق۔“

میں نے کہا۔ ”سردار جی! مسئلہ تو وہی ہے۔ ثبوت کہاں سے لاؤ گے وہ رن مرید شخص ہے۔ زنانی کے عشق میں اندھا ہو رہا ہے، اسے کچھ نظر نہیں آتا۔ جو اس کی بھلائی کی بات کرے گا اسے وہ اپنا دشمن نمبر ایک سمجھے گا...... پہلے پکا ثبوت ڈھونڈو پھر اسے بھی بتا لیں گے۔“ میں نے کہہ سن کر چندر کو مہتاب اور اگروال کی ٹوہ لینے پر راضی کر لیا۔ ابھی ہم یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ چندر کے گھر کا دروازہ بجنے لگا۔ برآمدے سے چندر کی بیوی نے باریک آواز میں کہا۔

”راکھی کے پتا، باہر کوئی آیا ہے۔“

چندر باہر چلا گیا۔ ذرا دیر بعد اس نے گھر میں پردہ کرایا اور ایک دبلے پتلے شخص کو لے کر اندر آ گیا۔ دونوں کے چہروں پر دبا دبا جوش تھا۔

چندر نے کہا۔ ”یار جی! تیری بڑی قسمت ہے لگتا ہے تیرا کام بن جائے گا۔ بڑی اچھی خبر ہے تیرے لئے۔“ میرے پوچھنے پر اس نے دبلے پتلے شخص کا تعارف کرایا۔ ”اس کا نام عازم علی ہے۔ دہلی کا رہنے والا ہے۔ ریڑھی پر رکھ کر گاجر کا حلوہ برفی بیچتا ہے۔ میں نے تیرے کہنے سے پہلے ہی اسے اگروال کی نگرانی پر لگا رکھا تھا۔“

”کیا مطلب؟“

چندر نے ایک آنکھ میچ کر کہا۔ ''مطلب یہ کہ پچھلے تین روز سے عازم دہلوی کی ریڑھی اگروال کی کوٹھی کے عین سامنے الیکٹرک پول کے نیچے کھڑی ہوئی تھی۔ اس کا سودا کم بکتا تھا اس لئے میں ایک سیر برفی اور آدھ سیر گاجر کا حلوہ روزانہ اس سے لے کر کھاتا تھا۔ دیکھتے نہیں پچھلے تین دنوں سے میری جان کافی بن گئی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''مذاق چھوڑو، مختصر بتاؤ۔ کہنا کیا چاہتے ہو؟''

چندر نے کہا۔ ''عازم صاحب بڑی اہم خبر لائے ہیں۔ عازم صاحب ذرا اپنی زبان سے ہی سنائیے۔''

عازم دہلوی نے دیدے گھمائے اور بولا۔ ''قبلہ اب سے کوئی دو گھنٹے پہلے میرے خیال میں چھ ساڑھے چھ کا وقت تھا ایک رکشہ سیکرٹری صاحب کے دولت خانے کے سامنے رکا۔ اس میں سے ایک لڑکی نکلی۔ قبلہ کیا بتاؤں میں آپ کو بس کھویا ملائی تھی وہ یا سمجھ لیجئے کہ گلاب دار پوڑی تھی۔ وہ خوشبو بکھیرتی چلی گئی۔ سرو قد، گیسو کٹے ہوئے۔ آنچل گلے میں آویزاں۔ ٹک ٹک ایڑیاں بجاتی دروازے پر جا رکی۔ لمبی گردن گھما کر بڑی احتیاط سے آجو باجو دیکھا اور حنائی انگلی گھنٹی کے بٹن پر رکھ دی۔''

عازم دہلوی نے اپنے دہلوی انداز میں بڑی لمبی چوڑی تفصیل بتائی۔ خلاصہ یہ تھا کہ ایک مشکوک لڑکی پچھلے دو گھنٹے سے کوٹھی کے اندر ہے۔ عازم دہلوی اس لڑکی کا جو حلیہ بتا رہا تھا وہ کسی طور مہتاب سے نہیں ملتا تھا۔ اس کا مطلب تھا یہ کوئی اور چکر ہے۔ ہرگوش اگروال اب میرا دشمن نمبر ون تھا اور اس کے چکروں سے باخبر رہنا میرا فرضِ اولین...... میں نے آناً فاناً فیصلہ کیا اور اس معاملے کی ٹوہ لینے کے لئے کھڑا ہو گیا۔ عازم دہلوی ایک کھٹارہ سائیکل پر آیا تھا۔ اسی سائیکل پر بیٹھ کر ہم دونوں سخت سردی میں تقریباً ایک میل کا فاصلہ طے کر کے نئی آبادی پہنچ گئے۔ دور ہی سے عازم دہلوی کی ریڑھی ایک نیم روشن کھمبے کے نیچے کھڑی نظر آ گئی۔ ایک لڑکا جو غالباً عازم دہلوی کا بیٹا تھا، مستعدی سے دکانداری کر رہا تھا۔ باپ کی طرح لونڈا بھی ہوشیار تھا۔ اس نے ہمارے پہنچتے ہی بتایا کہ میم صاحبہ ابھی تک گیٹ سے باہر نہیں نکلی۔ گیٹ سے اس کا مطلب اگروال کی کوٹھی کا گیٹ تھا۔ اس وقت تک نو بج چکے تھے۔ سردیوں کے ''نو'' تھے۔ سڑک تقریباً سنسان ہی نظر آ رہی تھی۔ مجھ پر آج عجیب سا موڈ طاری تھا۔ ماں کی روتی ہوئی آنکھیں تصور میں ہلچل مچا رہی تھیں۔ جی چاہ رہا تھا یا تو میرے چہرے سے گناہ کا داغ دھل جائے یا اس بیکار زندگی کا خاتمہ ہو۔ جب میں گھر سے چلا تو میرا ارادہ صرف اس عورت کی جھلک دیکھنے کا تھا جو اس وقت اگروال کے ساتھ موجود تھی۔ زیادہ سے

زیادہ یہ خیال تھا کہ عورت کا پیچھا کر کے اس کا پتہ ٹھکانہ ڈھونڈنے کی کوشش کروں گا مگر کوٹھی پر پہنچ کر اور وہاں کا محلِ وقوع دیکھ کر دل میں عجیب سی ترنگ پیدا ہوئی اور میں ایک طویل چکر کاٹ کر کوٹھی کے عقب میں پہنچ گیا۔ خوش قسمتی سے کوٹھی کے اندر کتا نہیں تھا۔ پوری عمارت تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی صرف دو روشن دانوں میں ہلکی روشنی نظر آ رہی تھی۔ کچھ دیر جائزہ لینے کے بعد میں نے دیوار پھاندی اور اندر کود گیا۔ چھوٹا سا عقبی صحن پار کر کے میں برآمدے میں پہنچا اور وہاں سے ایک کھڑکی کے سامنے آ گیا۔ کھڑکی پر پردہ تھا مگر مدھم روشنی سے پتہ چلتا تھا کہ اندر بلب روشن ہے۔ کھڑکی کے پاس ہی لکڑی کی ایک سات فٹ اونچی الماری رکھی تھی۔ میں نے ہلا جلا کر الماری کی مضبوطی کا اندازہ کیا اور شیلفوں پر پاؤں رکھ کر اوپر چڑھ گیا۔ تھوڑا سا ترچھا ہو کر اب میں روشن دان میں سے جھانک سکتا تھا۔ اندر مجھے ایک عجیب منظر نظر آیا۔ ایک لڑکی جس کی عمر بمشکل چودہ سال ہو گی۔ بستر پر دوزانو بیٹھی ایک دروازے کی درز سے کسی کمرے میں جھانک رہی تھی۔ لڑکی کی پشت میری طرف تھی تاہم لباس اور جسم کی کشش سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ایک نوخیز خوبصورت لڑکی ہے۔ اس کے لمبے بال شانوں پر ڈھیلی ڈھالی چوٹی میں بندھے ہوئے تھے اور دوپٹہ ایک کندھے پر جھول رہا تھا۔ عجیب صورتِ حال تھی۔ میں ایک لڑکی کے کمرے میں جھانک رہا تھا اور وہ لڑکی بھی کسی کی خلوت میں دیکھ رہی تھی۔ یہ تجربہ میرے لئے انوکھا تھا۔ کچھ دیر بعد لڑکی نے دروازے کی جھری سے آنکھ ہٹائی اور مسہری پر گر گئی۔ بازو اوپر اٹھا کر اس نے عجیب انداز میں انگڑائی لی اور کروٹ بدل کر کسی چیز پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ اس وقت میری نگاہ ایک خوبصورت بلی پر پڑی۔ یہ بلی بڑی بے تکلفی سے لڑکی کے بستر پر نیم دراز تھی۔ میں نے لڑکی کا چہرہ دیکھا۔ وہ نازونعم میں پلی ہوئی ایک طالبہ نظر آتی تھی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ یہ سیکرٹری صاحب کی بیٹی ہے۔ تھوڑی دیر بعد لڑکی پھر دوزانو ہو کر جھری میں جھانکنے لگی۔ میں صاف دیکھ رہا تھا بلب کی روشنی میں لڑکی کے کانوں کی لوئیں سُرخ ہو رہی تھیں اور سانس تیزی سے چل رہا تھا۔ ایک منٹ بعد وہ پھر مسہری پر ڈھیر ہو گئی۔ اس کی انگلیاں بے خیالی میں بلی کے نرم و نازک بالوں سے کھیل رہی تھیں...... جب تیسری مرتبہ اٹھ کر لڑکی نے جھری سے آنکھ لگائی تو ایک تیز آواز نے اسے بُری طرح بدکنے پر مجبور کر دیا۔ کسی نے اس کا نام پکارا تھا۔

''جی ڈیڈی۔'' اس نے جواب میں پکار کر کہا۔ اس کے چہرے پر سخت گھبراہٹ تھی۔ میں بھی اپنی جگہ ٹھٹک کر رہ گیا۔ لڑکی نے جلدی سے آنچل سینے پر پھیلایا اور بند دروازے کی طرف بڑھی۔ مگر ابھی اس کے ہاتھ دروازے کی چٹخنی تک نہیں گئے تھے کہ وہی بھاری مردانہ

آواز دوبارہ سنائی دی۔

''شکنتلا بیٹی! ہم ذرا باہر جا رہے ہیں۔ تم نے کھانا کھا لیا ہے؟''

''جی ڈیڈی۔'' لڑکی نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے۔ کوئی ہوم ورک نہیں ہے تو سو جاؤ۔ بابا اشوک باہر گیٹ پر ہے۔ کوئی کام ہو تو اسے کہہ دینا۔''

''اچھا ڈیڈی۔'' لڑکی نے اندر سے ہی آواز دی۔

قدموں کی آوازیں آئیں۔ مردانہ قدموں کے ساتھ زنانہ قدموں کی ٹک ٹک بھی تھی۔ تھوڑی دیر بعد پورچ میں گاڑی سٹارٹ ہوئی اور اس کی روشنیاں گیٹ کی طرف رینگتی نظر آئیں۔ اس کے بعد عمارت ایک بار پھر مکمل خاموشی میں ڈوب گئی۔ مجھے افسوس ہوا کہ میں ہرگوش اگروال کی اس دوسری محبوبہ کی شکل نہیں دیکھ سکا۔ کمرے میں لڑکی اب گراموفون پر ایک ریکارڈ لگا کر نیم دراز ہو گئی تھی۔ میں نے مزید تاک جھانک ضروری نہیں سمجھی اور احتیاط سے الماری کے خانوں میں پاؤں دھرتا ہوا نیچے اُتر آیا۔ برآمدے کے دروازے کی طرف مڑا تو دل دھک سے رہ گیا۔ یہ ایک بند برآمدہ تھا۔ یعنی اس کے دروں کو آہنی جالی اور گرل سے محفوظ کیا گیا تھا۔ جس چھوٹے سے دروازے کے راستے میں اندر آیا تھا اب وہ بند تھا اور اندر کی طرف اس کی کنڈی میں ایک بڑا سا قفل جھول رہا تھا۔ یہ ایک نئی مصیبت کھڑی ہو گئی تھی۔ کمروں سے گزرے بغیر یہاں سے نکلنے کا اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ میں پنجوں کے بل قفل کے پاس بیٹھ کر اور اسے ہلا جلا کر دیکھنے لگا۔ قفل بہ زبانِ خاموشی چلا چلا کر کہہ رہا تھا۔

حکمت سے کھلنے والے اے مہربان نہیں ہم
سو بار کر چکے ہیں چور امتحان ہمارا

میں نے جیب سے چابیوں کا ایک چھوٹا گچھا نکالا اور قفل سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگا اچانک تاریک برآمدہ روشنی میں نہا گیا۔ میں بدحواس ہو کر اٹھا اور چھپنے کی جگہ تلاش کرنے لگا۔ ساتھ والے کمرے کا دروازہ کھلا اور وہی لڑکی جسے سیکرٹری صاحب نے شکنتلا کہہ کر پکارا تھا۔ بڑی بے تکلفی سے لکڑی کی الماری کی طرف بڑھی۔ اس نے کھلے گریبان کا سلیپنگ گاؤن پہنا ہوا تھا اور ریشمی بال شانوں پر بکھرے تھے۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر زلزلے کے آثار نظر آئے۔ میرا خیال تھا کہ وہ پورے زور سے چیخے گی مگر اس نے صرف منہ کھولنے پر اکتفا کیا۔ چیخنے کی بجائے وہ بڑی پھرتی سے واپس مڑی۔ غالباً کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ میں اس کے پیچھے لپکا تاہم دروازے کی دہلیز پر مجھے ٹھٹک جانا پڑا۔ لڑکی میرے سامنے کھڑی

تھی اور اس کے ہاتھوں میں ڈبل بیرل بارہ بور رائفل نظر آ رہی تھی۔ ایک لمحے کے لئے میں بھونچکا رہ گیا۔ مجھے اس کم عمر لڑکی سے اتنی ہوشیاری کی توقع نہیں تھی۔ اس نے ثابت کیا تھا کہ وہ ایک پولیس والے کی بیٹی ہے۔

''کون ہو تم؟'' اس نے کسی بلی کی طرح غرا کر پوچھا۔ اس کی بلی بھی ایک کرسی پر چڑھی غور سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ لڑکی کی انگلی لبلبی پر تھی۔ بڑی نازک گھڑی تھی۔ اس مشکل وقت میں میری سمجھ میں کچھ اور تو نہیں آیا۔ میں نے پسندیدگی کے انداز میں اس کے سراپے کو گھورا اور چہرے پر زبردستی مسکراہٹ لا کر بولا۔

''میں...... میں تم سے دو باتیں کرنا چاہتا ہوں شکنتلا۔''

لڑکی نے جواباً مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ اس کے چہرے پر ایک ہلکا سا رنگ آ کر گزر گیا۔ آنکھوں میں ناچتے شعلے بھی کچھ مدھم پڑ گئے۔ ''میں پوچھتی ہوں کون ہو تم؟'' اس نے بدستور سخت لہجے میں پوچھا۔ ''تمہیں شرم نہیں آتی، چوروں کی طرح گھر میں گھستے ہوئے۔''

جیسا کہ میں نے بتایا ہے میں اس وقت سب انسپکٹر تھا۔ عمر زیادہ نہیں تھی۔ سادہ کپڑوں میں مجھ پر کسی نوجوان کلرک یا یونیورسٹی کے طالب علم کا دھوکا ہو سکتا تھا۔ میں نے لگاوٹ سے لڑکی کی آنکھوں میں جھانکا۔ اس کے خوف میں کچھ اور کمی آ گئی مگر بندوق پر گرفت بدستور سخت تھی۔ یہ لمحے میرے لئے غنیمت تھے۔ میں نے اچانک جھپٹا مارا۔ میرا ایک ہاتھ بندوق پر آیا اور دوسرے نے سر کے پیچھے سے نکل کر لڑکی کے ہونٹ ڈھانپ لئے۔ میری کوشش کامیاب رہی۔ بندوق ایک جھٹکے سے لڑکی کے ہاتھ سے نکل گئی۔ وہ خود میرے بازوؤں میں چڑیا کی طرح پھڑک کر رہ گئی۔ میں نے کہا۔

''دیکھ لڑکی! میں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا تجھے۔ جیسے آیا ہوں ویسے ہی چلا جاؤں گا۔ بس خاموشی سے میری بات سن لے۔''

لڑکی نے پہلے تو زور مارنے کی کوشش کی لیکن جلد ہی ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیئے۔ سمجھا بجھا کر میں نے لڑکی کو رام کر لیا۔ اس نے سر کے اشارے سے مجھے یقین دلایا کہ میں اس کے منہ سے ہاتھ ہٹا دوں تو وہ چیخ و پکار نہیں کرے گی۔ میں نے ہاتھ ہٹا لیا۔ آنکھوں میں آنسو بھرے وہ میرے سامنے بیٹھ گئی۔ دباؤ کی وجہ سے اس کے نرم و نازک گال پر میرے ہاتھ کی انگلیاں ثبت ہو کر رہ گئیں تھیں۔ وہ بائیں ہاتھ کی کلائی کو مسلسل دبا رہی تھی۔ شاید موچ وغیرہ آ گئی تھی۔ میں نے ٹیبل لیمپ جلا کر ٹیوب لائٹ بجھا دی۔ لڑکی نے ڈرے ہوئے لہجے میں

کہا۔

''دیکھو، مجھے کچھ نہ کہنا۔ تم نے وعدہ کیا ہے۔ ورنہ میں ابھی شور مچادوں گی۔''

''میں اپنے وعدے پر قائم ہوں۔'' میں نے کہا۔

''کون ہو تم؟''

''ایک شریف آدمی۔'' میں مسکرایا۔ ''دراصل...... دراصل مجھے کچھ روپوں کی ضرورت تھی...... میرا امتحان ہے فائنل ایئر کا۔ میں نے فیس جمع کرانی تھی...... ہر طرف سے مایوس ہوکر ایسا کرنا پڑا۔''

وہ کچھ دیر مجھے ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھتی رہی۔ ''کک...... کتنے روپوں کی ضرورت ہے تمہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''صرف بیس روپے۔''

وہ کچھ دیر سوچنے کے بعد اٹھی اور ایک اٹیچی کیس کا ڈھکن اٹھا کر کچھ تلاش کرنے لگی۔ لیڈیز بٹوے سے اس نے بیس روپے نکالے اور میرے ہاتھ میں تھما دیئے۔ ''تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہئے۔'' وہ بھولپن سے بولی۔ ''جانتے ہو یہ کس کا گھر ہے۔ تم نے نیم پلیٹ نہیں پڑھی باہر؟''

''نہیں تو۔'' میں نے انجان بن کر کہا۔

''ایڈیشنل سیکرٹری پولیس۔''

''باپ رے باپ۔'' میں نے مصنوعی خوف سے کہا۔

وہ میرے انداز پر دل ہی دل میں مسکرادی۔ میرے رویے نے چند ہی لمحوں میں اس کا خوف بالکل دور کردیا تھا۔ چہرے کی رنگت بھی لوٹ آئی تھی۔ وہ اس وقت مجھ پر پورا بھروسہ کررہی تھی۔ اس نے میرے ہاتھ سے بندوق لے کر سیفٹی کیچ لگایا اور اسے دوبارہ دیوار پر لٹکا دیا۔

''کہاں کے رہنے والے ہو؟'' وہ انٹرویو لینے والے انداز میں بولی۔

میں نے مصنوعی گھبراہٹ سے کہا۔ ''بیگم صاحبہ اس وقت تو مجھے یہاں سے نکالو۔ میرا دل ہول رہا ہے۔ ایڈیشنل سیکرٹری پولیس۔ او گاڈ۔ یہ کیا کردیا میں نے۔ یہ لیجئے اپنے روپے۔ مجھے نہیں لینا کچھ بھی۔'' میں نے روپے واپس دے دیئے۔ اس نے زبردستی دوبارہ میری جیب میں ٹھونس دیئے اور بولی۔

''اب تو رکھ لیں مگر ایسی حرکت نہ کیجئے گا دفعہ 380 لگتی ہے اس پر۔ سات سال کے

لئے بندہ اوجھل ہوسکتا ہے۔''

میں نے اصل مطلب کی طرف آتے ہوئے کہا۔ ''بڑی مہربانی آپ کی۔ اب مجھے یہاں سے نکال دیجئے کسی طرح۔''

وہ میری گھبراہٹ سے لطف اندوز ہورہی تھی۔ کہنے لگی۔ ''تالا تو اب ڈیڈی ہی آکر کھولیں گے۔''

''خدا کے لئے شکنتلا بی بی۔ ایسی بچگانہ باتیں مت کیجئے۔''

وہ اپنی کلائی دبانے لگی۔ ''میرا خیال ہے موچ آگئی ہے ذرا دیکھئے تو۔''

میں نے اس کی نرم کلائی ہاتھ میں لی۔ چوڑیاں اوپر اٹھا کر جوڑ کو ٹٹولا۔ ذرا سا کھینچا۔ اس نے سسکاری لی۔ ''اُف...... پلیز، بڑے سخت ہاتھ ہیں آپ کے۔''

میں نے خشک ہاتھ سے تھوڑی سی مالش کی۔ وہ اپنا نچلا ہونٹ دانتوں تلے کاٹ رہی تھی۔ اس کا گھٹنا بے تکلفی سے میرے گھٹنے کو چھو رہا تھا۔ جیب سے رومال نکال کر میں نے اس کی کلائی پر باندھ دیا اور کہا۔

''شکنتلا بی بی! اب کچھ کیجئے میرا۔''

اس نے لذت آمیز نظروں سے میری طرف دیکھا اور دوسرے کمرے میں جا کر ایک چابی ڈھونڈ لائی۔ میں نے اس دوران بیس روپے اس کے تکیے کے نیچے رکھ دیئے تھے۔ (اس جھری سے بھی آنکھ لگائی جہاں سے وہ جھانک رہی تھی۔ دوسری طرف اس کے ڈیڈی کا بیڈروم تھا) وہ چابی لے آئی اور برآمدے کا دروازہ کھول کر مجھے باہر نکال دیا۔

''اچھا جی زندگی رہی تو پھر ملاقات ہوگی۔'' میں نے الوداعی نظروں سے دیکھ کر کہا۔ وہ یک ٹک مجھے ہی گھور رہی تھی۔ میں رخ پھیر کر دیوار پر چڑھا اور دوسری طرف کود گیا۔

☆======☆======☆

تیسرے یا چوتھے روز مجھے چندر سنگھ کے پتے پر ایک خط ملا۔ میں نے خط کھولا اور حیران رہ گیا۔ یہ ایک زبردست محبت نامہ تھا۔ گرما گرم فقروں اور شعروں سے بھرا ہوا۔ پڑھنے کے بعد پتہ چلا کہ یہ خط شکنتلا کا لکھا ہوا ہے۔ اس نے ایک دوست لڑکے کے بھیس میں یہ خط لکھا تھا۔ اپنا نام شکانتل بتایا تھا مگر اشاروں اشاروں میں ساری بات سمجھا دی تھی۔ میرے لئے سب سے حیران کن امر یہ تھا کہ اس لڑکی کو میرا ایڈریس کیسے ملا۔ مزید حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ میرا نام بھی جانتی تھی۔ بہت سوچ بچار کے باوجود کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ تیسرے روز ایک خط اور مل گیا۔ اس میں شکنتلا نے ایک ایڈریس بھی دیا تھا اور لکھا تھا کہ اس پتے پر مجھے

آپ کا ہر خط مل جائے گا۔ میں نے یہ دونوں خط پڑھ کر اور اس کے بعد تین چار خط بغیر پڑھے پھاڑ دیئے...... وہ ایک نوعمر لڑکی تھی ماں فوت ہو چکی تھی اور باپ رنگ رلیوں میں مصروف تھا اور اتنا آزاد خیال تھا کہ یہ سب کچھ گھر میں کر رہا تھا۔ جہاں تک میری سمجھ میں آیا تھا گھر کے آلودہ ماحول نے اس لڑکی کی سوچوں پر بُرا اثر ڈالا تھا اور وہ وقت سے پہلے جوان ہو گئی تھی۔ اس کے خطوں کی جذبات انگیز تحریر پڑھ کر کوئی شخص بھی اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ اپنی عمر سے آگے کی باتیں کر رہی ہے۔

اس دوران میرے کیس کی سماعت بھی جاری تھی۔ کوشش کے باوجود میں ہرگھوش اگروال اور مہتاب کے خلاف کوئی ثبوت نہیں پا سکا تھا۔ یوں لگتا تھا جہاندیدہ اگروال نے موقع کی نزاکت دیکھتے ہوئے مہتاب سے میل جول بند کر دیا ہے۔ ہو سکتا ہے ان کے درمیان طے ہو چکا ہو کہ کچھ عرصہ کے لئے اس کھیل میں وقفہ رکھیں گے۔ ہاں دوسری عورت سے اگروال کا میل جول برقرار تھا۔ عازم دہلوی کی رپورٹ کے مطابق وہ ہر تیسرے چوتھے روز اگروال سے مل رہی تھی۔ اس عورت کے بارے میں میرے یار چندر سنگھ نے جو معلومات حاصل کی تھیں ان کے مطابق وہ کرسچین تھی۔ اس کا نام ویلن تھا۔ دو تین مہینے پہلے وہ لیڈیز پولیس میں ڈائریکٹ انسپکٹر بھرتی ہوئی تھی۔ غالباً اس کے بھرتی ہونے میں اگروال کی سفارش کو دخل تھا۔ اب اگروال اپنی سفارش کی ''قیمت'' وصول کرنے کے لئے اس کو اپنی کوٹھی بلاتا رہتا تھا۔ ایک خبر یہ بھی تھی کہ وہ اس لڑکی سے شادی کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔

وہ ایک بڑی چمکیلی صبح تھی۔ محرم کے ساتھ کرسمس کی چھٹیاں بھی مل گئی تھیں۔ ہر شخص پر چھٹی کا موڈ طاری تھا۔ میں تو ویسے ہی لمبی چھٹی پر تھا۔ چندر سنگھ کے گھر چھت پر چارپائی ڈالے دھوپ سینک رہا تھا۔ ذہن میں بار بار مہتاب اور واحدی کے چہرے آ رہے تھے۔ جوئے خانے پر چھاپے سے شروع ہونے والی کہانی ایک بُری عورت کی بُرائی کے سبب کہاں سے کہاں پہنچ گئی تھی۔ کبھی کبھی تو خیال آتا کہ سچ مچ ایک چھرا لے کر اس خبیث عورت کے گھر کود جاؤں اور جان سے مار ڈالوں۔ بعد میں جو ہو دیکھا جائے گا...... واحدی کی بھی کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ عجیب چغد آدمی تھا۔ اسے جیل سے چھوٹے ہوئے اب کئی ماہ ہو چکے تھے۔ ''خلیفے'' کو ابھی تک پتہ نہیں چلا تھا کہ بیوی کیا گل کھلا رہی ہے اور اب خیر سے ٹھیکیدار بن کر وہ بہاولپور پہنچ چکا تھا۔ تھوڑی بہت سی عقل ہوتی تو بیوی سے پوچھتا۔ ''بھلی مانس یہ اتنا ہائی رینک کا افسر مسمی ہرگھوش اگروال ہمارے غم میں کیوں پتلا ہو رہا ہے۔ تُو نے کیا سونگھایا ہے اسے کہ ہر جگہ خم ٹھونک کر ہماری طرف داری کر رہا ہے...... مگر......

انہی سوچوں میں گم تھا کہ اچانک بیرونی دروازے پر دستک ہوئی۔ پھر چندر کی بیوی نے آواز دی۔ ''بھائی جان کوئی آپ سے ملنے آیا ہے۔'' میں چپل پہن کر جلدی جلدی دروازے پر پہنچا۔ باہر ایک برقع پوش لڑکی کو دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔ یہ برقع پتہ نہیں کیوں آج کل ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ یہ سیاہ رنگ کا فیشنی برقع تھا اور اس کے باریک نقاب میں سے کسی مہ جبیں کے رخسار دہک رہے تھے۔

''جی فرمایئے۔'' میں نے عاجزی سے پوچھا۔

بولنے والی بولی تو میں اسے فوراً پہچان گیا۔ وہ شگفتہ تھی۔

''السلام علیکم!'' اس نے نمستے کی بجائے میری ہی زبان میں بات کی۔

''وعلیکم السلام۔'' میں نے گھبرا کر کہا۔ ''تم یہاں؟''

''جی ہاں۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولی۔ ''چار خط لکھ چکی ہوں آپ کو۔ آخری خط میں مَیں نے صاف لکھا تھا کہ اگر آپ نہیں آئے تو میں خود آ جاؤں گی۔''

''آ...... آخری خط۔'' میں نے تھوک نگل کر کہا۔ اب میں اسے کیا بتاتا کہ میں نے چار میں سے تین خط پڑھے ہی نہیں۔

''وہ دراصل......''

''دیکھیے نواز صاحب، میں اتنی گری ہوئی نہیں ہوں کہ آپ کے پیچھے پیچھے بھاگی پھروں اور آپ کوئی ایسا ویسا خیال بھی دل میں نہ لائیں۔ وہ خط تو میں نے بس...... یونہی دوستی میں لکھ دیئے...... لیکن...... لیکن یہ میری عزت کا معاملہ ہے۔ آپ کو ایک بار میرے ساتھ چلنا ہی پڑے گا۔ میں اپنی سہیلی سے وعدہ کر چکی ہوں کہ آپ کو دکھاؤں گی۔ میرا مطلب ہے میں دکھانا چاہتی ہوں آپ کو...... سہیلی کو میرا مطلب ہے سہیلی کو آپ......'' وہ بُری طرح گڑبڑا گئی۔

''بس...... بس میں سمجھ گیا ہوں۔'' میں نے سرگوشی کی۔ ''مگر میں بے حد مصروف ہوں، امتحانوں میں۔''

وہ روہانسی آواز میں بولی۔ ''دیکھئے مسٹر نواز آپ بے حد بُرے آدمی ہیں۔ آپ کو خیال کرنا چاہئے کسی کا۔'' وہ غصے اور بے بسی میں کانپ رہی تھی۔ مجھے اس کی حالت پر ہنسی بھی آئی اور غصہ بھی۔ وہ رومانی ناولوں کی ہیروئنوں جیسا کردار ادا کر رہی تھی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ میری اور اس کی عمر میں خاصا فرق ہے اور وہ طریقہ بھی ٹھیک نہیں جو وہ اختیار کر رہی ہے وہ اپنے راستے پر آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ ایک طرف وہ میری بے رخی پر برہم ہو کر مجھ پر دو حرف

بھیج رہی تھی اور دوسری طرف سہیلی کو میری ''شکل شریف'' کا دیدار بھی کرانا چاہتی تھی۔ بہر حال کچھ بھی تھا وہ ایک پولیس والے کی بیٹی تھی۔ غصے اور مایوسی میں وہ کوئی ایسا قدم بھی اٹھا سکتی تھی جس سے میرے بگڑے ہوئے معاملات اور بگڑ جاتے۔ میں نے سوچا کہیں بیٹھ کر اسے سمجھانا ضروری ہے۔

میں نے پوچھا۔ ''کہاں ملنا چاہتی ہو مجھ سے؟''

''اپنے گھر میں۔'' وہ بڑے غصے سے بولی۔

''نہیں نہیں...... کہیں اور رکھ لو، سیکرٹری صاحب......''

''نہیں نہیں...... ڈیڈی گھر میں نہیں ہیں...... کوئی بھی نہیں ہے...... میں اکیلی ہوں رات تک۔'' وہ روانی میں کہہ تو گئی مگر بعد میں خود ہی شرمندہ سی ہوگئی۔ بولی۔ ''میرا مطلب ہے آپ بے فکر ہو کر آسکتے ہیں...... بلکہ ہو سکے تو ابھی چلے چلئے۔''

''نہیں...... میں کوئی ساڑھے بارہ بجے تک آؤں گا۔'' میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

اس نے نقاب کے پیچھے سے ایک نگاہِ غلط انداز مجھ پر ڈالی اور بڑی رومانٹک ناراضگی کے ساتھ واپس چلی گئی۔

☆======☆======☆

ایک بجے میں ہرگوش اگروال صاحب کے گھر بیٹھا تھا۔ شکنتلا نے بالکل ٹھیک کہا تھا۔ کوٹھی بھائیں بھائیں کر رہی تھی۔ کوئی چوکیدار یا ملازم گھر میں نہیں تھا۔ غالباً چھٹیوں کی وجہ سے نوکر پیشہ لوگ گاؤں کو چلے گئے تھے۔ جو ایک آدھ ہوگا اسے شکنتلا نے حکمت سے اِدھر اُدھر کر دیا ہوگا۔ میں شکنتلا اور اس کی سہیلی کے سامنے صوفے پر بیٹھا تھا۔ میز پر خرمانیاں، چلغوزے وغیرہ رکھے تھے۔ میں دل میں تو یہ خیال لے کر آیا تھا کہ اس بیوقوف لڑکی کو اپنی عقل کے مطابق کچھ سمجھاؤں گا مگر اس کی سہیلی کی موجودگی میں کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہوں اور کچھ کہوں بھی یا نہیں۔ لڑکی نے میری اس کشمکش کو چہرے سے محسوس کر لیا اور معنی خیز انداز میں اٹھتے ہوئے بولی۔

''اچھا...... میں آپ دونوں کے لئے چائے بناتی ہوں۔''

وہ کچن کی طرف چلی گئی تو میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ ''شکنتلا میری بات کا بُرا نہ ماننا۔ تم بہت اچھی اور سمجھدار لڑکی ہو، مگر عمر کے جس دور سے گزر رہی ہو، وہ بہت نازک دور ہے۔ اس دور میں انسان جو فیصلے کرتا ہے ان پر عموماً بعد میں پچھتانا پڑتا ہے......'' ابھی

میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک کچن کی طرف سے ایک لرزہ خیز چیخ سنائی دی اور اس کے ساتھ ہی شکنتلا کی سہیلی ہذیانی انداز میں دوڑتی ہوئی کمرے کے اندر آئی۔ میں نے اس کے عقب میں دیکھا اور خون رگوں میں جم کر رہ گیا۔ اس کے پیچھے واحدی تھا۔ واحدی کے ہاتھ میں خنجر تھا اور چہرہ آگ کی طرح سُرخ ہو رہا تھا۔ وہ ایک ایسے شخص کا چہرہ تھا جو سب کچھ کر سکتا تھا...... مر بھی سکتا تھا اور لاشوں کے انبار بھی لگا سکتا تھا۔ خود بھی فنا ہو سکتا تھا اور دوسروں کو بھی کر سکتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں وہی وحشت ناچ رہی تھی جو دو مہینے پہلے اس وقت نظر آئی تھی جب اس نے میرے گھر کو آگ لگائی تھی۔

''کہاں ہیں وہ دونوں کتے۔ میں ان کی بوٹیاں اُڑا دوں گا۔'' وہ چلایا اور لڑکی کو نظر انداز کر کے ساتھ والے کمرے کی طرف بڑھا۔ ''مہتاب...... مہتاب۔'' وہ حلق کی پوری قوت سے دھاڑا۔ ''باہر آ مہتاب مجھے اپنی شکل دکھا...... کتے اگروال، کہاں ہے تُو سامنے آ میرے۔ سامنے آؤ حرام زادو...... میں کہتا ہوں سامنے آؤ۔'' وہ جنونی انداز میں چلا رہا تھا اور خنجر بدستور بگولے کی طرح کوٹھی کے کمروں میں چکرا رہا تھا۔ دونوں لڑکیاں بُری طرح چیخ رہی تھیں پھر شکنتلا کو ہوش آیا، وہ بندوق لینے کے لئے اپنے کمرے کی طرف بھاگی مگر ابھی بغلی دروازے میں ہی تھی کہ ایک خوفناک دھماکے سے وسیع کوٹھی کے درو دیوار لرز گئے۔ وہ چیختی ہوئی واپس میرے پاس پلٹ آئی۔ اس کے بندوق تک پہنچنے سے پہلے ہی واحدی پہنچ گیا تھا اور اب بندوق اس کے ہاتھ میں تھی۔ وہ غصے میں جیسے پاگل ہو رہا تھا مجھے کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا یہ کیا ہو رہا ہے۔ واحدی عرف استاد لنگڑ تو بہاولپور میں تھا۔ وہ یہاں کیسے پہنچا اور اب وہ یہاں مہتاب کو کیوں تلاش کر رہا ہے۔ میں واحدی کا دشمن نہیں تھا لیکن غصہ سب سے بڑا دشمن ہوتا ہے اور واحدی غصے میں تھا۔ میرے پاس اپنے یا لڑکیوں کے دفاع کے لئے معمولی چاقو تک نہیں تھا۔

''واحدی ہوش کرو۔'' میں نے بلند آواز سے کہا۔ مگر اس نے میری طرف دیکھا تک نہیں۔ جنونی انداز میں اس نے ایک دیوار گیر الماری کو دھکا دیا اور وہ اپنے اندر رکھی ہوئی بیش قیمت سجاوٹی اشیا سمیت زمین بوس ہوگئی۔ لکڑی، دھات اور شیشے کی نایاب چیزیں ٹوٹ پھوٹ کر پورے فرش پر بکھر گئیں۔ پھر اس نے اپنی بندوق کے کندے سے ایک سائیڈ بورڈ کی قیمتی کراکری توڑنا شروع کر دی۔ ایکا ایکی اس کی خونی نگاہ شکنتلا پر پڑی اور آنکھوں کے شعلے بھڑک اٹھے۔ وہ کسی درندے کی طرح شکنتلا پر جھپٹا۔

''رک جاؤ۔'' میں نے گرج کر کہا۔

اس نے ٹھٹک کر بندوق کا رخ میری طرف پھیر دیا۔ یوں لگا جیسے اس کی نظر پہلی بار مجھ پر پڑی ہے۔ ایک لمحے کے لئے اس کی آنکھوں میں حیرت کے آثار نظر آئے۔ اس نے غرا کر پوچھا۔

''تھانیدار! تُو اس گھر میں کیا کر رہا ہے؟''

میں نے کہا۔ ''وہی کر رہا ہوں جو تُو غلط طریقے سے کرنے آیا ہے۔ یہ طریقہ صحیح نہیں ہے واحدی۔ اگر تجھے ہوش آ ہی گئی ہے تو اب ہوش کی بات کر۔ قانون کو ہاتھ میں مت لے۔''

واحدی چیخا۔ ''تُو میرے راستے سے ہٹ جا تھانیدار۔ آج میں کسی کی نہیں سنوں گا۔ سارے حساب برابر کردوں گا آج۔'' ہماری گفتگو کے درمیان شکنتلا اور اس کی سہیلی نے ایک دم بیرونی دروازے کی طرف دوڑ لگا دی۔ ہم میں سے کسی کو معلوم نہیں تھا کہ واحدی کے ساتھ اس کا ایک ساتھی بھی ہے۔ جونہی دونوں لڑکیاں دروازے تک پہنچیں ایک ہٹا کٹا شخص ڈبی دار سویٹر پہنے اوٹ سے نکلا اور اس نے شکنتلا کو اپنے بازوؤں میں بھر کر فرش سے اوپر اٹھا لیا۔ دوسری لڑکی چیختی ہوئی اس کے پہلو سے گزر گئی۔ شکنتلا کو بے بسی سے مچلتے دیکھا تو میں اس کی مدد کو بڑھا، صرف ایک لمحے کے لئے میں واحدی کو فراموش کر گیا۔ یہ غلطی سنگین ثابت ہوئی۔ واحدی نے ڈبل بیرل رائفل پوری طاقت سے گھما کر میرے سر پر ماری۔ آنکھوں میں تارے سے ناچ گئے۔ میں لڑکھڑاتا ہوا ایک ریڈیو سیٹ پر گرا اور اسے اپنے ساتھ لیتا ہوا فرش بوس ہو گیا۔ چند لمحوں کے لئے آنکھوں کے سامنے گہرا اندھیرا چھا گیا۔ میرے کانوں میں شکنتلا کی چیخ و پکار گونج رہی تھی اور اس کے ساتھ واحدی کی دھاڑیں سنائی دے رہی تھیں۔

''چل حرامزادی! تجھے بھرے بازار میں نہ نچواؤں تو میرا نام نہیں۔ تیرے باپ کو بھی تو پتہ چلے کہ دوسروں کی عزت پر کیسے ہاتھ ڈالتے ہیں چل میرے ساتھ۔''

میں نے بے حد کوشش کے ساتھ آنکھیں کھول کر دیکھا۔ نگاہوں کے سامنے دھندلا دھندلا منظر تھا۔ واحدی، شکنتلا کو کندھے پر لادنے کے چکر میں تھا اور وہ بھرپور مزاحمت کر رہی تھی۔ واحدی نے اسے زور کا تھپڑ مارا اور اس کا گریبان پھاڑ دیا۔ وہ بالکل وحشی ہو رہا تھا۔ اس کے منہ سے شکنتلا کے لئے انتہائی شرمناک گالیاں نکل رہی تھیں۔ میرے لئے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ اگر واحدی، شکنتلا کو لے جانے میں کامیاب ہو گیا تو ہر گھوش اگروال کی عزت کا جنازہ بڑی دھوم دھام سے نکال دے گا۔ میرے سر سے بہنے والے خون نے

آنکھوں کے سامنے سُرخ چادر سی پھیلا رکھی تھی۔ سر کو کئی بار جھٹکنے کے بعد میں نے اٹھنے کی کوشش کی اور پاؤں پر کھڑا ہو گیا۔ مگر اس سے پہلے کہ میں واحدی کی طرف بڑھتا اس کے ساتھی نے عقب سے مجھے دبوچ لیا۔ وہ خاصا تگڑا آدمی تھا۔ بازوؤں سمیت میرے پورے جسم کو اس نے اپنے آہنی شکنجے میں جکڑ لیا۔ میں نے سر کے پچھلے حصے سے اس کے چہرے پر ضرب لگانے کی کوشش کی لیکن وہ کایاں شخص صاف بچ گیا۔ واحدی کے کوٹھی میں داخل ہونے سے اب تک کے واقعات پندرہ یا بیس سیکنڈ کے اندر وقوع پذیر ہوئے تھے اور اب شکنتلا خود کو بچانے کی آخری کوشش کر رہی تھی۔ اس نے ایک ہاتھ سے دروازے کا ہینڈل پکڑ رکھا تھا اور واحدی پوری طاقت لگا رہا تھا کہ کسی طرح وہ اس کے ہاتھ سے ہینڈل چھڑانے میں کامیاب ہو جائے۔ شکنتلا فریادی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی اور چیخ رہی تھی۔ جیسے کوئی ڈوبنے والا آخری بار پانی سے اپنا ہاتھ باہر نکالے۔ ایکا ایکی کوٹھی کے پورچ کی جانب سے ملی جلی آوازیں آنے لگیں۔ صاف ظاہر تھا کہ شکنتلا کی سہیلی نے چیخ چلا کر لوگوں کو متوجہ کر لیا ہے۔ اس کے علاوہ بندوق کے دھماکے نے بھی کام دکھایا ہو گا۔ ان آوازوں کو سن کر واحدی کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اس نے شکنتلا کو کندھے پر لادنے کی آخری کوشش کی اور ناکام ہو کر پے در پے خنجر کے دو وار اس کے پیٹ پر کئے۔ خنجر کی قاتل چمک کے ساتھ میں نے شکنتلا کی درد بھری چیخ سنی۔ اس چیخ میں بے پناہ دکھ تھا۔ موت کا خوف تھا اور جوانی کی ناکام حسرتیں تھیں۔ دونوں ہاتھوں سے پیٹ پکڑ کر وہ گھٹنوں کے بل فرش پر گری۔ اس کا خون ٹپ ٹپ فرش پر گرنے لگا۔ عین اس وقت واحدی کے گرانڈیل ساتھی نے مجھے اٹھا کر ٹوٹی ہوئی الماری پر دے مارا اور باہر کی طرف بھاگا۔ سر کے زخم نے مجھے نیم جان کر رکھا تھا لیکن غم و غصے کی شدید لہر نے مجھے دوبارہ اٹھنے کا حوصلہ بخشا۔ ایک بار بُری طرح لڑکھڑا کر میں اپنے قدموں پر کھڑا ہو گیا۔ میں نے شکنتلا کی جھلک دیکھی جو اب اوندھے منہ فرش پر گر چکی تھی۔ میں نے اس کے قریب پڑی ہوئی بندوق اٹھائی اور باہر کی طرف بھاگا۔ اس سے پہلے کہ اردگرد کے لوگ اندرونی کمرے میں پہنچتے میں پہلو والی دیوار پھاند کر کوٹھی سے باہر آ چکا تھا۔ کوئی تیس گز دور مجھے ایک نیلی ویگن نظر آئی۔ وہ چل رہی تھی اور اس کے کھلے دروازے میں سے کوئی شخص اوپر چڑھ رہا تھا۔ وہ واحدی تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ویگن نے تیزی سے موڑ کاٹا اور ایک گلی میں اوجھل ہو گئی۔ میں نے اپنا سکوٹر ایک گلی چھوڑ کر پارک کیا ہوا تھا میں بھاگتا ہوا سکوٹر تک پہنچا۔ بندوق کو اس کے چوڑے تسمے کے ذریعے بستے کی طرح گلے میں لٹکایا اور سکوٹر پر بیٹھ کر اسے سٹارٹ کر لیا۔ گلی میں اکا دکا لوگ حیران نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ سیکرٹری

صاحب کی کوٹھی کے اندر سے چیخ وپکار کی آوازیں آرہی تھیں۔ اس سے پہلے کہ مجھ سے کوئی سوال کیا جاتا یا کوئی مجھے روکنے کی کوشش کرتا۔ میں نے سکوٹر موڑا اور پوری رفتار سے نیلی ویگن کے پیچھے روانہ ہوگیا۔ میرے اندازے کے مطابق نیلی ویگن والے نے ایک غلط راستہ اختیار کرلیا تھا۔ جس گلی میں وہ مڑا تھا وہ آگے جاکر کچھ اور تنگ ہوجاتی تھی اور چار پانچ فرلانگ کے بعد ایک بازار کی شکل اختیار کرلیتی تھی۔ اس بازار میں سے تیزی کے ساتھ نکل جانا ممکن نہیں تھا اور ڈیڑھ دو بجے تو یہاں ویسے بھی خاصا رش ہوتا تھا۔

میرا اندازہ درست نکلا۔ قریباً تین فرلانگ فاصلہ طے کرنے کے بعد مجھے نیلی ویگن نظر آگئی۔ ڈرائیور جو کوئی بھی تھا اس نے ہارن پر ہاتھ رکھا ہوا تھا اور بڑی پھرتی کا مظاہرہ کررہا تھا۔ ویگن کی کھڑکی میں سے ایک چہرہ بار بار پیچھے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا واحدی اور اس کا ساتھی اپنے تعاقب سے باخبر ہیں۔ کچھ آگے جاکر ویگن ایک اور بازار میں مڑ گئی۔ میں بدستور اس کے پیچھے تھا۔ اس بازار میں چالیس پچاس گز آگے جانے کے بعد ویگن ایک ریڑھی والے سے ٹکرا گئی اور ترچھی ہوکر ایک دکان کے تھڑے کے نیچے گھس گئی۔ اس کا اگلا پہیہ گہری نالی کے اندر جاچکا تھا۔ واحدی اور اس کا ساتھی چھلانگیں لگا کر گاڑی سے اُترے۔ ان کے چہروں پر خوف تھا۔ شاید انہیں غلط فہمی تھی کہ میرے علاوہ بھی کچھ لوگ پیچھے آرہے ہیں۔ واحدی کے ایک ہاتھ میں خون آلود خنجر ابھی تک نظر آرہا تھا۔ اس نے ایک خونی نگاہ مجھ پر ڈالی اور ایک دروازے کا ٹاٹ اٹھا کر اندر گھس گیا۔ اس کے ساتھی نے ایک اور تنگ سی گلی کی طرف دوڑ لگادی تھی۔ میں واحدی کے پیچھے لپکا۔ یہ علاقہ لاہور کی پرانی انار کلی کی طرز کا ہے۔ اونچے اونچے مکان، بالکونیاں، دکانوں کے تھڑے اور بجلی کے تاروں کا جال۔ قانوناً کسی کے گھر میں گھسنا جرم ہے مگر اس وقت میں قانون کی اتنی زیادہ پابندی نہیں کرسکتا تھا۔ ایک قاتل میری آنکھوں کے سامنے فرار ہورہا تھا میں نے بندوق ہاتھ میں لی اور دروازہ پار کرکے واحدی کے پیچھے لپکا۔ وہ دھڑا دھڑ سیڑھیاں چڑھتا چلا جارہا تھا۔ چند زینے اوپر مجھے ایک بوڑھی عورت نظر آئی۔ جو ہذیانی انداز میں چلا رہی تھی۔ دوسری منزل پر کوئی شخص غسل خانے کے اندر سے گلا پھاڑ پھاڑ کر پوچھ رہا تھا۔ ''کون ہے، اوئے کون ہے؟'' تیسری منزل تک پہنچتے پہنچتے میں نے واحدی کو جالیا۔ اس نے پلٹ کر خوفناک نظروں سے مجھے دیکھا اور بے دریغ خنجر کا وار کیا۔ نیم تاریک زینوں میں روشن لکیر سی چمک گئی۔ میں نے ایک زینہ اُتر کر یہ مہلک وار بچایا اور بندوق کے دستے سے ایک زوردار ضرب اس کے گھٹنے پر لگائی، چوٹ کھاکر وہ مڑا اور پھر زینے چڑھنے لگا۔ آخر ہم چھت پر پہنچ گئے، میں چاہتا تو

معمولی کوشش سے اسے شوٹ کرسکتا تھا مگر میں اسے مارنا نہیں چاہتا تھا۔ میں اور وہ ایک ہی عورت کے ڈسے ہوئے تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ وہ غصے سے پاگل ہوگیا تھا اور میرے حواس نے ابھی تک میرا ساتھ نہیں چھوڑا تھا۔ چھت پر پہنچتے ہی اس نے گھوم کر ایک اور وار کیا۔ میں نے یہ وار بھی بچالیا صرف کندھے پر معمولی سا زخم آیا۔ میری جوابی ٹانگ کھاکر وہ کئی فٹ پیچھے ہٹ گیا۔ میں نے بندوق سیدھی کرلی۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا وہ بھاگ کھڑا ہوا۔ ''رک جاؤ واحدی۔'' میں چلایا۔ اس نے جیسے کچھ سنا ہی نہیں۔ میں اس کے پیچھے بھاگا۔ وہ ایک چھت سے چھلانگ لگا کر دوسری چھت پر پہنچ گیا۔ میں نے بھی ایسا ہی کیا......وہ تیسری چھت کی طرف بڑھا۔ ان دو چھتوں کے درمیان کافی فاصلہ تھا۔ میں پکارا۔ ''رک جاؤ واحدی۔ ورنہ گولی ماردوں گا۔'' وہ چند قدم تیزی سے بھاگا اور چھلانگ لگادی۔ فاصلہ زیادہ تھا، وہ دوسری چھت تک نہیں پہنچ سکا۔ میں نے اسے دیوار سے ٹکرا کر نیچے گلی میں بجلی کے تاروں پر گرتے دیکھا۔ یہ ہائی وولٹیج تار تھے۔ زبردست دھماکہ ہوا۔ ہر طرف شعلے سے لپک گئے۔ واحدی قلابازی کھاکر تیس چالیس فٹ نیچے پختہ فرش پر گرا۔ اس کے لباس میں سے دھواں نکل رہا تھا۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔

☆======☆======☆

میں چھت سے نیچے اُترا تو اردگرد کی گلیوں میں بہت سے لوگ جمع ہوچکے تھے۔ واحدی کے بچنے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ وہ موقعے پر ہی ہلاک ہوگیا تھا۔ اتنے میں پولیس جیپ کا سائرن سنائی دینے لگا۔ ایک ڈی ایس پی صاحب عملے کے ساتھ موقعے پر پہنچ گئے اور انہوں نے مجھے گرفتار کرلیا۔ واحدی کی لاش کے پاس سے اس کا خون آلود خنجر بھی قبضے میں لے لیا گیا۔

مجھے مقامی تھانے پہنچادیا گیا۔ یہ انسپکٹر تجمل کا تھانہ نہیں تھا۔ یہاں مجھ سے تقریباً وہی سلوک ہوا جو ایک مجرم سے ہوتا ہے۔ اگلے روز دوپہر تک مجھے کچھ پتہ نہیں چلا کہ تھانے سے باہر کیا ہوا ہے۔ دوپہر کے وقت ایس پی امیر حسین صاحب کی کوششوں سے میرا وکیل مجھ تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔

وکیل عبدالقدوس صاحب نے بتایا کہ سیکرٹری اگروال سری نگر میں تھے۔ بیٹی کی خبر پاکر وہ آج صبح واپس لوٹے ہیں۔ شکنتلا ہسپتال میں ہے اور اس کی حالت بہت نازک ہے۔ انہوں نے مزید بتایا کہ اگروال صاحب نے میرے خلاف قاتلانہ حملے، اغواء اور قتل کی رپورٹ درج کرائی ہے۔ انہوں نے لکھوایا ہے کہ ملزم ان سے پرانی رنجش رکھتا ہے۔ اس نے

ان کی غیر موجودگی میں ان کی بیٹی کو اغوا کرنے کی کوشش کی اور ناکام ہو کر اسے سخت زخمی کر دیا۔ بعدازاں وہ غصے میں بھرا ہوا مہتاب کے شوہر واحدی کی طرف گیا۔ واحدی جان بچانے کے لئے بھاگا لیکن سفاک ملزم نے آخر تک اس کا پیچھا کیا اور بلندی سے دھکا دے کر ہلاک کر دیا۔''

میں سناٹے میں رہ گیا۔ ''یہ جھوٹ ہے...... جھوٹ ہے۔'' میں نے چیخ کر کہا۔ قدوس صاحب رحم آمیز نظروں سے مجھے دیکھنے لگے۔ شاید اس کے علاوہ وہ کچھ کر بھی نہیں سکتے تھے۔ چیخنے سے میرے زخمی سر میں شدید ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ میں نے سر تھام کر کہا۔

''وکیل صاحب! یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ کیا پورا محکمہ اندھا ہو گیا ہے۔ یہ لوگ شکنتلا کا بیان کیوں نہیں لیتے۔ اگر وہ بیان دینے کے قابل نہیں تو اس کی سہیلی کا بیان لیں۔ وہ سب کچھ بتائے گی۔ وہ بھی نہ بتائے تو شہادتیں دیکھیں۔ اگروال کے دس پڑوسی بتا دیں گے کہ نیلی ویگن ان کے محلے میں کھڑی تھی۔ واحدی کے پاس سے جو خنجر ملا ہے اس کے فنگر پرنٹس دیکھیں اس پر لگا ہوا خون دیکھیں...... یہ تو ایک بالکل صاف کیس ہے۔''

وکیل صاحب بولے۔ ''بھائی میرے کیس بڑا صاف ہے لیکن کیس بنانے والے اسے صاف رہنے دیں گے تو پھر ہے نا۔ اگروال جس کرسی پر بیٹھا ہے وہ سب کچھ کر سکتا ہے اور کر رہا ہے، بہرحال......''

اس ''بہرحال'' کے آگے تسلی تشفی کی بہت سی باتیں تھیں جو قدوس صاحب میرے ساتھ کر کے چلے گئے۔ اسی روز شام کو کسی نہ کسی طرح چندر سنگھ نے بھی مجھ تک رسائی حاصل کر لی۔ وہ ٹفن میں میرے لئے قیمے والے پراٹھے لے کر آیا تھا۔ سلاخوں کے اندر سے میرے ہاتھ تھام کر آنکھوں میں آنسو بھر لایا اور بولا۔

''یار جی! تمہیں اگروال کے گھر نہیں جانا چاہئے تھا۔ یہ سارا معاملہ اسی وجہ سے خراب ہوا ہے۔ کیا ضرورت تھی تمہیں وہاں جانے کی؟''

اب میں اسے کیا بتاتا کہ کس کی خاطر اور کس نیت سے مجھے جانا پڑا تھا۔ چندر سنگھ نے بتایا کہ عام لوگوں کا خیال یہی ہے کہ تم نے مقدمے بازی اور بیروزگاری سے گھبرا کر یہ پاگل پن کیا ہے۔

میں کچھ دیر گہری نظروں سے چندر سنگھ کو دیکھتا رہا پھر پوچھا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے۔ کیا تم بھی یہی سمجھتے ہو؟''

وہ بولا۔ ''میں اُلو کا پٹھا نہیں ہوں کہ یہ سمجھوں...... میں نے کل سارا دن بھاگ دوڑ کی

ہے۔ مجھے پتہ چلا کہ پچھلے تین روز سے مہتاب بھی سری نگر میں تھی، اپنے چاچے کے گھر، کیا سمجھے؟''

میں نے کہا۔ ''تمہارا مطلب ہے کہ...... اگروال کسی پروگرام کے تحت وہاں گیا تھا۔''

''بالکل یار جی۔'' چندر نے یقین سے کہا۔ ''یہ واحدی اتنا بھولا نہیں تھا جتنا ہم سمجھ رہے تھے۔ اسے بیوی کے کرتوتوں پر شک ہو چکا تھا۔ تمہیں پتہ ہے بندا جتنا بڑا عاشق ہوتا اتنا بڑا شکی بھی ہوتا ہے۔ واحدی بھی مہتاب کی طرف سے بدظن تھا۔ کل وہ اچانک بہاولپور سے یہاں پہنچ گیا۔ وہ سری نگر سے تصدیق کرنے کے بعد یہاں پہنچا تھا۔ مہتاب اپنے چچا کے گھر نہیں تھی بلکہ کسی ہوٹل شوٹل میں اگروال کے ساتھ دوستی پکی کر رہی تھی۔ واحدی یہ سمجھا کہ وہ سیالکوٹ میں ہی کہیں ہے۔ غصے میں بھرا ہوا وہ اپنے ایک ساتھی کے ساتھ اگروال کی کوٹھی پر چڑھ دوڑا......''

چندر سنگھ کی باتیں سو فیصد درست تھیں۔ اب مجھے سمجھ میں آ رہا تھا کہ کوٹھی میں گھستے ہی واحدی نے مہتاب اور اگروال کو کیوں پکارنا شروع کر دیا تھا۔ واقعات کی سب کڑیاں ٹھیک ٹھیک مل گئی تھیں مگر ان کڑیوں کے ملنے سے کیا ہوتا تھا۔ میری بے گناہی ثابت کرنے والے صرف دو افراد تھے۔ ان میں سے ایک مر چکا تھا اور دوسرا بے ہوش پڑا تھا، یعنی شکنتلا۔ بلکہ دیکھا جاتا تو شکنتلا کے بارے میں بھی یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ اگر وہ بچ جاتی اور ہوش میں بھی آ جاتی تو کیا ضروری تھا کہ وہ سچی بات کہے گی۔ اگروال نے جس طرح اس کی سہیلی کو خاموش رہنے پر مجبور کر دیا تھا وہ بھی مجبور ہو سکتی تھی۔ بلکہ وہ بیٹی تھی زیادہ امکان تھا کہ وہ باپ کے کہے پر چلے گی۔ مجھے اگروال کی بے حسی پر حیرت ہو رہی تھی۔

میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ قدموں کی وزنی ٹھک ٹھک سنائی دی۔ ایک کانسٹیبل آیا اور اس نے تیز لہجے میں چندر سے کہا۔ ''چل اٹھ اوئے فٹافٹ۔ ایس پی صاحب آئے ہیں۔'' وہ چندر کو بازو سے کھینچ کر باہر لے گیا۔ دو منٹ بعد ایس پی امیر حسین سلاخوں کے سامنے آ گئے۔ ان کے چہرے پر سنجیدگی ٹوٹ کر برس رہی تھی۔ تاسف سے بولے۔

''میں نے کہا تھا نا کہ ہر تجربہ خود نہیں کرنا چاہئے۔ کبھی کبھی بڑی بھاری قیمت دینا پڑتی ہے۔'' میں سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا۔ وہ بولے۔ ''کیا بگڑ جاتا تیرا اگر معافی کے دو بول بول دیتا۔ اب دیکھنا کہاں تک پہنچتی ہے یہ بات۔ کون سے مربعے ہیں تیرے پاس جو مقدموں پر لگائے گا۔ یہ ہزاروں لاکھوں کے کھیل ہوتے ہیں بچے اور کچھ نہیں تو بوڑھی ماں کا ہی خیال کیا ہوتا۔ وہ اندھی ہو رہی ہے رو رو کر۔''

میرے پاس ان باتوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔ بس دل میں صرف ایک تسلی سی تھی کہ میں بے گناہ ہوں۔ میں مر بھی گیا تو قیامت کے روز میرا نام عزتیں لوٹنے والوں اور بدکاروں کے ساتھ نہیں لکھا جائے گا اور ماں کو اس دنیا میں شرمندگی اٹھانا بھی پڑی تو اگلے جہان میں اُس کا سر فخر سے ضرور بلند ہوگا۔

میری اور ایس پی صاحب کی گفتگو جاری تھی کہ یکا یک تھانے میں سپاہیوں کی ایڑیاں بج اٹھیں۔ ایس پی صاحب نے بھی گردن گھما کر دیکھا اور وہ غیر ارادی طور پر اٹین شین ہوگئے۔ بھاری قدموں کی ٹھک ٹھک سنائی دی۔ پانچ چھ آدمی حوالات کی طرف آ رہے تھے۔ پھر مجھے اڈیشنل سیکرٹری اگروال کی صورت نظر آئی۔ عقب میں ایک وکیل فائلیں لئے آ رہا تھا۔ اس کے پیچھے بھی تین چار آدمی تھے۔ تھانیدار کے حکم پر سنتری نے چابیوں کا وزنی گچھا نکالا اور بھاگ کر حوالات کا دروازہ کھول دیا۔ میرے علاوہ ایس پی صاحب اور دیگر عملہ حیرت سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اگروال ان لوگوں میں سے تھا جن کے چہرے سے ان کی دلی کیفیت کا اندازہ لگانا مشکل ہوتا ہے۔ مجھے اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ اس وقت یہاں اگروال کی آمد کیا معنی رکھتی ہے۔ شاید ایک بار پھر مجھے ٹھوکریں پڑنے والی تھیں...... پھر میری آنکھوں نے وہ منظر دیکھا جس کی میں کبھی توقع نہیں کرسکتا تھا۔ اڈیشنل سیکرٹری اگروال آگے بڑھا اور ہر قانون قاعدے کو نظر انداز کر کے مجھ سے بغل گیر ہوگیا۔ اس کی جذباتی سرگوشی میرے کان میں گونجی۔

"مجھے معاف کر دو بیٹا...... مجھے معاف کر دو۔"

حالانکہ عمروں میں بہت زیادہ فرق نہیں تھا مگر شدت جذبات میں وہ مجھے بیٹا کہہ رہا تھا۔ وہ قد میں مجھ سے چھوٹا تھا اس کی کھردری ڈاڑھی میری گردن سے رگڑ کھا رہی تھی۔ اس کا جسم ہولے ہولے لرز رہا تھا۔ "مجھے سب کچھ پتہ چل گیا ہے نواز خان، تم نردوش ہو، حوصلہ رکھو میں تمہیں کچھ نہیں ہونے دوں گا۔"

مجھ سے جدا ہو کر اس نے اپنے ساتھ آنے والوں کی طرف دیکھا۔ وہ سب سوالیہ نشان بنے ہرگھوش اگروال کی طرف دیکھ رہے تھے۔ میرے اندازے کے مطابق ان میں ایک دو اخبار کے آدمی بھی تھے۔ اگروال ان سب کو لے کر تھانیدار کے دفتر میں آ گیا۔ میں بھی ساتھ تھا۔ مجھے بڑی عزت سے اپنے ساتھ والی کرسی پر بٹھانے کے بعد اگروال نے اپنی ٹوپی اتار کر میز پر رکھی۔ کانپتے ہاتھوں سے ایک سگریٹ سلگایا اور اعلانیہ انداز میں بولا۔

"میری بیٹی نے ہوش میں آنے کے بعد جو بیان دیا ہے اس کے مطابق نواز خان کا اس

معاملے میں کوئی دوش نہیں۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں۔ میں ایک ذاتی کام کے سلسلے میں سری نگر میں تھا۔ کل دوپہر نواز خان مقدمے کے سلسلے میں مجھ سے ملنے کے لئے میری کوٹھی پہنچا۔ اتفاق سے اسی وقت واحدی عرف استاد لنگڑ بھی اپنے غنڈوں کے ہمراہ وہاں پہنچ گیا۔ درحقیقت واحدی محکمے کو ناقص مال سپلائی کر رہا تھا۔ اس کی تیار کردہ وردیوں کا کپڑا ہمارے معیار کے مطابق نہیں تھا۔ اسی بات پر چند روز پہلے واحدی سے میرا جھگڑا ہوا تھا اور میں نے اسے تھپڑ مار دیا تھا۔ اُس کینہ پرور شخص نے اس بے عزتی کا بدلہ لینے کے لئے یہ خوفناک جرم کیا۔ نواز خان نے جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کا راستہ روکنے کی ہر ممکن کوشش کی اور اس کوشش میں زخمی بھی ہوا۔ زخموں کے باوجود اس نے واحدی اور اس کے غنڈوں کا پیچھا کیا۔ واحدی ایک عمارت کی چھت پر چڑھ گیا نواز خان بھی اوپر پہنچا۔ یہاں واحدی نے نواز خان کو جان سے مارنے کی کوشش کی اور ناکام ہو کر ایک بار پھر بھاگ کھڑا ہوا مگر دو چھتوں کا درمیانی فاصلہ عبور کرتے ہوئے وہ بجلی کی تاروں پر گر کر ہلاک ہوگیا۔"

میں ہرگھوش اگروال کی باتیں سن سن کر حیران ہو رہا تھا اس نے کتنی تیزی سے رنگ بدلا تھا۔ وہ زبان جو کل تک میرے خلاف زہر اگل رہی تھی آج میری وکالت میں مصروف تھی۔ اس نے نہ صرف میری وکالت کی تھی بلکہ بڑی ذہانت سے اپنی اور اپنی بیٹی کی کمزوریوں کو بھی چھپا لیا تھا۔ اب میں یہ بات اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ ہرگھوش اگروال کی کایا پلٹ ہونے میں شکنتلا کے کسی بیان کا کوئی چکر نہیں۔ میری بے گناہی کا علم ہرگھوش اگروال کو بارہ چودہ گھنٹے پہلے ہی ہو چکا تھا۔ یقینی بات تھی شکنتلا کی سہیلی نے اسے سب کچھ بتا دیا تھا اس کے باوجود اس نے میرے خلاف پرچہ درج کرا دیا تھا۔ اب جو اس نے اپنا رویہ بدلا تھا تو اس کی وجہ کچھ اور تھی۔ جہاں تک بات میری سمجھ میں آئی تھی وہ اپنے ضمیر کی ملامت اور خلش سے مجبور ہوا تھا۔ اگر اس میں تھوڑی بہت بھی انسانیت تھی تو اسے ایسا کرنا ہی چاہئے تھا۔ میں نے شکنتلا کی بے راہ روی میں اس کا ساتھی نہ بن کر اور اس کی عزت وجان بچانے کی کوشش کر کے اگروال کے پتھروں کا جواب پھولوں سے دیا تھا اور دشمنی کی آگ میں جلنے والے کے لئے ایسا کرنا کوئی آسان کام نہیں ہوتا...... مجھے بے حد خوشی ہوئی کہ میں اگروال کے پتھریلے سینے میں انسانیت کا بیج بونے میں کامیاب رہا ہوں۔

اخبار سے تعلق رکھنے والے ایک شخص نے اگروال سے سوال کیا۔ "جناب! دو دن پہلے تک آپ کا خیال تھا کہ نواز خان ایک قاتل ذہن کا مالک ہے اور اس نے ایک مجبور عورت کی عزت داغدار کرنے کا جرم کیا ہے اور اب آپ اسے ایک دوسرے روپ میں پیش کر رہے

ہیں۔ کہیں یہ اس لئے تو نہیں کہ نواز خان نے آپ کی بیٹی کو بچانے کی کوشش کی ہے۔"

اگروال نے اپنی گنجی چندیا پر ہاتھ پھیرا اور ماہر سیاستدان کی طرح بولا۔ "بھائی! یہ معاملہ عدالت میں ہے، میں اس پر کوئی بحث نہیں کرنا چاہتا مگر جو حالات سامنے آئے ہیں ان سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ واحدی اور اُس کی بیوی اِس سے پہلے بھی قانون شکنی کرتے رہے ہیں۔ عین ممکن ہے کہ انہوں نے دانستہ طور پر نواز خان کو پھنسانے کی کوشش کی ہو۔"

سنگین صورتِ حال کے باوجود میں دل ہی دل میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ گرگٹ کو رنگ بدلتے سنا تو کئی بار تھا لیکن دیکھا پہلی بار تھا۔

☆======☆======☆

ایک ہفتے کے اندر اندر ہرگوش اگروال نے نہ جانے کیا چکر چلایا کہ اگلی پیشی پر مہتاب نے عدالت کے کٹہرے میں کھڑے ہو کر بیان دے دیا کہ وہ نواز خان پر اپنے الزامات واپس لیتی ہے اور خدا کو گواہ بنا کر کہتی ہے کہ نواز خان نے اس سے کسی قسم کی کوئی زیادتی نہیں کی۔ اس کے علاوہ نواز خان پر قاتلانہ حملے کا الزام بھی غلط ہے۔ مہتاب نے مزید کہا کہ یہ سب کچھ اس نے اپنے شوہر واحدی کے کہنے پر کیا تھا۔ وہ نواز سے پرانی دشمنی چکانا چاہتا تھا...... میں جانتا تھا یہ بیان بھی اگروال کی گنجی کھوپڑی سے نکلا ہے۔ واحدی کو بیچ میں لانے سے مہتاب کے جھوٹ کی شدت کچھ کم ہو گئی تھی۔ پھر بھی جھوٹ، جھوٹ تھا۔ جج نے مہتاب کو حراست میں لینے کا حکم دیا۔ میری ضمانت میں پہلے ہی مزید توسیع ہو چکی تھی۔ عدالت برخاست ہوئی تو میں نے مہتاب کو سپاہیوں کی نگرانی میں باہر نکلتے دیکھا۔ اس کے چہرے پر شرمندگی تھی اور نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔ وہ جانتی تھی میں چند گز کے فاصلے پر موجود ہوں پھر بھی اس نے آنکھ اٹھا کر میری طرف نہیں دیکھا۔ سچ کی فتح اور جھوٹ کی شکست کا یہ منظر دیدنی تھا۔

چند ہفتے کے اندر مجھ پر سے تمام مقدمات ختم ہو گئے۔ اس دوران شکنتلا بھی ہسپتال سے صحت یاب ہو کر واپس آ چکی تھی۔ اگروال کی دعوت پر میں ایک بار ان لوگوں سے ملنے بھی گیا۔ شکنتلا اپنے پچھلے رویے پر کچھ شرمندہ نظر آتی تھی۔ میں نے سوچا کہ اسے مزید شرمندہ نہ کیا جائے لہٰذا اگروال اور شکنتلا کی خواہش کے باوجود میں اس کے بعد کبھی ان کے گھر نہیں گیا۔ بقول شاعر۔

جس فسانے کو انجام تک لانا نہ ہو ممکن

آخر میں مَیں اس کیس کے بارے میں دو وضاحتیں ضرور کرنا چاہتا ہوں۔ قارئین کے

ذہن میں سوال ہوگا کہ شکنتلا کو جب میرا ایڈریس معلوم نہیں تھا تو اس نے چندر سنگھ کے پتے پر مجھ سے خط و کتابت کیسے شروع کی؟ دراصل ہوا یوں تھا کہ رات کے اندھیرے میں دیوار پھلاند کر جب میں اگروال صاحب کی کوٹھی میں کودا تھا تو میری جیب سے دو تین روپے اور کچھ کاغذات نیچے گر گئے تھے۔ ان میں ایک درخواست فارم بھی تھا جو میں نے ایک پرائیویٹ نوکری کے لئے پُر کیا تھا۔ اس پر میرا نام اور ایڈریس وغیرہ موجود تھے۔ یہ چیزیں شکنتلا کے ہاتھ لگی تھیں اور اس نے فارم کے ایڈریس پر خط لکھ مارا تھا۔ دوسری وضاحت یہ کہ مہتاب سے اگروال کے تعلقات پہلے سے نہیں تھے۔ یہ تعلقات اسی رات شروع ہوئے تھے جس رات وہ ٹوپی والا برقع پہن کر بذریعہ رکشہ اگروال کی کوٹھی پہنچی تھی اور اے ایس آئی نوازش علی نے اس کا پیچھا کیا تھا۔ وہ ایک دور دراز کے جاننے والے کا حوالہ دے کر اگروال سے واحدی کی رہائی میں مدد لینا چاہتی تھی۔ وہ آگ تھی اور اگروال پٹرول۔ دونوں کا ملاپ ہوا تو تنہائی میں آگ ہی آگ بھڑک گئی اور دو ڈھائی گھنٹے میں وہ دونوں شیر و شکر ہو گئے۔ میرے خلاف منصوبہ بندی ہوئی اور اگلے ہی روز مجھے دھر لیا گیا۔

آج بھی جب میں اخبار میں کوئی خبر پڑھتا ہوں کہ جوئے خانے پر چھاپہ مار کر اتنے قمار بازوں کو پکڑ لیا گیا اور داؤ پر لگی ہوئی اتنی رقم قبضے میں لے لی گئی تو مجھے واحدی کا چہرہ یاد آ جاتا ہے۔ وہ واحدی جسے ایک بُری عورت نے پہلوان سے قمار باز بنایا اور اسے برباد کرنے کے بعد خود بھی برباد ہوئی اور اس کے ساتھ ہی وہ چند مہینے بھی یاد آ جاتے ہیں جو میں نے ایک کرب ناک عذاب میں گزارے تھے۔

☆======☆======☆

آخری محبت

ایک نوجوان جسے اغوا کرلیا گیا۔ ایک لڑکی کی کہانی جوشادی شدہ ہونے کے باوجود کسی اور کی محبت کا شکار ہوگئی۔

ایسی کہانی جس کے تانے بانے سلجھنے کی بجائے الجھتے چلے گئے۔ انسپکٹر نوازخان نے اس کہانی کو کیسے سلجھایا۔

امرتسر کے محلے کٹڑہ کرم سنگھ میں اغوا کا ایک کیس ہوگیا۔ جسے اغوا کیا گیا تو وہ کوئی خوبصورت یا نازک کمزور عورت نہیں تھی، اٹھائیس سال کا ہٹا کٹا مرد وشوا ناتھ تھا۔ وشوا ناتھ جالندھر کے ایک نواحی گاؤں امرت پور کا رہنے والا تھا۔ یہاں امرتسر میں وہ ایک پرائیویٹ بس کمپنی کے دفتر میں ملازمت کرتا تھا اور کرائے کے مکان میں اکیلا رہتا تھا۔ وشوا ناتھ کو ورزش اور پہلوانی کا شوق تھا اس کے علاوہ وہ صبح کی سیر کے لئے بلا ناغہ گھر سے نکلتا تھا۔ وشوا ناتھ کے پڑوس میں اختر زماں نامی ایک بینک منیجر صاحب رہتے تھے۔ دونوں میں دوستی تھی۔ وشوا ناتھ کا معمول تھا کہ وہ صبح سویرے اختر زماں کے دروازے پر دستک دیتا تھا اور ساتھ ہی زور سے آواز لگاتا تھا۔ ''زماں صاحب۔''

زماں صاحب اکثر پہلے سے تیار ہوتے تھے۔ وہ باہر آتے تھے اور دونوں سیر کے لئے نکل جاتے تھے لیکن اس روز اختر زماں صاحب دیر تک انتظار کرتے رہے۔ آخر وہ گھر سے نکلے اور وشوا ناتھ کے دروازے پر دستک دی۔ یہ جان کر انہیں حیرانی ہوئی کہ دروازہ کھلا ہوا ہے۔ یعنی وشوا ناتھ جاگ چکا ہے، اس کے باوجود اس نے اختر زماں صاحب کو انتظار میں رکھا تھا۔ وہ وشوا ناتھ کو آواز دیتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ اچانک ان کی نگاہ وشوا ناتھ کی ایک چپل پر پڑی۔ برآمدے میں اوندھی پڑی تھی۔ چپل کے پاس ہی وشوا ناتھ کا اسکوٹر پہلو کے بل گرا ہوا تھا۔ اختر زماں صاحب کو خطرے کا احساس ہوا اور وہ وشوا ناتھ کو آوازیں دیتے ہوئے اندر کی طرف لپکے۔ اندرونی کمرے کی دہلیز پر انہیں خون کے دھبے نظر آئے۔ کمرے میں دیکھا تو افراتفری مچی ہوئی تھی۔ ایک کرسی ٹوٹ چکی تھی، تپائی الٹی ہوئی تھی۔ ایک فریم شدہ تصویر فرش پر گری پڑی تھی۔ تصویر کے پاس ہی بہت سا خون موجود تھا...... کمرے کا اکلوتا بلب چکنا چور تھا اور بلب کے ٹکڑوں کے درمیان ایک لاٹھی پڑی تھی۔ وشوا ناتھ گھر میں کہیں نہیں تھا۔

اختر زماں صاحب نے محلے داروں کو اس واقعے سے آگاہ کیا پھر دو معزز افراد کے ساتھ تھانے میں رپورٹ درج کرانے پہنچ گئے۔ رپورٹ میں حبیب نامی ایک شخص کو ملزم ٹھہرایا گیا۔ حبیب خان ایک قریبی آبادی رستم نگر کا رہنے والا تھا۔ رپورٹ میں لکھوایا گیا کہ حبیب خان اور وشواناتھ میں لین دین کا کوئی جھگڑا تھا اور اس سلسلے میں صرف تین دن پہلے بھرے بازار میں دونوں کے درمیان شدید لڑائی ہو چکی تھی۔ حبیب خان نے وشواناتھ پر چاقو نکال لیا تھا اور اسے قتل کرنے کی دھمکیاں دی تھیں۔ لوگوں نے بڑی مشکل سے ان میں بیچ بچاؤ کرایا تھا۔

موقعہ واردات ملاحظہ کرنے سے پہلے ہی میں نے اپنے سب انسپکٹر فرزند علی کو ملزم حبیب خان کی گرفتاری کے لئے بھیج دیا تھا۔ فرزند علی نے ایک گھنٹے بعد آ کر اطلاع دی کہ ملزم گھر میں موجود نہیں۔ اس کی بیوی بتاتی ہے کہ وہ کل دوپہر سے دکان کے لئے سودا لینے پشاور گیا ہوا ہے اس کی واپسی آج شام کسی وقت ہو گی۔ میرے پوچھنے پر سب انسپکٹر نے بتایا کہ حبیب خان خشک میوے کا کام کرتا ہے۔ امرتسر کے ایک بارونق علاقے میں اس کی کافی بڑی دکان ہے۔ یہ دکان اس نے کوئی آٹھ دس ماہ پہلے کھولی ہے۔ اس سے پہلے وہ جالندھر میں رہتا تھا۔

میں نے موقعے پر موجود لوگوں سے بیانات لئے ان میں ایک بیان بڑا اہم تھا۔ یہ بیان دینے والا ایک چھابڑی فروش یاسین تھا۔ یاسین سردیوں کی یخ بستہ راتوں میں گلی گلی گھوم کر انڈے اور ربڑی فروخت کرتا تھا۔ اُبلے ہوئے انڈے ایک ٹوکری میں ہوتے تھے اور ربڑی صندوقچی میں۔ وہ پیدل چلتا تھا اور آواز لگاتا جاتا تھا۔ ''ربڑی والا، گرم انڈے والا'' تھانے میں بیٹھے ہوئے میں نے بھی کئی بار اس کی آواز سنی تھی۔ یاسین نے بتایا۔

''جناب عالی! رات کو نو دس بجے کے لگ بھگ میں اس گلی سے گزر رہا تھا۔ بابو وشواناتھ کے مکان کے سامنے میں نے ایک موٹر رکشا کھڑا دیکھا۔ موٹر رکشا میں سے ایک لمبا چوڑا بندہ نکلا اور بابو وشواناتھ کے مکان میں چلا گیا۔ میں اس بندے کو پہچانتا ہوں۔ صرف تین دن پہلے اسی بندے سے بابو وشواناتھ کی لڑائی ہوئی تھی۔ دونوں نے ایک دوجے کو جان سے مار دینے کی دھمکیاں دی تھیں۔ اب یہ بندہ بابو وشواناتھ کے گھر میں چلا گیا تھا۔ میرے دماغ میں یہی آیا کہ دونوں میں صلح صفائی ہو چکی ہے اور لڑائی والا معاملہ رفع دفع ہو چکا ہے۔ پھر بھی دل میں شک سا ضرور تھا۔ پانچ دس منٹ گلی کی نکڑ پر کھڑا رہا لیکن جب مکان کے اندر سے لڑائی جھگڑے یا دنگے فساد کی آواز نہیں آئی تو آگے نکل گیا۔ فضل دین کی بیکری تک اپنا چکر

پورا کر کے میں واپس آیا تو بابو وشواناتھ کے گھر کے سامنے رکشا موجود نہیں تھا۔''

چھابڑی فروش یاسین کا یہ بیان حبیب خان کو ہتھکڑی لگانے کے لئے کافی تھا۔ اس بات کی تصدیق ہو چکی تھی کہ وشواناتھ کی گمشدگی میں حبیب خان کا ہاتھ ہے۔ وہ واردات کی رات وشواناتھ کے گھر میں گھسا۔ اس سے ہاتھا پائی کی۔ اسے شدید زخمی کیا۔ اس کے بعد دو صورتیں ہو سکتی تھیں۔ یا تو وہ وشواناتھ کو زندہ حالت میں اپنے ساتھ لے گیا تھا یا وشواناتھ اس سے جان بچا کر بھاگ گیا تھا اور اس کے خوف سے اب تک کہیں روپوش تھا۔ تھانے واپس آنے سے پہلے میں نے قرب و جوار کا اچھی طرح جائزہ لیا۔ اس جائزے میں مجھے ایک اہم چیز نظر آئی۔ گھر سے باہر نیم پختہ گلی میں کسی گاڑی کے ٹائروں کے نشانات تھے۔ ان نشانات کو غور سے دیکھنے پر اندازہ ہوا کہ گاڑی کا ایک اگلا ٹائر غیر معمولی طور پر گھسا ہوا ہے اور نسبتاً چوڑا بھی ہے۔ میں نے یہ نشانات ذہن میں محفوظ کر لئے۔

ہم نے رات گئے تک حبیب خان کا انتظار کیا لیکن وہ نہیں آیا۔ اس کی تلاش زور و شور سے جاری تھی لیکن ابھی تک کوئی کھوج نہیں ملا تھا۔ حبیب خان کا کھوج اگر کسی سے لگ سکتا تھا تو وہ اس کی بیوی تھی لیکن وہ کچھ بتانے پر آمادہ نہیں تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ اسے اس کے سوا اور کچھ معلوم نہیں کہ اس کا شوہر دکان کے لئے سامان خریدنے پشاور گیا ہوا ہے۔ میں نے حبیب خان کے گھر جا کر اس کی بیوی سے ملاقات کی۔ حبیب خان کا چھوٹا سا گھر کرائے کا تھا لیکن اسے خوب اچھی طرح بنایا سنوارا گیا تھا اور در و دیوار کو دیکھتے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ گھر والی سلیقہ شعار اور سمجھ بوجھ والی ہے۔ حبیب خان کی بیوی کی عمر ستائیس سال کے لگ بھگ تھی۔ وہ بھرے بھرے جسم کی ایک دراز قد جاذب نظر عورت تھی۔ اس نے گھونگھٹ نکال رکھا تھا، تاہم چند روز بعد جب میں نے اس کا چہرہ دیکھا تو پتہ چلا کہ اس کی صورت بھی جسم کی طرح دلکش ہے اور اسے صحیح معنوں میں ایک بھرپور عورت قرار دیا جا سکتا ہے۔

عورت نے اپنا نام شاہینہ بتایا۔ اس نے کہا کہ حبیب خان سے اس کی شادی قریباً پانچ برس پہلے ہوئی تھی۔ ابھی تک ان دونوں کا کوئی بچہ نہیں تھا۔ وہ چترال کے رہنے والے تھے اور کوئی دو برس پہلے روزگار کی تلاش میں پنجاب آ گئے تھے۔ پہلے جالندھر میں رہے اور وہاں حبیب خان محنت مزدوری کرتا رہا، پھر وہ امرتسر آ گئے اور یہاں حبیب خان نے خشک فروٹ کی دکان کھول لی۔ یہ کام چل نکلا تھا اور اب حبیب خان کو دکان کے لئے سودا لینے اکثر پشاور جانا پڑتا تھا۔

میں نے شاہینہ سے پوچھا۔ ''بابو وشواناتھ اور حبیب خان کے جھگڑے کے بارے میں

تمہیں کیا معلوم ہے؟''

وہ اپنی مترنم آواز میں بولی۔'' کچھ بھی معلوم نہیں۔ میرا خاوند باہر کی باتیں گھر میں نہیں کیا کرتا۔ میں تو وشوانا تھ کا نام بھی پہلی بار سن رہی ہوں۔''

میں نے کہا۔'' تمہارے خاوند کا کہنا ہے کہ اس نے وشوانا تھ سے کوئی رقم لینی ہے۔ کیا رقم کے بارے میں اس نے کبھی کوئی بات نہیں کی؟''

وہ بولی۔''رقم کے بارے میں تو مجھے پتہ نہیں۔ بس اس نے ایک دو بار یہ ضرور کہا تھا کہ اس کا ہاتھ بہت تنگ ہے۔ کاروبار کے لئے پیسے کی ضرورت ہے اور جن لوگوں سے پیسے ملنے ہیں وہ دے نہیں رہے۔''

میں نے پوچھا۔'' تمہارا ذاتی خیال کیا ہے...... یہ بات اب ڈھکی چھپی نہیں کہ حبیب خان نے تم سے جھوٹ بولا تھا کہ وہ پشاور جا رہا ہے۔ وہ کل رات دس گیارہ بجے تک یہیں امرتسر میں تھا اور اسے بابو وشوانا تھ کے گھر کے پاس دیکھا گیا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس نے وشوانا تھ کو رقم کے لئے اغوا کر لیا ہو......''

وہ زور زور سے انکار میں سر ہلانے لگی۔ اس کا سارا جسم جیسے لرز اٹھا تھا۔ ہراساں لہجے میں بولی۔''نہیں ایسا نہیں ہو سکتا تھانیدار صاحب! وہ اب بالکل بدل گیا ہے صرف اپنے کام سے کام رکھتا ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتی ہوں۔ بڑی سے بڑی قسم کھا سکتی ہوں۔ وہ ایسی بات سوچ بھی نہیں سکتا۔''

بے خبری میں شاہینہ کے منہ سے ایک ایسی بات نکل گئی تھی جس نے مجھے چونکا دیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ اس کا شوہر اب بالکل بدل گیا ہے۔ یعنی پہلے وہ اچھا نہیں تھا، اب اچھا ہو گیا ہے۔ اپنی طرف سے شاہینہ نے شوہر کی صفائی پیش کی تھی لیکن اس صفائی نے حبیب خان کو اور مشکوک کر دیا تھا۔

☆======☆======☆

اگلے روز شام چھ بجے کے قریب ہم نے حبیب خان کو لاری اڈے سے گرفتار کر لیا۔ اس کے ساتھ تین عدد بورے تھے جن میں وہ پشاور سے خشک میوہ از قسم بادام، اخروٹ، چلغوزہ اور کشمش وغیرہ بھر کر لایا تھا۔ حبیب خان کی عمر تیس سال کے قریب تھی لیکن صحت اچھی تھی قد کاٹھ اور نین نقش بھی اچھے تھے۔ گھونگھریالے بالوں اور بادامی آنکھوں کے ساتھ وہ ایک دلکش شخص تھا۔ اپنی گرفتاری پر وہ حیران پریشان نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے تند و تیز لہجے میں سب انسپکٹر فرزند علی سے پوچھا کہ اس کا قصور کیا ہے۔ فرزند علی نے کہا۔'' گھبراؤ

نہیں۔ تھانے چل کر تمہارے ہر سوال کا جواب دیا جائے گا۔''

حبیب خان نے پہلے تو کچھ بھی بتانے سے انکار کیا لیکن جب سب انسپکٹر فرزند علی نے تھانیداری لہجے میں پوچھا اور آنکھیں دکھائیں تو اس نے تسلیم کر لیا کہ وہ پشاور کے لئے پرسوں نہیں کل روانہ ہوا تھا۔ پرسوں رات ساڑھے نو بجے کے لگ بھگ وہ وشوانا تھ سے ملنے اس کے گھر واقع کٹڑہ کرم سنگھ گیا تھا۔ وہاں ان دونوں کی تکرار ہوئی جو بعد میں مار کٹائی کی شکل اختیار کر گئی۔ وشوانا تھ کے ہاتھ میں لاٹھی تھی جب کہ وہ خود چاقو سے مسلح تھا۔ اس کے چاقو کا ایک وار وشوانا تھ کے کندھے پر لگا۔ جواب میں وشوانا تھ نے اس کی کمر پر دو زوردار لاٹھیاں ماریں۔ تیسری لاٹھی وہ سر پر مارنا چاہتا تھا لیکن وہ چھت کے بلب سے ٹکرائی اور کمرے میں گہرا اندھیرا چھا گیا۔ اتنے میں کوئی باہر کا دروازہ زور زور سے بجانے لگا۔ حبیب خان نے سمجھا کہ وشوانا تھ کی چیخ و پکار سن کر محلے دار اکٹھے ہو گئے ہیں۔ وہ کمرے کی کھڑکی سے کود کر نکلا اور عقبی دیوار پھاند کر گلی میں پہنچ گیا۔ یہاں سے ایک چھوٹا سا چکر کاٹ کر وہ سامنے والے حصے کی طرف آ گیا۔ دروازے کے سامنے وہی موٹر رکشا کھڑا تھا جس پر وہ یہاں پہنچا تھا۔ وہ رکشے میں بیٹھا اور وہاں سے نکل آیا۔

میں نے اس کی بات مکمل توجہ سے سنی۔ اس روئیداد کے آخری حصے پر یقین کرنا میرے لئے ممکن نہیں تھا۔ اگر حبیب خان وشوانا تھ کو مضروب چھوڑ کر وہاں سے نکل آیا تھا تو پھر وشوانا تھ کہاں گیا؟ حبیب خان نے اس کے گھر میں گھس کر اسے زخمی کیا تھا اور پھر بھاگ نکلا تھا۔ وشوانا تھ کو اس سے چھپنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ وہ سیدھا تھانے پہنچتا اور حبیب خان کے خلاف رپٹ درج کراتا۔ حالات سے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ حبیب خان، وشوانا تھ کو چھوڑ کر نہیں گیا۔ اس نے زخمی وشوانا تھ کو رکشا میں ڈالا اور اپنے ساتھ کسی نامعلوم جگہ پر لے گیا۔ بعض پٹھان حضرات اپنے قرضوں کی وصولی کے لئے اکثر اس طرح کی کارروائیاں کرتے ہیں لہٰذا حبیب خان پر میرا شک پختہ ہوتا جا رہا تھا۔

میں نے ایک طرف تو حبیب خان سے پوچھ گچھ جاری رکھی، دوسری طرف سب انسپکٹر فرزند کو ہدایت کی کہ وہ جالندھر چلا جائے اور وہاں سے حبیب خان کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرے۔ درحقیقت میرا ذہن بار بار شاہینہ کے اس فقرے کی طرف جا رہا تھا جس میں اس نے اپنے خاوند کے سدھر جانے کا دعویٰ کیا تھا۔ اس دعوے سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ حبیب خان کا ماضی کوئی ایسا قابلِ رشک نہیں رہا۔ امرتسر میں آئے ہوئے ابھی اسے صرف آٹھ دس ماہ ہی ہوئے تھے اور لوگ اس کے بارے میں زیادہ کچھ نہیں جانتے

تھے۔ مجھے امید تھی کہ جالندھر سے اس کے بارے میں اہم معلومات حاصل ہو سکیں گی۔

سب انسپکٹر فرزند علی کی واپسی چار روز بعد ہوئی۔ وہ اپنے ساتھ ایک ادھیڑ عمر شخص کے علاوہ ایک چھوٹی سی فائل بھی لے کر آیا تھا۔ یہ فائل جالندھر کے ایک نواحی تھانے کے سب انسپکٹر سے فرزند علی کو ملی تھی۔ اس فائل میں حبیب خان کی ایک تصویر بھی لگی ہوئی تھی۔ اس فائل کے مندرجات سے یہ انکشاف ہوا کہ قریباً ڈیڑھ برس پہلے حبیب خان ایک ڈکیتی میں ملوث رہا ہے۔ یہ ڈکیتی ایک سوبھاش ناتھ نامی زمیندار کے گھر میں ہوئی تھی۔ حبیب خان اپنے ایک ساتھی کے ساتھ مسلح ہو کر سوبھاش کے گھر میں گھسا تھا۔ اہل خانہ کو جان سے مارنے کی دھمکیاں دی تھیں اور انہیں رسیوں سے جکڑ کر ایک کمرے میں بند کر دیا تھا۔ بعدازاں وہ گھر سے چار تولے سونا، دس تولے چاندی اور پانچ چھ سو روپیہ نقد نکال کر لے گیا تھا۔ بعدازاں حبیب خان کو گرفتار کر لیا گیا تھا۔ حبیب خان نے اپنے بیان میں کہا تھا کہ اس نے ڈکیتی کی واردات نہیں کی۔ اس نے سوبھاش ناتھ سے چار ہزار روپیہ لینا تھا۔ جو وہ بار بار کے تقاضے کے باوجود نہیں دے رہا تھا۔ وہ اپنی رقم مانگنے کے لئے سوبھاش ناتھ کے گھر گیا تھا۔ سوبھاش ناتھ نے اسے ڈکیتی کا رنگ دے دیا۔ حبیب خان نے اس الزام سے بھی صاف انکار کر دیا تھا کہ اس نے سوبھاش کے گھر سے زیورات یا نقد رقم لوٹی ہے۔

فائل سے اس کیس کی جو تفصیلات معلوم ہوئیں ان کے مطابق سیشن کورٹ میں حبیب خان پر کیس چلا تھا۔ چند پیشیوں کے بعد حبیب خان کی ضمانت ہو گئی تھی، یہ کیس ابھی تک چل رہا ہے۔

دونوں کیس بہت ملتے جلتے نظر آ رہے تھے۔ تازہ ترین کیس میں حبیب خان نے وشوا ناتھ کے گھر میں گھس کر مار کٹائی کی تھی اور دعویٰ کیا تھا کہ وشوا ناتھ نے اس کی رقم دینی ہے...... ڈیڑھ برس پہلے جالندھر میں ہونے والے کیس میں بھی وہ اسی طرح ایک گھر میں گھس گیا تھا اور یہ دعویٰ کیا تھا کہ صاحبِ خانہ نے اس کی رقم دینی ہے۔ دفعتاً مجھے ایک شک گزرا۔ میں نے رجسٹرار سے وہ رپورٹ منگوائی جو چند روز پہلے حبیب خان کے خلاف میرے تھانے میں درج ہوئی تھی۔ اس رپورٹ میں اغوا ہونے والے وشوا ناتھ کا نام بمعہ ولدیت کے لکھا تھا۔ میں نے وشوا ناتھ کی ولدیت دیکھی تو پوری بات میری سمجھ میں آ گئی۔ اس کے والد کا نام سوبھاش ناتھ تھا۔ یعنی یہ دونوں کیس ایک ہی سلسلے کی کڑی تھے۔

سب انسپکٹر جس ادھیڑ عمر شخص کو جالندھر سے اپنے ساتھ لے کر آیا تھا اس کا نام عیسیٰ خان تھا۔ وہ امرت پور کی مسجد کا پیش امام تھا۔ عیسیٰ خان کے پاس حبیب خان کے بارے میں

نہایت اہم معلومات تھیں۔ اس کے علاوہ وہ اس جھگڑے کے بارے میں بھی سب کچھ جانتا تھا جو دو برس سے سوبھاش ناتھ اور حبیب خان کے درمیان چلا آ رہا ہے۔ عیسیٰ خان نے حبیب خان کے بارے میں پہلا انکشاف تو یہ کیا کہ شاہینہ اس کی منکوحہ بیوی نہیں بلکہ داشتہ ہے۔ وہ اسے نکال کر لایا ہوا ہے اور حبیب خان کی داشتہ بننے سے پہلے شاہینہ شادی شدہ اور بال بچے دار عورت تھی۔ اس نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ ”تھانیدار صاحب! یہ کہانی آج سے قریباً چھ برس پہلے شروع ہوئی تھی۔ شاہینہ چترال کی ایک دادی کی رہنے والی ہے۔ اس کے گاؤں کا نام پاوالندے ہے۔ چھ سال پہلے شاہینہ کی شادی اپنے ہی گاؤں کے ایک نظیر بادشاہ نامی شخص سے ہوئی۔ نظیر بادشاہ لکڑی کا کاروبار کرتا تھا اور خوشحال شخص تھا۔ اگر نظیر بادشاہ شادی کے بعد گاؤں ہی میں رہتا اور اپنا کاروبار کرتا رہتا تو شاید یہ کہانی شروع ہی نہ ہوتی۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ نظیر بادشاہ ایک ایسے گھرانے سے تھا جو جھاڑ پھونک اور ٹونے ٹوٹکوں پر ضرورت سے زیادہ یقین رکھتا تھا۔ نظیر بادشاہ کا عقیدہ بھی ایسی باتوں پر بہت پختہ تھا۔

ایک خاص بات یہ تھی کہ نظیر بادشاہ کے بہت سے قریبی رشتے دار 35 سال کی عمر تک پہنچنے سے پہلے پہلے فوت ہو چکے تھے۔ ان میں نظیر بادشاہ کے دو بھائی، والد اور تایا وغیرہ بھی تھے۔ نظیر بادشاہ کے دل میں یہ بات بیٹھی ہوئی تھی کہ وہ بھی تیں پینتیس سال سے زیادہ عمر نہیں پائے گا۔ اسے کسی پیر صاحب نے بتایا ہوا تھا کہ اگر وہ جواں مرگی کی نحوست سے نکلنا چاہتا ہے تو اپنا آبائی علاقہ اور کاروبار چھوڑ کر کہیں نکل جائے۔ نظیر بادشاہ اکثر اس بارے میں سوچتا رہتا تھا۔ اس طویل سوچ بچار کا نتیجہ یہ نکلا کہ شادی کے صرف ایک برس بعد وہ چترال چھوڑ کر پنجاب میں آ گیا اور یہاں جالندھر کے نواحی گاؤں امرت پور میں رہائش اختیار کر لی۔ امرت پور میں رہنا اس نے یوں بھی پسند کیا کہ دیہی علاقہ ہونے کے باوجود یہاں بجلی تھی اور نظیر بادشاہ جو نیا کاروبار شروع کرنا چاہتا تھا اس کے لئے بجلی کا ہونا ضروری تھا۔ ویسے بھی امرت پور ایک خوبصورت اور سرسبز جگہ ہے۔

نظیر بادشاہ کے پاس نقد رقم موجود تھی۔ اس نے پہلے امرت پور میں ایک بنی بنائی حویلی خریدی پھر ایک احاطہ بھی لے لیا۔ اس احاطے میں اس نے بجلی سے چلنے والا کولہو لگایا اور تیل بیچنے کا کام شروع کر دیا...... جناب! ہمارے علاقے میں یہ بجلی سے چلنے والا پہلا کولہو تھا۔ اس کولہو کا تیل صاف اور اچھا ہوتا تھا۔ قیمت بھی مناسب ہوتی تھی۔ جلد ہی نظیر بادشاہ کا کام چل نکلا۔ وہ سرسوں، بنولا اور تلوں کے علاوہ کئی قسم کا تیل تیار کرتا تھا۔ کام جب پھیل گیا تو اس نے اپنے مختلف تیل چھوٹے چھوٹے کنستروں اور بوتلوں میں بھرنے شروع کر دیئے اور

اردگرد کے شہروں میں سپلائی کرنے لگا...... شاید آپ نے بھی کسی ڈبے یا بوتل پر ''بادشاہ کمپنی'' کا نام پڑھا ہو۔''

میں نے کبھی کوئی ایسا نام نہیں پڑھا تھا۔ بہر حال میں نے ضروری سمجھا کہ ادھیڑ عمر عیسیٰ خان کے سوال کا جواب ''ہاں'' میں دے دیا جائے۔ عیسیٰ خان اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔

''نظیر بادشاہ کا کام پھیلا تو اسے کام کرنے والوں کی ضرورت پڑی۔ اس نے گاؤں سے کچھ آدمی لئے۔ اس کے علاوہ دو آدمی چترال سے بھی منگوائے...... چترال سے آنے والوں میں یہ حبیب خان بھی تھا۔ یہ نظیر بادشاہ کا دور کا رشتے دار تھا۔ آپ نے دیکھا ہی ہے، اونچا لمبا خوبصورت جوان ہے۔ ڈھائی تین سال پہلے اور بھی گھبرو اور گورا چٹا تھا۔ وہ کافی عرصہ لاہور میں رہا تھا اس لئے ٹوٹی پھوٹی پنجابی بھی بول لیتا تھا۔ نظیر بادشاہ نے اسے سپلائی کے کام پر لگایا۔ وہ مال لے کر اردگرد کے قصبوں اور دیہات میں جانے لگا۔ باتیں کرنی حبیب خان کو خوب آتی تھیں۔ ہنس مکھ اور ملنسار بھی تھا۔ اس نے نظیر بادشاہ کے کاروبار کو بہت فائدہ پہنچایا لیکن اس سے نظیر بادشاہ کو ایک نقصان بھی پہنچا......

آپ نے دیکھا ہی ہے نظیر بادشاہ کی بیوی خوبصورت اور گل بات والی ہے۔ حبیب خان کا اکثر نظیر بادشاہ کے گھر آنا جانا تھا۔ وہ نظیر بادشاہ کی بیوی کے چکر میں پڑ گیا۔ اس کی شادی کو تین سال ہو چکے تھے اور وہ دو بچیوں کی ماں تھی لیکن بن بیاہی لگتی تھی۔ دوسری طرف حبیب خان پر بھی جوانی ٹوٹ کر برس رہی تھی۔ اس نے بڑی محنت سے نظیر بادشاہ کی بیوی پر ڈورے ڈالنے شروع کر دیئے۔ پہلے تو شاہینہ (نظیر بادشاہ کی بیوی) اپنا آپ بچانے کی کوشش کرتی رہی لیکن آخر عورت تھی اور آپ کو پتہ ہی ہے عورت کی عقل گت (چوٹی) میں ہوتی ہے، وہ آہستہ آہستہ پھسلنا شروع ہو گئی۔ ہو سکتا ہے کہ اس میں کچھ قصور نظیر بادشاہ کا بھی ہو، وہ جالندھر آنے کے بعد اپنے کاروبار میں اس طرح مگن ہو گیا تھا کہ اور اسے کچھ یاد ہی نہیں رہا تھا۔ چار چار دن گھر ہی نہیں جاتا تھا۔ آپ کو پتہ ہی ہے عورت خوبصورت اور جوان ہو تو دولت سے زیادہ اپنے شوہر کی توجہ مانگتی ہے۔ شاہینہ بھی توجہ مانگتی تھی۔ یہ توجہ اسے شوہر سے تو نہ ملی مگر حبیب خان سے مل گئی لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی کہ وہ دو بچیوں کی ماں ہے، اس کا شوہر ہے، گھر ہے کسی غیر مرد کی طرف دیکھنے کی اجازت اسے نہ خدا دیتا ہے اور نہ دنیا...... سوچ بچار کے بعد اس نے حبیب خان سے تعلق بالکل ختم کر لیا اور اپنے شوہر سے بھی کہا کہ وہ حبیب خان کو گھر میں نہ بھیجا کرے۔ کہیں یہ نہ ہو کہ لوگوں کو انگلیاں اٹھانے کا موقع

مل جائے۔

نظیر بادشاہ نے بیوی کی بات ہنس کر ٹال دی۔ اسے یہ خبر نہیں تھی کہ اندر ہی اندر کیا کھچڑی پک رہی ہے اور حبیب خان اپنی لچھے دار باتوں سے کس طرح شاہینہ کو اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔ حبیب خان ہوشیار چالاک شخص تھا لیکن شاہینہ کے چکر میں بُری طرح پھنس چکا تھا۔ اس کے دماغ پر ہر وقت شاہینہ ہی کا بھوت سوار رہتا تھا۔ یہ جانتا تھا کہ گناہ کر رہا ہے لیکن پھر بھی باز نہیں آ رہا تھا۔ شاید باز آ جانا اس کے بس میں ہی نہیں رہا تھا۔ انہی دنوں اس نے باقاعدگی سے نماز بھی پڑھنا شروع کر دی تھی۔ میں اکثر اسے مسجد میں دیکھتا تھا۔ ایک رات عشاء کی نماز کے بعد میرے حجرے میں آ گیا۔ کہنے لگا امام صاحب! میں بڑا گناہ گار بندہ ہوں۔ میرے دماغ میں ایک ایسی عورت کا خیال آ گیا ہے جو شادی شدہ ہے اور دو بچوں کی ماں بھی ہے۔ مجھے اس کا کوئی حل بتائیں۔''

میں نے اسے ایک حدیث سنائی اور بتایا کہ جب کسی غیر عورت کو دیکھ کر کسی کے دل میں بدخیال پیدا ہو تو اسے اپنی بیوی کے پاس جانا چاہئے۔ یوں اس کے دل کو اطمینان نصیب ہو گا۔''

وہ بولا۔ ''امام صاحب! میری تو ابھی شادی نہیں ہوئی۔''

میں نے کہا۔ ''تو شادی کرو۔''

وہ بولا۔ ''میں نے کچھ رقم تو اکٹھی کر رکھی ہے لیکن اگر شادی کر لی تو پھر روزگار کا کیا ہو گا۔ میں چاہتا ہوں کہ اس رقم کو کسی کاروبار میں لگاؤں۔ کاروبار جم جائے تو پھر شادی کر لوں۔''

میں نے کہا۔ ''جیسا تم مناسب سمجھو لیکن اپنی کسی مجبوری کو اللہ کے حکم کی خلاف ورزی کرنے کے لئے بہانہ مت بنانا۔'' وہ چلا گیا۔ اس نے مجھ سے کھل کر بات نہیں کی تھی لیکن نہ جانے کیوں مجھے شبہ ہو رہا تھا کہ وہ جس شادی شدہ عورت کی بات کر کے گیا ہے وہ نظیر بادشاہ کی بیوی ہی ہے۔ مہینے ڈیڑھ مہینے بعد حبیب خان نے پھر مجھ سے ملاقات کی۔ کہنے لگا۔

''امام صاحب! میں اپنا کاروبار کرنا چاہتا ہوں۔ میرے پاس اتنے پیسے ہیں کہ بجلی سے چلنے والا کولہو لگا سکتا ہوں، لیکن میں اپنے محسن نظیر بادشاہ کے مقابلے پر آنا نہیں چاہتا۔ وہ تیل کا کام کر رہے ہیں اور اردگرد کے سارے علاقے میں اس کا سودا بکتا ہے۔ اگر میں بھی تیل کا کام کروں گا تو یہ اچھا نہیں ہو گا۔ لوگ کہیں گے کہ نوکر، مالک کے مقابلے میں کھڑا ہو گیا ہے۔ میں نے سوچا ہے کہ چوہدری سوبھاش ناتھ کے ساتھ مل کر نہر والے دو باغوں کا ٹھیکہ لے

لوں۔ پچھلی دفعہ پٹواری کو اس کام میں بہت فائدہ ہو چکا ہے۔"

میں نے کہا۔ "پتر جی! میں اس کام میں تمہیں کیا مشورہ دے سکتا ہوں۔ اپنی تو ساری حیاتی مسجد میں گزری ہے۔ بہر حال رزق حلال کمانے والے کا ساتھ اللہ بھی دیتا ہے۔ تم اگر مناسب سمجھتے ہو تو کام شروع کر دو۔"

مجھے لگ رہا تھا کہ حبیب خان راہِ راست پر آ رہا ہے...... تین چار مہینے اسی طرح گزر گئے، پھر پتہ چلا کہ چوہدری سوبھاش ناتھ اور حبیب خان میں لین دین کا کوئی جھگڑا ہے۔ حبیب خان کہتا ہے کہ اس نے سوبھاش ناتھ کے ساتھ ساجھے داری میں کام شروع کیا تھا۔ سوبھاش ناتھ نے کہا تھا کہ وہ دونوں مل کر نہر والے باغوں کا ٹھیکہ لیں گے۔ حبیب خان نے اس سلسلے میں سوبھاش ناتھ کو چار ہزار روپے نقد دیئے تھے۔ سوبھاش ناتھ یہ رقم ہڑپ کر گیا ہے اور حبیب خان کو الٹا تھانے کچہری کی دھمکیاں دیتا ہے۔ دوسری طرف سوبھاش ناتھ کہتا تھا کہ حبیب خان جھوٹا ہے۔ اس نے مجھے ایک کوڑی نہیں دی۔ صرف ایک باغ کے مالک کو اس نے ڈیڑھ ہزار روپیہ اپنی ذمے داری پر دیا تھا جو وہ واپس نہیں کر رہا۔

یہ جھگڑا ابھی چالو ہی تھا کہ امرت پور میں ایک اور افواہ گردش کرنے لگی۔ پتہ چلا کہ نظیر بادشاہ کا اپنی بیوی سے زبردست جھگڑا چل رہا ہے۔ ان میں بول چال بند ہے اور نظیر بادشاہ ہفتوں سے گھر کی بجائے کارخانے میں سوتا ہے۔ دو ہفتے پہلے پڑوسیوں نے ان کے گھر سے نظیر بادشاہ کے گرجنے برسنے کی آوازیں بھی سنی تھیں۔ اس ازدواجی جھگڑے کی وجہ یہ بیان کی جا رہی تھی کہ نظیر بادشاہ نے اپنی گھر والی کو حبیب خان کے ساتھ قابلِ اعتراض حالت میں دیکھا ہے۔ اب یہ "قابلِ اعتراض حالت" کیا تھی اس کے بارے میں بھی کئی طرح کی چہ مگوئیاں تھیں۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ حبیب خان نے شاہینہ کو کوئی خط وغیرہ دینے کی کوشش کی تھی۔ کچھ بات کو بڑھا چڑھا کر بیان کر رہے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ شاہینہ اور حبیب خان ایک کمرے میں بند تھے، اوپر سے نظیر بادشاہ آ گیا۔ اسے دیکھ کر حبیب خان تو بھاگ گیا جبکہ شاہینہ کو نظیر بادشاہ نے سخت بُرا بھلا کہا اور تھپڑ مارے۔ تاہم ایک دو افراد ایسے بھی تھے جن کا کہنا تھا کہ یہ بالکل معمولی سی بات تھی اور اس بات پر نظیر بادشاہ کو اس قدر مشتعل نہیں ہونا چاہئے تھا۔ امرت پور کے نواح میں ایک میلہ تھا۔ شاہینہ اپنی ایک سہیلی کے ساتھ اس میلے میں گئی تھی۔ گود والی بچی بھی اس کے ساتھ تھی۔ وہیں پر حبیب خان بھی پہنچا ہوا تھا۔ شاہینہ اور حبیب خان کچھ دیر میلے میں اکٹھے گھومتے پھرتے رہے۔ اتفاقاً نظیر بادشاہ نے انہیں دیکھ لیا۔ اس نے میلے میں تو کوئی بات نہیں کی لیکن جب شاہینہ گھر پہنچی تو اسے بُرا بھلا کہا۔ بس اتنی

سی بات تھی جس کا بتنگڑ بنا لیا گیا۔

معلوم نہیں ان میں سے کون سی بات سچی تھی لیکن یہ حقیقت تھی کہ حبیب خان کی وجہ سے نظیر بادشاہ اور شاہینہ کا نازک رشتہ خطرے میں پڑ گیا تھا۔ اس واقعے کے بعد مجھے حبیب خان کے بارے میں کوئی اچھی خبر نہیں ملی۔ وہ بُرے دوستوں میں بیٹھنے لگا تھا۔ یہ بھی پتہ چلا کہ نشہ وغیرہ کرنے لگا ہے۔ مسجد میں آنا تو اس نے کافی عرصہ پہلے چھوڑ دیا تھا۔ سرِ راہ مجھ سے ملاقات ہو جاتی تو نظر بچا کر گزر جاتا تھا۔ امرت پور میں یہ بات مشہور ہو چکی تھی کہ نظیر بادشاہ کی بیوی اور حبیب خان میں چکر ہے۔ غالباً بچیوں کی وجہ سے یہ رشتہ بچا ہوا تھا۔" امام عیسیٰ خان نے ایک لحہ توقف کر کے اپنی داڑھی میں انگلیاں پھیریں اور خیالات جمع کرتے ہوئے بولے۔ "اسی دوران ایک بہت اہم واقعہ ہو گیا۔ میرا اشارہ اسی ڈکیتی والی واردات کی طرف ہے۔ حبیب خان اپنے ایک ساتھی کے ساتھ مسلح ہو کر سوبھاش ناتھ کی حویلی میں گھس گیا۔ بعد ازاں پولیس نے اسے پکڑ لیا۔ حبیب خان نے بیان دیا کہ اس نے سوبھاش ناتھ سے رقم لینا تھی اور وہ رقم مانگنے اس کے پاس گیا تھا۔ سوبھاش ناتھ نے اس پر ڈکیتی کا پرچہ کرایا اور بتایا کہ حبیب خان نے اس کے اہلِ خانہ کو رسیوں سے جکڑا اور نقد رقم و زیورات لوٹ کر لے گیا۔

یہ پہلا الزام نہیں تھا جو حبیب خان پر لگا تھا۔ پچھلے پانچ چھ ماہ میں لڑائی، دنگا فساد اور پکڑ دھکڑ کے کئی الزامات اس پر آ چکے تھے۔ دوسرے معنوں میں وہ ایک غنڈے کے طور پر مشہور ہونا شروع ہو گیا تھا...... ڈکیتی کے کیس میں تین چار ماہ بعد اس کی ضمانت ہو گئی۔ ضمانت ہو جانے کے بعد وہ کچھ اور شیر ہو گیا۔ پھر ایک صبح امرت پور میں یہ حیران کن خبر سنی گئی کہ حبیب خان نے نیلا تھوتھا کھا کر خودکشی کی کوشش کی ہے۔ اسے نازک حالت میں جالندھر ہسپتال پہنچایا گیا جہاں ڈاکٹروں نے بمشکل اس کی جان بچائی۔ لوگ خودکشی کے اس واقعے کو حبیب اور شاہینہ کی عشق بازی سے جوڑ رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ حبیب خان نے شاہینہ کے غم میں یہ کوشش کی ہے اور لوگوں کے اندازے غلط بھی نہیں تھے...... جلد ہی ان اندازوں کی تصدیق ہو گئی۔ یہ عید الفطر کی بات ہے۔ میں نماز پڑھانے کے لئے عید گاہ جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ مدرسے کے ایک استاد نے مجھے بتایا کہ حبیب خان نظیر بادشاہ کی بیوی کو لے کر بھاگ گیا ہے۔

"انسپکٹر صاحب! جیسا کہ میں بتا چکا ہوں کہ نظیر بادشاہ اور حبیب خان دونوں کا تعلق چترال سے ہے۔ چترال کے کچھ دور دراز علاقوں میں کچھ عجیب قسم کی رسمیں پائی جاتی ہیں

خاص طور پر شادی بیاہ اور طلاق وغیرہ کے مسئلے یہ لوگ عجیب طریقے سے حل کرتے ہیں۔ یہ لوگ مذہب سے بہت دور ہیں اس لئے شراب نوشی، عشق بازی اور رقص وسرور جیسی لعنتیں ان لوگوں میں بہت عام ہیں۔ اکثر رنگین مزاج لوگ شادی شدہ عورتوں کے ساتھ عشق لڑانے سے بھی باز نہیں آتے۔ کبھی کبھی یہ عشق انتہا کو پہنچ جاتا ہے اور شادی شدہ عورت اپنے آشنا کے ساتھ بھاگ جاتی ہے لیکن اس واقعے کے بعد دشمنی اور قتل وغارت کی نوبت نہیں آتی۔ ان وادیوں میں یہ رواج ہے کہ بھاگ جانے والی عورت کا شوہر کسی طیش یا نفرت کا اظہار نہیں کرتا اور اپنی عورت کے اس فیصلے کو اکثر کھلے دل سے تسلیم کر لیتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ صبر شکر کر کے بیٹھ جاتا ہے۔ وہ اپنی سابقہ بیوی اور اس کے آشنا کو تلاش کرتا ہے۔ پھر بستی کے معزز لوگوں کو ساتھ لے کر ان کے گھر پہنچتا ہے اور اپنی بیوی کو بھگانے والے سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ ہرجانہ ادا کرے۔ اس ہرجانے کی رقم مختلف قبیلوں میں مختلف ہوتی ہے۔ عام طور پر شادی پر اٹھنے والے اخراجات کا حساب لگایا جاتا ہے اور اس سے دوگنا رقم اس شخص سے وصول کی جاتی ہے۔

اس رسم کے مطابق نظیر بادشاہ نے بھی صبر تحمل سے کام لیا اور اپنی بیوی کے بھاگ جانے پر تھانے میں رپورٹ درج کرائی اور نہ کوئی دوسری کارروائی کی...... چند روز تک بھاگ دوڑ کر کے اس نے امرتسر میں حبیب خان اور شاہینہ کا کھوج لگا لیا۔ نظیر بادشاہ نے چند افراد کو چترال سے بلایا اور ان کی موجودگی میں نظیر بادشاہ اور حبیب خان میں کوئی تصفیہ ہو گیا۔ ٹھیک سے تو پتہ نہیں لیکن خیال ہے کہ حبیب خان نے چار پانچ ہزار روپیہ نظیر بادشاہ کو دینا قبول کیا۔ دونوں بچیاں پہلے ہی نظیر بادشاہ کے پاس تھیں۔ اس نے انہیں چترال میں اپنے والدین کے پاس بھیج دیا...... اس کے بعد یہ معاملہ آہستہ آہستہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ امرت پور کے لوگوں کو نظیر بادشاہ کا فیصلہ کچھ عجیب سا لگا تھا لیکن آہستہ آہستہ وہ سمجھ گئے کہ بادشاہ کا یہ فیصلہ اپنے علاقے کے رسم ورواج کے مطابق تھا اور اگر وہ خود اپنے فیصلے پر شرمندہ نہیں تو انہیں کیا ضرورت پڑی ہے اس فیصلے میں کیڑے نکالنے کی...... اب ہم لوگ یہ واقعہ تقریباً بھول چکے تھے لیکن آپ کے بھیجے ہوئے سب انسپکٹر نے ایک بار پھر پرانی یادیں تازہ کر دی ہیں۔"

امام مسجد عیسیٰ خان اپنی بات مکمل کر کے خاموش ہو گیا۔ اس نے ایک مکمل کہانی بڑی تفصیل سے میرے سامنے بیان کر دی تھی۔ اس کہانی سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ شاہینہ حبیب خان کی بیوی نہیں ہے۔ وہ آٹھ نو ماہ پہلے اسے جالندھر کے نواحی قصبے امرت پور سے بھگا کر یہاں امرتسر شہر میں لایا تھا۔ دوسری بات یہ ثابت ہوتی تھی کہ رقم کے لین دین والا جھگڑا کافی

پرانا تھا اور اس جھگڑے کے سلسلے میں حبیب خان ایک دفعہ پہلے بھی جیل کی ہوا کھا چکا تھا۔ اس وقت وہ وشوا ناتھ کے والد سوبھاش ناتھ کی حویلی میں گھسا تھا اور اس پر ڈکیتی کا کیس بنا تھا۔

اب بات میرے ذہن میں کچھ کچھ کھلتی جا رہی تھی۔ واقعات کی چند کڑیاں ایک دوسرے سے ملتی محسوس ہو رہی تھیں۔ حبیب خان نے نظیر بادشاہ کی بیوی کو ورغلایا تھا اور اپنے ساتھ امرتسر لے آیا تھا۔ نظیر بادشاہ اس کا پیچھا کر کے امرتسر پہنچ گیا تھا اور اس نے اپنی بیوی کے بدلے حبیب خان سے چار پانچ ہزار روپے طلب کئے تھے۔ حبیب خان نے رقم دینے کے لئے اس سے چند ماہ کی مہلت مانگ لی تھی اور اپنی کوشش میں لگ گیا تھا۔ وہ امرتسر میں خشک میوے کی دکان کرنے لگا تھا۔ اس کاروبار سے وہ اتنی رقم اکٹھی نہیں کر سکتا تھا کہ نظیر بادشاہ کو ہرجانہ ادا کر سکے۔ اس کا دھیان رہ رہ کر اس رقم کی طرف جا رہا تھا جو اس نے ڈیڑھ دو سال پہلے امرت پور کے سوبھاش ناتھ کو ساجھے داری کے لئے دی تھی۔ سوبھاش ناتھ اب مر چکا تھا اور اس کا اکلوتا بیٹا وشوا ناتھ اس کے لین دین کا ذمے دار تھا۔ اتفاقاً وشوا ناتھ ملازمت کے سلسلے میں امرتسر ہی میں رہ رہا تھا۔ حبیب خان اس سے ملا اور اپنی رقم کا تقاضا کیا۔ کافی دن یہ کھینچا تانی ہوتی رہی بالآخر حبیب خان نے ایک بار پھر قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ وہ وشوا ناتھ کے گھر میں گھسا۔ اسے مارا پیٹا اور اٹھا کر لے گیا۔ یہ بات عین ممکن تھی کہ حبیب خان نے مغوی کو امرتسر میں ہی کہیں رکھا ہو اور اب اس کے وارثوں سے سودے بازی کرنے کے لئے موقعے کا انتظار کر رہا ہو۔

☆======☆======☆

حبیب خان حوالات کے ننگے فرش پر دوزانو بیٹھا تھا۔ گرفتار ہوتے وقت اس میں جو اکڑفوں تھی وہ ختم ہو چکی تھی، تاہم وہ اپنے پہلے والے بیان پر اب بھی ڈٹا ہوا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اتوار کی رات کو وشوا ناتھ سے رقم کا تقاضا کرنے اس کے گھر میں ضرور داخل ہوا تھا اور دونوں میں مار پیٹ بھی ہوئی تھی لیکن پھر وشوا ناتھ کی لاٹھی لگنے سے بلب ٹوٹ گیا۔ اسی دوران باہر کے دروازے پر زور زور سے دستک ہونے لگی۔ وہ سمجھا کہ محلے دار آ گئے ہیں۔ وہ وہاں سے نکل بھاگا۔

لیکن سوال یہ تھا کہ اگر وہ نکل بھاگا تو وشوا ناتھ کہاں تھا...... میرے پاس حبیب خان کا سات روزہ ریمانڈ تھا۔ اس ریمانڈ کے دوران میں نے شدید کوشش کی کہ وہ کچھ بک دے لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ میں نے حبیب خان سے شاہینہ اور نظیر بادشاہ کے بارے میں بھی

سوالات پوچھے۔حبیب خان پہلے تو انکار کرتا رہا کہ وہ کسی نظیر بادشاہ کو نہیں جانتا لیکن جب میں نے امرت پور سے آئے ہوئے امام مسجد عیسیٰ خان کو اس کے سامنے کیا تو اس نے ہار مان لی۔اس نے اعتراف کرلیا کہ وہ شاہینہ کو امرت پور سے لے کر آیا ہے اور شاہینہ کا پہلا شوہر نظیر بادشاہ ہی تھا۔تاہم حبیب خان نے یہ بات تسلیم کرنے سے انکار کیا کہ اس نے شاہینہ کو داشتہ کے طور پر رکھا ہوا ہے۔اس نے کہا۔"جناب! میں نے اپنے عقیدے کے مطابق شاہینہ سے باقاعدہ شادی کی ہے اور وہ میری بیوی ہے۔"

میں نے پوچھا۔"نظیر بادشاہ سے تمہارا معاملہ کتنے میں طے ہوا تھا؟"

وہ بولا۔"پانچ ہزار روپے میں۔"

"یہ رقم تم نے ادا کردی ہے؟"

"نہیں......میں نے اگلے ماہ تک کی مہلت لے رکھی ہے۔"

میں نے کہا۔"میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ تم مہلت پوری ہونے سے پہلے پہلے ہرجانے کی رقم کا انتظام کرنا چاہتے تھے۔اسی چکر میں تم وشوانا تھ کے گھر میں گھسے اور اس سے زبردستی کی۔"

وہ چند لمحے خاموش رہا۔پھر ایک گہری سانس لے کر بولا۔"تھانیدار صاحب! آپ ٹھیک کہتے ہیں۔میں اتنا مجبور نہ ہوتا تو کبھی وشوانا تھ سے لڑائی جھگڑا نہ کرتا۔شاہینہ سے شادی کے وقت مین نے اپنے آپ سے قسم کھائی تھی کہ اب زندگی بھر کوئی غیر قانونی کام نہیں کروں گا۔حلال کا رزق کماؤں گا اور شرافت کی زندگی بسر کروں گا۔میں نے بہت مجبور ہو کر وشوانا تھ پر ہاتھ اٹھایا تھا۔مجھے ڈر ہے کہ اگر میں ایک ماہ کے اندر نظیر بادشاہ کو رقم نے دے سکا تو میری بیوی کو چترالی اٹھا کر لے جائیں گے۔"

میں نے کہا۔"دیکھو اگر تم مجھے سب کچھ صاف صاف بتا دو تو میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔"

وہ قدرے بےزاری سے بولا۔"تھانیدار صاحب! میں کیسے یقین دلاؤں۔میں آپ سے کچھ نہیں چھپا رہا ہوں۔مجھے کچھ پتہ نہیں وشوانا تھ کہاں ہے؟ مجھے تو یوں لگ رہا ہے کہ وہ مجھے جیل بھجوانے کے لئے جان بوجھ کر کہیں چھپ گیا ہے۔"

میں نے کہا۔"حبیب خان! تم یہ بتا رہے ہو کہ جب کمرے میں اندھیرا چھا گیا تو باہر کے دروازے پر زوردار دستک ہوئی۔تمہارا خیال تھا کہ وہ محلے دار ہیں لیکن وہ محلے دار نہیں تھے کیونکہ وشوانا تھ کے غائب ہونے کا پتہ اس وقت چلا جب صبح وشوانا تھ کا دوست اسے سیر

کے لئے جگانے پہنچا۔سوچنے کی بات یہ ہے کہ اس وقت دروازے پر دستک دینے والا کون تھا؟"

حبیب خان بولا۔"میں نے بھی اس بارے میں بہت سوچا ہے جی......لیکن کوئی نتیجہ نہیں نکال سکا ہوں۔یہاں امرتسر میں میرا کوئی رشتے دار نہیں رہتا۔نہ ہی کوئی یار دوست اس وقت دروازے پر آسکتا تھا۔"

میں نے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ حبیب خان سے پوچھ گچھ جاری رکھی۔پھر اسے بارہ گھنٹے کے لئے سوچنے کی مہلت دے کر اپنے دفتر میں واپس آگیا......سب انسپکٹر فرزند علی میرے دفتر ہی میں بیٹھا تھا۔میں نے اس سے صلاح مشورہ کیا۔اس صلاح مشورے کے نتیجے میں فیصلہ ہوا کہ شاہینہ کے سابقہ خاوند نظیر بادشاہ سے ملاقات کی جائے اور اس کا مؤقف بھی سنا جائے کہ وہ کیا کہتا ہے۔جیسا کہ میں نے بتایا نظیر بادشاہ جالندھر کے ایک نواحی قصبے امرت پور میں رہتا تھا اور وہیں تیل کا کاروبار کر رہا تھا......امرتسر سے امرت پور کا فاصلہ پینتیس چالیس میل سے زیادہ نہیں تھا۔اگلے روز میں بذریعہ بس امرت پور جا پہنچا۔اس قصبے کی آبادی میری توقع سے زیادہ تھی۔نظیر بادشاہ کا حویلی نما مکان ڈھونڈنے میں مجھے زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔

وہ اتوار کا دن تھا نظیر بادشاہ سے اس کے گھر ہی میں ملاقات ہوگئی۔وہ درمیانی شکل وصورت اور درمیانے قد کا شخص تھا۔رنگ کسی وقت سُرخ وسپید رہا ہوگا لیکن دن رات "تیل" میں رہ کر اب کچھ میلا ہوگیا تھا۔نظیر بادشاہ کی توند تھوڑی سی نکلی ہوئی تھی جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ایک خوش خوراک شخص ہے۔میں وردی میں تھا لیکن نظیر بادشاہ مجھے دیکھ کر کچھ زیادہ حیران نہیں ہوا۔شاید اسے پہلے سے امید تھی کہ حبیب خان اور وشوانا تھ کے سلسلے میں پولیس اس سے رابطہ قائم کرے گی۔وہ مجھے بڑے احترام کے ساتھ گھر کی بیٹھک میں لے گیا اور چائے کا انتظام کرایا۔میں نے اس سے پوچھا کہ وہ حبیب خان اور وشوانا تھ کے جھگڑے کے بارے میں کیا جانتا ہے۔جواب میں نظیر بادشاہ نے قریباً وہی کچھ کہا جو اس سے پہلے امام مسجد عیسیٰ خان کہہ چکا تھا۔

وہ بولا۔"حبیب خان ایک جھگڑالو شخص کے طور پر مشہور ہے۔اس کا کہنا ہے کہ ڈیڑھ دو سال پہلے اس نے وشوانا تھ کے باپ سوبھاش ناتھ کو رقم دی تھی جو وہ ہڑپ کر گیا لیکن امرت پور میں کوئی بھی اس کی یہ بات مانتا نہیں ہے۔سب جانتے ہیں کہ ہندو ہونے کے باوجود سوبھاش ناتھ ایک دیانت دار، کھرا شخص تھا۔قریباً ایک سال پہلے حبیب خان اور اس کا ایک ساتھی پستول اور خنجر وغیرہ لے کر سوبھاش ناتھ کے گھر گھس گئے۔سوبھاش ناتھ نے ان

پر ڈکیتی کا پرچہ کٹایا اور دعویٰ کیا کہ وہ بہت سی نقد رقم اور زیورات لے گئے ہیں۔ پتہ نہیں اس میں سچ کتنا تھا اور جھوٹ کتنا۔ بہرحال اب حبیب خان سوبھاش ناتھ کے اکلوتے بیٹے وشواناتھ کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔''

میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ''نظیر بادشاہ! حوالات میں حبیب خان نے اعتراف کیا ہے کہ وہ تمہاری بیوی کو ورغلا کر اپنے ساتھ لے گیا تھا اور اب پچھلے دس ماہ سے اس کے ساتھ رہ رہا ہے۔ حیرانی کی بات ہے کہ تم نے ابھی تک پولیس میں رپٹ درج کرائی ہے اور نہ اپنی بیوی کو واپس لانے کی کوئی سنجیدہ کوشش کی ہے۔''

نظیر بادشاہ کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔ پھر ذرا سنبھل کر کہنے لگا۔ ''تھانیدار صاحب! تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی۔ شاہینہ میری بیوی تو اسی دن نہیں رہی تھی جب اس نے اور حبیب خان نے ایک دوسرے کو میلی نظر سے دیکھا تھا۔ اب تو اس کے ساتھ میرا جو نام کا رشتہ تھا وہ بھی ختم ہو چکا ہے۔ وہ میرے لئے مر چکی ہے۔ ہمارے علاقے کا یہی دستور ہے کہ ایسی آوارہ عورت پر لعنت کے دو حرف بھیج کر اسے ہمیشہ کے لئے بھلا دیا جاتا ہے۔''

ہمارے درمیان یہ گفتگو ڈیڑھ دو گھنٹے جاری رہی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ نظیر بادشاہ کے دل میں حبیب خان کے لئے وہی جذبات ہیں جو ایک رقیب کے دل میں دوسرے رقیب کے لئے ہوتے ہیں۔ اس گفتگو کے دوران ہی میری نظر حویلی کے بیرونی گیٹ پر پڑی۔ وہاں سے ایک جیپ نما کھٹارہ گاڑی اندر آئی۔ اس پر تیل کے بہت سے کنستر لدے ہوئے تھے۔ گاڑی کمرے کے قریب سے گزرتی ہوئی حویلی کے پچھواڑے چلی گئی۔ میری نگاہ ان نشانات پر پڑی جو جیپ کے چاروں پہیے کچی زمین پر چھوڑ گئے تھے۔ ان نشانات کو دیکھ کر میں بُری طرح چونک گیا۔ جس جگہ سے جیپ گھومی تھی وہاں چاروں پہیوں کے نشانات صاف نظر آ رہے تھے۔ میں بالکل اسی قسم کے نشان پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ ان نشانات میں دائیں جانب کا اگلا ٹائر قریباً گھسا ہوا تھا اور باقی ٹائروں سے کچھ چوڑا بھی تھا۔ میری رگوں میں خون سنسنا اٹھا۔ یہ نشانات میں نے وشواناتھ کے مکان سے باہر گلی میں دیکھے تھے۔

نظیر بادشاہ جو کچھ دیر پہلے تک اس معاملے میں ایک لاتعلق شخص نظر آ رہا تھا، میری نگاہ میں سخت مشکوک ٹھہر گیا۔ اب میں بڑے وثوق سے کہہ سکتا تھا کہ جس رات وشواناتھ اپنے گھر سے غائب ہوا نظیر بادشاہ کی یہ کھٹارہ گاڑی نہ صرف امرتسر میں تھی بلکہ وشواناتھ کے گھر بھی گئی تھی۔ یہ بات عین ممکن تھی کہ اس گاڑی میں نظیر بادشاہ خود ہو...... پھر سوچتے سوچتے ایک بات اور میرے ذہن میں آئی۔ ہو سکتا ہے کہ نظیر بادشاہ ہی وہ شخص ہو جس نے وشواناتھ اور

حبیب خان کی لڑائی کے دوران دروازہ کھٹکھٹایا تھا۔ اگر فرض کر لیا جاتا کہ دروازہ کھٹکھٹانے والا شخص نظیر بادشاہ ہی تھا تو پھر یہ بھی سوچا جا سکتا تھا کہ بعد میں اسی نے زخمی وشواناتھ کو اغوا کیا ہو۔ اس جرم کی وجہ باآسانی سمجھ میں آ جاتی تھی۔ نظیر بادشاہ، حبیب خان کا رقیب تھا اور کوئی بھی ایسا کام کر سکتا تھا جس کا الزام حبیب خان پر آتا اور اسے اپنی آزادی اور جان کے لالے پڑ جاتے۔

میں نے ایک دم اپنا لہجہ بدلا اور نظیر بادشاہ سے کہا۔ ''جانتے ہو میں امرتسر سے چل کر یہاں تمہارے پاس کیوں آیا ہوں؟'' وہ چونک گیا اور سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے کہا۔ ''میں تم سے اس جیپ کے بارے میں پوچھنے آیا ہوں۔''

''میں......میں کچھ سمجھا نہیں۔'' وہ ہکلا کر بولا۔

میں نے کہا۔ ''جس رات وشواناتھ کو اس کے گھر سے اٹھایا گیا یہ جیپ موقع واردات پر پائی گئی تھی اور میرا خیال ہے کہ تم خود بھی اس جیپ میں موجود تھے۔''

نظیر بادشاہ کا رنگ ہلدی ہو گیا۔ ''یہ......یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟'' وہ ہکلا کر بولا۔

میں نے جواب دیا۔ ''باقی باتیں تھانے چل کر ہوں گی۔''

☆======☆======☆

تھانے میں نظیر بادشاہ نے پہلے تو بہت اکڑفوں دکھائی اور بڑی دلیری سے ہمیں خطرناک ترین نتائج کی دھمکیاں دیں لیکن دھیرے دھیرے وہ اپنے آپ میں آ گیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ یہ آزاد علاقہ نہیں ہے اور اس حوالات سے اتنی آسانی کے ساتھ اس کی جان نہیں چھوٹے گی۔ اس نے بہتر سمجھا کہ گدھے کی طرح مار کھانے کی بجائے ہمارے ساتھ تعاون کرے۔ سب سے پہلے تو اس نے یہ اعتراف دہرایا کہ اپنے علاقے اور قبیلے کے دستور کے مطابق اس نے حبیب خان سے معاوضہ طلب کیا تھا۔ حبیب خان نے شاہینہ کے بدلے پانچ ہزار دینا قبول کیا تھا اور چند مہینے کی مہلت لی تھی جو اگلے مہینے ختم ہو رہی تھی...... پھر تھوڑے سے بحث مباحثے کے بعد اس نے یہ بات بھی مان لی کہ وہ رقم کے سلسلے میں تین چار بار امرتسر گیا تھا اور حبیب خان سے جھگڑا کر چکا تھا۔ دراصل حبیب خان نے اس سے کہہ رکھا تھا کہ وہ مہلت ختم ہونے سے پہلے ہی اسے ایک تہائی رقم ادا کر دے گا جو اس نے نہیں کی تھی۔

سب سے مشکل ''اعتراف'' یہ تھا کہ واردات کی رات نظیر بادشاہ موقع واردات پر پہنچا تھا۔ نظیر بادشاہ یہ اعتراف نہیں کر رہا تھا۔ وہ بتا رہا تھا کہ واردات کی رات وہ اپنی گاڑی سمیت ایک تاریخ کے سلسلے میں لاہور گیا ہوا تھا۔ میں نے کہا۔ ''تمہارے رقیب حبیب خان نے بھی

ایسی ہی بات کی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ واردات کی رات وہ اپنی دکان کا سودا لینے پشاور گیا ہوا تھا لیکن مار کھانے کے بعد وہ سب کچھ مان گیا۔ یہ نہ ہو کہ تمہیں بھی اسی کے طریقے سے منانا پڑے۔''

نظیر بادشاہ بولا۔ ''آخر آپ میرے بارے میں کس طرح کا شک کر رہے ہیں؟ میں نے کیا جرم کیا ہے جو آپ مجھے اس طرح ذلیل کر رہے ہیں؟''

میں نے کہا۔ ''فی الحال میں تمہارے جرم کی ٹھیک ٹھیک تفصیل تو نہیں بتا سکتا لیکن حالات جو نقشہ کھینچ رہے ہیں وہ تم بھی سن لو۔ یہ بات ڈھکی چھپی نہیں کہ تم میں اور حبیب خان میں رقابت تھی۔ تم نے بظاہر تو حبیب خان سے پانچ ہزار میں معاملہ طے کر لیا تھا لیکن تمہارے اندر انتقام کا دیو چنگھاڑتا رہتا تھا۔ تم کسی ایسے موقعے کی تلاش میں تھے حبیب خان کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا سکو۔ یہ موقع تمہیں پچھلے اتوار کے روز ملا۔ تم رقم کا تقاضا کرنے کے لئے امرتسر حبیب خان کے پاس پہنچے۔ وہاں تمہیں کسی سے پتہ چلا کہ حبیب خان بھی اپنی رقم کا تقاضا کرنے کے لئے نکلا ہوا ہے۔ وہ وشوا ناتھ کے پاس گیا تھا۔ تم وشوا ناتھ کے گھر جا پہنچے۔ یہ رات نو دس بجے کا وقت تھا۔ تم نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ یہ وہی ٹائم تھا جب گھر کے اندر حبیب خان اور وشوا ناتھ میں دست بدست لڑائی ہو رہی تھی۔ تمہیں شک گزرا کہ اندر کوئی گڑبڑ ہو چکی ہے۔ تاریکی کا فائدہ اٹھا کر تم نے دیوار پھاندی اور اندر چلے گئے۔ تم جب اندر گئے حبیب خان گھر کی پچھلی دیوار سے کود کر باہر نکل گیا اور بیرونی دروازے کے عین سامنے کھڑے موٹر رکشا میں بیٹھ کر چلا گیا۔ اندر جا کر تم نے ماچس یا ٹارچ کی روشنی میں دیکھا۔ تاریک کمرے میں وشوا ناتھ خون میں لت پت گرا پڑا تھا۔ تمہارے ذہن میں فوراً ایک شیطانی خیال آیا۔ حبیب خان سے بدلہ لینے کا یہ بڑا اچھا موقع تھا۔ سب لوگ جانتے تھے کہ حبیب خان اور وشوا ناتھ میں رقم کے تنازعے پر کئی بار جھگڑا ہو چکا ہے۔ کئی افراد کو یہ بات بھی معلوم تھی کہ حبیب خان رقم کا تقاضا کرنے وشوا ناتھ کی طرف آیا ہوا ہے۔ اگر وشوا ناتھ کو موقعے سے غائب کر دیا جاتا تو حبیب خان پر اغوا یا قتل کا الزام آ سکتا تھا۔ تم نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر نیم بے ہوش وشوا ناتھ کو اٹھایا اور ڈاکٹر کے پاس لے جانے کے بہانے اپنی جیپ میں ڈال لیا۔''

نظیر بادشاہ حیرت سے منہ کھولے میری باتیں سن رہا تھا۔ اس دوران اس کے چہرے پر کئی رنگ آ اور جا چکے تھے۔ ایک دم اس نے اپنی مٹھیاں بھینچیں اور چیخ اٹھا۔ ''میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ میں قسم کھاتا ہوں میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ میں...... میں وہاں گیا ضرور تھا

لیکن جس طرح گیا تھا اسی طرح لوٹ آیا تھا۔ مجھے کچھ پتہ نہیں وشوا ناتھ کہاں گیا ہے اور اسے کون لے کر گیا ہے۔''

طیش کے عالم میں سچی بات نظیر بادشاہ کے منہ سے نکل گئی تھی۔ اس نے اتوار کی شب موقع واردات پر اپنی موجودگی تسلیم کر لی تھی۔ یہ بڑی اہم پیش رفت ہوئی تھی۔ میں نے نظیر بادشاہ سے پوچھا کہ وہ کس وقت اور کس طرح وہاں پہنچا تھا اور وہاں اس نے کیا دیکھا۔

جواب میں نظیر بادشاہ ایک بار پھر آئیں بائیں شائیں کرنے لگا لیکن اب بات چونکہ اس کے منہ سے نکل چکی تھی لہٰذا وہ انکاری نہیں ہو سکتا تھا۔ بالآخر اسے ہتھیار پھینکنے پڑے۔ ایک بہت گہری سانس لے کر اس نے جسم ڈھیلا چھوڑ دیا۔ کچھ دیر سر پکڑے بیٹھا رہا پھر اس نے گلوگیر آواز میں بولنا شروع کیا۔ جو کچھ اس نے بتایا اس کا خلاصہ یوں ہے۔

''حبیب خان ایک جوان اور خوبصورت شخص تھا۔ باتیں بنانے کا فن بھی جانتا تھا۔ اس نے دھیرے دھیرے شاہینہ کو اپنے شیشے میں اتار لیا۔ وہ سب کچھ جانتے بوجھتے بھی اس کی محبت میں گرفتار ہوتی چلی گئی۔ حبیب خان اس سے مطالبہ کرتا رہتا تھا کہ وہ اس کے ساتھ بھاگ جائے لیکن یہ آخری قدم اٹھانے کی ہمت شاہینہ میں نہیں تھی۔ اسی دوران ایک روز نظیر بادشاہ شام کے وقت جلدی گھر آیا تو اس نے شاہینہ اور حبیب خان کو ایک کمرے میں اکٹھے بیٹھے دیکھ لیا۔ شاہینہ، حبیب خان کی کسی بات پر ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو رہی تھی اور حبیب خان بڑی بے تکلفی سے نظیر بادشاہ کے بستر پر نیم دراز تھا۔ یہ منظر دیکھ کر نظیر بادشاہ کے تمام شبے حقیقت کا روپ دھار گئے۔ اس کا خون کھول اٹھا۔ اس کا جی چاہا کہ شاہینہ کو جان سے مار ڈالے لیکن پھر اس نے خود پر قابو پایا۔ اپنے گھر اور بچوں کے لئے اس نے شاہینہ کو آخری موقع دینے کا فیصلہ کیا۔ اس نے شاہینہ کو سمجھایا بجھایا۔ شاہینہ نے بھی اپنی غلطی تسلیم کرنے کے بعد عہد کیا کہ اب وہ زندگی بھر اسے شکایت کا موقع نہیں دے گی۔ وہ نظیر بادشاہ کے قدموں میں گر پڑی اور رو رو کر اس سے معافی مانگی۔

اس واقعے کے بعد یوں محسوس ہونے لگا کہ وہ سنبھل گئی ہے...... اس نے بظاہر حبیب خان سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ انہی دنوں حبیب خان نے بُرے دوستوں کی صحبت میں بیٹھنا شروع کر دیا اور کاروبار سے دھیان ہٹا کر غنڈہ گردی کے چکر میں پڑ گیا...... پھر تھوڑے عرصے بعد یہ خبر ملی کہ اس نے قصبے کے ایک زمیندار سوبھاش ناتھ کے گھر میں ڈکیتی کی ہے اور جیل چلا گیا ہے...... تین چار ماہ بعد وہ جیل سے واپس آیا اور ایک بار پھر اپنے بدقماش یاروں کے ساتھ بدمعاشی میں مصروف ہو گیا۔ اسی دوران نظیر بادشاہ کو یہ محسوس ہونے لگا کہ

شاہینہ اور حبیب خان میں ابھی بھی کوئی نہ کوئی چکر موجود ہے۔ یہ بات نظیر بادشاہ کے لئے بڑی حیران کن تھی۔ شاہینہ ایک جمی جمائی پُرسکون زندگی سے منہ موڑ کر ایک آگ میں ہاتھ ڈالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ایک روز نظیر بادشاہ کو پتا چلا کہ حبیب خان نے خودکشی کی کوشش کی ہے اور اسے ہسپتال پہنچایا گیا ہے۔ نظیر بادشاہ جانتا تھا کہ خودکشی کی اس کوشش کا تعلق بھی شاہینہ اور حبیب خان کے چکر سے ہے اور پھر یہ بات ثابت بھی ہوگئی...... چند ہی روز بعد شاہینہ حبیب خان کے ساتھ گھر سے بھاگ گئی۔ نظیر بادشاہ کو اس حرکت کا بے حد دکھ تھا لیکن ساتھ ہی وہ یہ بھی سمجھتا تھا کہ جو ہوگیا اچھا ہوگیا۔ اسے پسند نہیں تھا کہ وہ ایک ایسی عورت کے ساتھ زندگی گزارے جس کے دل میں کچھ اور زبان پر کچھ اور ہو۔ جو بظاہر اس کی بانہوں میں سمائے لیکن تصور میں کسی اور کے سینے سے لگے۔ جو اس کے بستر پر ہوتے ہوئے بھی کسی اور کے بستر کے بارے میں سوچتی رہے۔ اس نے اس صدمے کو صبر و ہمت سے برداشت کیا اور اپنے علاقے کے رواج و دستور کے مطابق حبیب خان سے ''ہرجانہ'' وصول کرنے کے لئے نکل کھڑا ہوا۔

حبیب خان نے اسے پانچ ہزار روپے دینے قبول کئے تھے۔ اس میں سے ڈیڑھ ہزار روپے اس نے تین مہینے کے اندر دینے تھے، باقی رقم دس مہینے میں چکانی تھی لیکن اس نے چھ مہینے گزر جانے کے باوجود نظیر بادشاہ کو ایک پیسہ نہیں دیا۔ نظیر بادشاہ کو اس بات کا بہت رنج تھا۔ وہ ہر ہفتے دو ہفتہ بعد حبیب خان کے پاس امرتسر جا پہنچتا تھا اور سخت لب و لہجے میں رقم کا مطالبہ کرتا تھا۔ حبیب خان کہتا تھا کہ اس نے سوبھاش ناتھ کے بیٹے وشوا ناتھ سے رقم لینی ہے۔ جونہی اسے یہ پیسے ملے وہ نظیر بادشاہ کے ہاتھ پر رکھ دے گا...... واردات کے روز بھی نظیر بادشاہ، حبیب خان سے رقم کا مطالبہ کرنے ہی امرتسر پہنچا تھا۔ اپنے ایک جاننے والے کی زبانی اسے معلوم ہوا کہ دو روز پہلے حبیب خان اور وشوا ناتھ کے درمیان بھرے بازار میں سخت جھڑپ ہوئی ہے اور دونوں نے ایک دوسرے کو قتل کرنے کی دھمکیاں دی ہیں۔ اب ایک بار پھر حبیب خان وشوا ناتھ کی طرف گیا ہوا ہے اور اگر آج بھی وشوا ناتھ نے اسے خالی ہاتھ لوٹانا چاہا تو وہ ضرور وشوا ناتھ کو چاقو گھونپ دے گا۔

یہ اطلاع سن کر نظیر بادشاہ سوچ میں پڑ گیا۔ اگر حبیب خان کے ہاتھوں وشوا ناتھ زخمی یا قتل ہو جاتا اور اس کے نتیجے میں حبیب خان جیل پہنچ جاتا تو نظیر بادشاہ کو کیا فائدہ ہونا تھا۔ اس کی بیوی تو جا ہی چکی تھی، اسے واپس نہیں آنا تھا اور وہ آ بھی جاتی تو نظیر بادشاہ اسے ہرگز قبول نہ کرتا۔ نہ ہی حبیب خان کے جیل خانے جانے سے اس کا کوئی اور بگڑا کام سنور سکتا

تھا۔ ہاں یہ بات یقینی تھی کہ حبیب خان جیل چلا گیا تو اس کے پانچ ہزار روپے ڈوب جائیں گے۔ نظیر بادشاہ خالص کاروباری انداز میں سوچنے کا عادی ہو چکا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ حبیب خان اور وشوا ناتھ کے جھگڑے کو روکنا چاہئے۔ وہ اپنی گاڑی پر وشوا ناتھ کے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ اس وقت رات کے نو دس کا عمل تھا۔ سردی کی وجہ سے گلیاں بازار وغیرہ سنسان نظر آ رہے تھے۔ اس نے وشوا ناتھ کا گھر دیکھا ہوا تھا۔ وشوا ناتھ کے دروازے پر پہنچ کر اس نے دستک دی۔ دو تین بار دستک کے باوجود کسی نے دروازہ نہیں کھولا۔ اسی دوران اندر سے ایسی آوازیں آئیں جیسے دھینگا مشتی ہو رہی ہو۔ نظیر بادشاہ کا ماتھا ٹھنک گیا۔ اس نے چند لمحے سوچا پھر دیوار پھاند کر اندر داخل ہوگیا۔ اس نے دیکھا ایک تاریک کمرے کی دہلیز پر وشوا ناتھ اوندھا پڑا ہے۔ برآمدے کی روشنی سیدھی اس کے جسم پر پڑ رہی تھی۔ اس کے کندھے اور سر سے خون بہہ رہا تھا۔ قریب ہی فرش پر ایک لاٹھی پڑی تھی۔ وشوا ناتھ نے اپنے ایک ہاتھ سے زخمی کندھا دبا رکھا تھا اور دھیرے دھیرے کراہ رہا تھا۔ نظیر بادشاہ الٹے قدموں باہر نکل آیا۔ دروازہ کھول کر وہ سڑک پر آیا اور اپنی جیپ میں بیٹھ کر وہاں سے نکل گیا۔''

میں نے نظیر بادشاہ کا مندرجہ بالا بیان پوری تسلی اور توجہ سے سنا۔ اس بیان میں جھوٹ کتنا ہے اور سچ کتنا؟ اس کا اندازہ فوری طور پر تو نہیں لگایا جا سکتا تھا۔ بہرحال اتنا پتہ تو چل ہی گیا تھا کہ نظیر بادشاہ موقعے پر موجود تھا اور اس نے وشوا ناتھ کو زخمی حالت میں دیکھا تھا۔

میں نے نظیر بادشاہ سے کہا۔ ''اگر میں چند منٹ کے لئے فرض کر لوں کہ وشوا ناتھ کی گمشدگی میں تمہارا ہاتھ نہیں تو پھر اس جرم کا ذمے دار کس کو ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ اگر تم میری جگہ ہوتے تو اس بارے میں کس نتیجے پر پہنچتے؟''

نظیر بادشاہ نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور بولا۔ ''میں اس بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں جی۔ ہو سکتا ہے کہ وشوا ناتھ کو اغوا کرنے والا بھی حبیب خان ہی ہو۔ اس نے دیکھ لیا ہو کہ میں دیوار پھاند کر اندر آ رہا ہوں۔ وہ کسی کونے کھدرے میں چھپ گیا ہو۔ میرے جاتے ہی وہ پھر باہر نکل آیا ہو اور وشوا ناتھ کو لے گیا ہو......''

میں نے کہا۔ ''لیکن وہ تو کہتا ہے کہ وہ تمہارے دستک دیتے ہی گھر سے نکل گیا تھا اور موٹر رکشا پر بیٹھ کر چلا گیا تھا...... کیا تمہاری واپسی تک موٹر رکشا وہیں موجود تھا؟''

نظیر بادشاہ بولا۔ ''سچی بات ہے جناب! میں نے اس بات پر غور ہی نہیں کیا کہ گھر کے سامنے کوئی موٹر رکشا موجود تھا یا نہیں۔ مجھے اتنا وقت ہی نہیں ملا کہ میں اردگرد توجہ دے سکتا۔ وشوا ناتھ کو زخمی حالت میں دیکھ کر میں بہت حواس باختہ ہوگیا تھا۔ میں فوراً وہاں سے نکلا اور

گاڑی میں بیٹھ کر چلا گیا۔''

موٹر رکشا دروازے کے سامنے موجود تھا اور اس بات کی تصدیق چھابڑی فروش یاسین کے علاوہ خود حبیب خان بھی کر چکا تھا۔ حیرت کی بات تھی کہ یہ رکشا نظیر بادشاہ کی نگاہ سے اوجھل رہا۔ بہرحال ایسا بھی ہو سکتا تھا۔ میں نے نظیر بادشاہ سے کہا۔ ''یعنی تمہیں شبہ ہے کہ وشوانا تھ کا اغوا حبیب خان نے ہی کیا ہے؟''

وہ بولا۔ ''صرف شبہ ہے۔ یقین کے ساتھ آپ کی طرح میں بھی کچھ نہیں کہہ سکتا...... سچی بات تو یہ ہے کہ حبیب خان کوئی اچھا شخص نہیں ہے۔ وہ کئی چکروں میں پھنسا ہوا ہے۔ کئی ایسے بندے بھی ہیں جو بظاہر اس کے دوست ہیں لیکن اندر سے دشمن ہیں۔ کیا پتہ کسی ایسے ہی شخص نے اسے اس چکر میں پھنسایا ہو۔ عورتوں میں معاملے میں بھی حبیب خان ایک لالچی اور ندیدہ شخص ہے۔ خاص طور پر شادی شدہ عورتوں سے اس نے کئی معاشقے پالے ہیں۔ چترال میں بھی دو تین شادی شدہ عورتوں سے اس کا چکر رہا ہے۔ سنا ہے یہاں پنجاب میں بھی اس نے ایک میواتی کا ہنستا بستا گھر برباد کر دیا تھا...... اب وہ نیک اور پارسا بننے کی کوشش کر رہا ہے لیکن انسان جو کچھ بوتا ہے اس کی فصل تو کاٹتا ہی ہے۔''

چوبیس گھنٹے تک پوچھ گچھ کرنے کے بعد میں نے نظیر بادشاہ کو گھر جانے کی اجازت دے دی لیکن اسے سمجھا دیا کہ وہ زیر تفتیش ہے اور اگر اس نے مجھے بتائے بغیر امرت پور سے جانے کی کوشش کی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔

جس دن میں نے نظیر بادشاہ کو گھر جانے کی اجازت دی، اسی روز شام کو ایک ایسا واقعہ ہو گیا کہ علاقے میں کھلبلی مچ گئی۔ امرتسر کے شمالی علاقے میں گندے نالے کے اندر سے ایک پراسرار بوری ملی۔ یہ بوری کہیں سے تیرتی ہوئی آئی تھی اور پل کے نیچے آ کر اٹک گئی تھی۔ بوری کے اوپر بہت سی مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں اور خون کی آلائش بھی نظر آ رہی تھی۔ راہگیروں کو شبہ ہوا کہ بوری میں کوئی انسانی لاش ہے۔ تھانے میں اطلاع دی گئی۔ میں عملے کے تین ارکان کے ساتھ موقعے پر پہنچا۔ اس وقت تک پل اور نالے کی دونوں اطراف مجمع لگ چکا تھا۔ دو خاکروبوں کی مدد سے بوری گندے پانی میں سے نکالی گئی۔ اس میں سے بو کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔ اسے کھولا گیا تو اندر سے ایک مسخ اور پھولی ہوئی لاش برآمد ہوئی۔ میں وشوانا تھ کی تصویر دیکھ چکا تھا لہٰذا دیکھتے ہی پہچان گیا۔ یہ وشوانا تھ کی لاش تھی۔ وشوانا تھ ایک لمبا تڑنگا شخص تھا۔ وہ بوری میں پورا نہیں آیا تھا۔ اس کا سر بوری سے باہر رہ گیا تھا لہٰذا سر پر ایک کپڑا ڈال کر اوپر سے رسیاں وغیرہ لپیٹ دی گئی تھیں اور یوں اسے ''پیک'' کر کے نالے

میں پھینک دیا گیا تھا۔ میں نے موقعے پر ہی وشوانا تھ کا معائنہ کیا۔ وشوانا تھ کے گلے میں رسی ڈال کر اس کا گلا گھونٹا گیا تھا۔ یہ رسی ابھی تک اس کے گلے میں موجود تھی۔ اس کے علاوہ وشوانا تھ کے ایک کندھے پر تیز دھار آلے کا زخم بھی صاف دیکھا جا سکتا تھا۔ یقیناً یہ وہی زخم تھا جو حبیب خان کے چاقو سے آیا تھا۔

ضروری کارروائی کے بعد لاش کو فوراً پوسٹ مارٹم کے لئے روانہ کر دیا گیا۔ لاش کی خبر جنگل میں آگ کی طرح ہر طرف پھیل گئی۔ اگلے روز کے اخبارات میں تفصیل سے ذکر ہوا۔ ایک ہندی اخبار نے سرخی لگائی۔ ''اغوا کا ڈراپ سین۔ وشوانا تھ کی لاش مل گئی۔'' ایس پی صاحب نے مجھے فوری ہیڈ کوارٹر میں بلایا اور سختی سے تاکید کی کہ حقیقی ملزم گرفتار کئے جائیں اور چالان جلد سے جلد مکمل کر کے عدالت میں پیش کیا جائے۔

ضروری ہو گیا تھا کہ میں نظیر بادشاہ کو پھر گرفتار کر لوں اور اس کے علاوہ ان تمام افراد کو بھی تفتیش میں بٹھایا جائے جن پر کسی طرح کا شبہ ہو سکتا تھا۔ اب یہ قتل کیس تھا اور ضرورت اس امر کی تھی کہ تیز رفتاری سے تفتیش کی جائے۔

میری دلچسپی کی چیز وہ رسی تھی جس سے وشوانا تھ کا گلا گھونٹا گیا تھا۔ رسی کا یہ ٹکڑا قریباً دو فٹ لمبا تھا۔ یہ کوئی عام رسی نہیں تھی۔ کسی درخت کی خشک چھال کو بٹ کر رسی کی شکل دی گئی تھی۔ ایسی رسی میں عموماً خشک انجیریں یا خوبانیاں پروئی جاتی ہیں۔ جب اس رسی کا باریک بینی سے معائنہ کیا گیا تو یہ اندازہ درست ثابت ہوا۔ یہ وہی رسی تھی جو خشک میوہ بیچنے والے استعمال کرتے ہیں، ''خشک میوے'' کا ذکر آتے ہی دھیان خود بخود حبیب خان کی طرف چلا گیا۔ جیسا کہ آپ پڑھ چکے ہیں، امرتسر آ کر حبیب خان نے خشک میوے کی دکان کر لی تھی۔

دو دن بعد پوسٹ مارٹم رپورٹ بھی آ گئی۔ وشوانا تھ کی لاش کو دستیابی سے قریباً اڑتالیس گھنٹے قبل قتل کیا گیا تھا۔ وہ دم گھٹنے سے ہلاک ہوا تھا۔ اس کی گردن پر رسی کا گہرا نشان موجود تھا جو وقت گزرنے کے ساتھ نیل کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ یہ بات تو یقینی تھی کہ وشوانا تھ کو حبیب خان نے اپنے ہاتھوں سے ہلاک نہیں کیا۔ وہ پچھلے کئی روز سے پولیس کی حراست میں تھا...... یہ کام حبیب خان کے کسی ایسے دوست کا ہو سکتا تھا جس کے پاس وشوانا تھ کو اغوا کرنے کے بعد رکھا گیا تھا۔ ممکن تھا کہ اپنے سر اور کندھے کے زخموں کی وجہ سے وشوانا تھ قریب المرگ ہو گیا ہو۔ اسے علاج معالجے کی ضرورتوں سے بے نیاز کرنے کے لئے قتل کر کے پھینک دیا گیا ہو...... لیکن ایک بات مجھے بار بار شک میں مبتلا کر رہی تھی۔ قاتل کو رسی کا ٹکڑا بوری میں رکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ حبیب خان کو پھنسانے کے

لئے جان بوجھ کر ایسی رسی بوری میں رکھی گئی ہو جو انجیریں وغیرہ پرونے کے لئے استعمال ہوتی ہے۔

جب میں اس زاویے سے سوچتا تھا تو میرا دھیان ایک بار پھر حبیب خان کے رقیب نظیر بادشاہ کی طرف جانے لگتا تھا۔ نہ جانے کیوں بار بار مجھے یہ شبہ ہوتا تھا کہ حبیب خان لاکھ بُرا سہی لیکن یہ اغوا اور قتل اس نے نہیں کیا۔ اسے ایک منصوبے کے تحت پھنسانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اگر ایسی کوشش کی گئی تھی تو پھر نظیر بادشاہ سے زیادہ کس پر شبہ کیا جاسکتا تھا۔ وہ شاہینہ کا سابقہ شوہر تھا اور عین واردات کے وقت موقعے پر موجود بھی تھا۔

وشوانا تھ قتل کیس کی تفتیش جاری تھی کہ ایک روز ایک اہم واقعہ رُونما ہوا۔ معمول کی چیکنگ کے دوران دربار صاحب کے علاقے سے ایک ٹیکسی والے کو گرفتار کیا گیا۔ اس کی ٹیکسی بھی پکڑ لی گئی اور بمعہ سواریوں کے تھانے پہنچا دی گئی۔ سواریوں میں ایک خوبصورت لڑکی اور گھنی مونچھوں والا ایک جواں سال شخص تھا۔ وہ نشے میں تھا اور شکل وصورت سے ہی رنگین مزاج نظر آتا تھا۔ لڑکی بھی آفت کی پرکالی لگتی تھی۔ اس نے نیم عریاں لباس پہن رکھا تھا۔ قمیص کا گریبان خطرناک حد تک کشادہ تھا اور وہ باریک کپڑے کی ایسی چست پتلون پہنے ہوئے تھی جسے دیکھ کر یوں لگتا تھا کہ ٹانگوں پر سُرخ رنگ کیا ہوا ہے۔ درحقیقت پولیس والوں نے اسی لڑکی کو دیکھ کر چیکنگ کے لئے روکا تھا۔ اس نے پہلے تو بہت شور مچایا تھا کہ وہ فلاں کی بیٹی ہے اور فلاں کی بھتیجی ہے۔ پولیس والوں پر کیس کردے گی، ان کی پیٹیاں اُتروادے گی وغیرہ وغیرہ لیکن جلد ہی پتہ چل گیا کہ وہ ایک طوائف زادی ہے اور اپنے شرابی گاہک کے ساتھ رات بسر کرنے اس کی کوٹھی میں جارہی ہے۔ یہ انکشافات ہونے کے بعد وہ منت ساجت پر اُتر آئی تھی۔ اس نے سب انسپکٹر فرزند علی کو ایک طرف لے جاکر رشوت کی پیشکش کی تھی۔ شاید فرزند علی اسے چھوڑ ہی دیتا لیکن ٹیکسی کی تلاشی کے دوران کانسٹیبل سنت سنگھ کی نگاہ ایک شے پر پڑی اور وہ چونک گیا۔ ڈگی میں خون کے دھبے موجود تھے۔ ان دھبوں کے بارے میں ڈرائیور غفور احمد سے پوچھا گیا تو وہ کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکا۔ یہ ایک سنگین قسم کی صورتِ حال تھی۔ پولیس کا عملہ ٹیکسی کو ڈرائیور اور سواریوں سمیت تھانے لے آیا۔

میں نے تھانے لائے جانے والے تینوں افراد سے پوچھ گچھ کی۔ طوائف اور اس کے گاہک کو تو سرزنش کر کے چھوڑ دیا گیا مگر ڈرائیور کا رویہ الجھن میں مبتلا کررہا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ٹیکسی کا اصل مالک مبین اختر نامی ایک شخص ہے اور وہ اُجرت پر رات کے وقت ٹیکسی چلاتا ہے۔ اسے کچھ معلوم نہیں کہ ڈگی میں خون کے یہ دھبے کیسے ہیں۔

درحقیقت ڈرائیور غفور احمد بہت گھبرایا ہوا تھا۔ اگر وہ ناکے پر ہی کہہ دیتا کہ کسی سواری نے گوشت یا ذبح کی ہوئی مرغیاں وغیرہ یہاں رکھوائی تھیں تو اسے چھوڑ دیا جاتا لیکن وہ اپنے سر سے بلا ٹالنے کے لئے بار بار ٹیکسی کے مالک مبین اختر کا نام لے رہا تھا...... اب ضروری ہوگیا تھا کہ اس مبین صاحب سے مل لیا جائے۔

ٹیکسی ڈرائیور سے گفتگو کرتے ہوئے میرے وہم وگمان میں نہ تھا کہ خون کے ان دھبوں کا سلسلہ وشوانا تھ کے قتل سے جا ملے گا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے ٹیکسی ڈرائیور کے ساتھ خود جانا ضروری نہیں سمجھا اور یہ کام سب انسپکٹر فرزند علی کے سپرد کیا۔ تاہم عین موقعے پر سب انسپکٹر فرزند علی کو ہیڈ کوارٹر سے بلاوا آگیا اور مجھے غفور احمد کی بے حد کھٹارہ ٹیکسی میں بیٹھ کر خود مبین اختر کے پاس جانا پڑا۔

جس شخص کو مبین اختر کہا جارہا تھا اس کا گھر لاری اڈے کے قریب ایک کچی آبادی میں تھا۔ کچا پکا نیم تاریک سا مکان تھا۔ کھٹارہ ٹیکسی بے تحاشا شور مچاتی رات کے ساڑھے دس بجے مکان کے سامنے پہنچی۔ میرے ساتھ سادہ کپڑوں میں دو کانسٹیبل بھی تھے۔ میں نے ان دونوں کو ٹیکسی میں رہنے دیا اور خود ڈرائیور غفور احمد کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھا۔ دوسری تیسری دستک پر ایک ادھیڑ عمر شخص نے دروازہ کھولا اور مجھے دیکھ کر گڑبڑا گیا۔ میں وردی میں تھا اور کسی شخص کو گھر کا دروازہ کھولنے پر سامنے پولیس نظر آئے تو وہ گھبرایا ہی کرتا ہے۔

''کک...... کیا بات ہے غفورے؟'' ادھیڑ عمر شخص نے غفور احمد سے پوچھا۔

''یہ انسپکٹر صاحب ہیں...... تت...... تم سے کچھ پوچھنا چاہتے ہیں۔'' غفور احمد نے گویا مصیبت کا اعلان کیا۔

''جی فرمایئے۔'' ادھیڑ عمر شخص نے باہر نکلتے ہوئے کہا۔ اس نے شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ قد لمبا اور رنگ ذرا سانولا تھا۔

میں نے کہا۔ ''باہر نہ نکلو۔ اندر چلو۔ یہ بات گلی میں کرنے والی نہیں ہے۔'' اسے تقریباً دھکیلتا ہوا میں اندر لے گیا۔

ادھیڑ عمر شخص کا نام ہی مبین اختر تھا۔ اب ڈرائیور کی طرح وہ بھی تھرتھر کانپنے لگا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اس گھر میں اس کے علاوہ اور کون کون رہتا ہے۔ وہ ٹھیٹ اردو میں بولا۔ ''جی! ایک میں ہوں، ایک میرا چھوٹا بھیا ہے۔ ایک بچہ اس کا ہے تین میرے ہیں۔ اس کی زوجہ فوت ہوچکے ہیں۔ میری زوجہ اور والدہ میرے ساتھ ہی رہتی ہیں۔''

میں نے پوچھا۔ ''تمہارا روزگار کیا ہے؟''

وہ بولا۔ ''میں کارپوریشن میں ملازم ہوں جی۔ تھوڑے تھوڑے پیسے جمع کر کے پانسو روپے میں یہ ٹیکسی لی تھی۔ خود تو تھکا ماندہ ہوتا ہوں، رات کو چلا نہیں سکتا۔ ڈرائیور کو اُجرت پر دے دیتا ہوں......''

ابھی میں مبین اختر سے تعارفی گفتگو ہی کر رہا تھا کہ ایک عجیب واقعہ رُونما ہوا۔ بیرونی دروازے پر کھٹ پٹ ہوئی اور کوئی سُست قدموں سے چلتا کمرے کی طرف آیا۔ سردی کا موسم تھا۔ اس شخص نے اپنا منہ سرگرم چادر میں لپیٹ رکھا تھا۔ صرف آنکھیں اور ناک کا تھوڑا سا حصہ نظر آ رہا تھا۔ دروازے پر قدم رکھتے ہی اس کی نگاہ مجھ پر پڑی اور وہ بُری طرح ٹھٹک گیا۔ صرف ایک لمحے کے لئے وہ دہلیز پر پتھر کی طرح ساکت نظر آیا، پھر پیچھے ہٹا اور کسی چھلاوے کی طرح واپس بھاگا۔ اسے بھاگتے دیکھ کر میں بھی بیٹھا نہیں رہ سکا۔

''ٹھہرو۔'' میں نے چیخ کر کہا اور ہولسٹر سے ریوالور نکال کر اس کے پیچھے لپکا۔

وہ شخص سنی اَن سنی کرتے ہوئے تیر کی مانند سنسناتا ہوا بیرونی دروازے سے نکل گیا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی شے تھی جو اس نے دروازے کے قریب پھینک دی تھی۔ میں نے پوری رفتار سے اس کا تعاقب کیا۔ میں چاہتا تو باآسانی اس پر گولی چلا سکتا تھا لیکن بغیر جانے بوجھے میں اسے زخمی یا ہلاک کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں جب اس شخص کے پیچھے بھاگتا ہوا باہر نکلا تو ٹیکسی میں بیٹھے دونوں کانسٹیبل بھی نکل کر اس کے پیچھے دوڑے۔

ہم گلی کے موڑ پر پہنچے تو وہ ہماری نگاہوں سے اوجھل تھا۔ یہاں سے دو راستے پھوٹتے تھے۔ اب معلوم نہیں تھا کہ وہ کس راستے پر گیا ہے۔ میں نے دونوں کانسٹیبلوں کو بائیں جانب والے راستے پر دوڑایا جب کہ خود دائیں جانب بھاگا۔ قریباً سو گز آگے میں نے اسے دیکھ لیا۔ اس نے اپنی چادر اُتار کر پھینک دی تھی اور بھینسوں کے ایک باڑے کی کچی دیوار پھاند رہا تھا۔ میں نے بھی اس کے پیچھے دیوار پھاندی اور اندر داخل ہو گیا۔ مویشیوں کے درمیان سے گزر کر وہ شخص دوسری طرف والی دیوار پر چڑھا اور باہر کود گیا۔ اس کے کودتے ہی دیوار کے اس پار سریلی چیخیں گونجیں۔ ایک لمحے بعد میں بھی دیوار کے اوپر تھا۔ میں نے دیکھا یہ کسی گھر کا صحن تھا۔ یہاں شامیانہ لگا تھا اور بلبوں کی زرد روشنی میں بہت سی زرق برق لڑکیاں اور عورتیں چیختی چلاتی ہوئی بھاگ رہی تھیں۔

درحقیقت یہ شادی والا گھر تھا چند لمحے پہلے یہاں ڈھولک بجائی جا رہی تھی۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے بھاگنے والے شخص نے ایک لڑکے کے ہاتھ سے لاٹھی چھین لی۔ (جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا یہ بھی ایک لڑکی تھی جس نے مردانہ لباس پہن کر پگڑی باندھ رکھی تھی اور

لڑکیوں کے ساتھ مل کر گانا بجانا کر رہی تھی) جونہی میں دیوار سے کودا ''بھاگنے والے'' نے بے دریغ مجھ پر لاٹھی چلائی۔ یہ بڑا کارگر وار تھا۔ لاٹھی کی شدید ضرب میرے داہنے ہاتھ پر پڑی اور ریوالور میرے ہاتھ سے نکل گیا۔ انگلیوں سے لے کر کندھے کے جوڑ تک سارا بازو سن ہو کر رہ گیا تھا۔ دوسرا وار بے حد پھرتی سے میرے سر پر کیا گیا۔ کوشش کے باوجود میں سر نہیں بچا سکا اور آنکھوں میں تارے ناچ گئے۔ ٹوپی اچھل کر دور جا گری تھی۔ پہلی بار میری نگاہ حملہ آور کے چہرے پر پڑی اور میں سن رہ گیا۔ وہ میرے لئے اجنبی نہیں تھا لیکن میں یہ نہیں جانتا تھا کہ یہ معمولی سا شخص میرے لئے اتنا سخت جان مدِمقابل ثابت ہوگا۔ اس نے بڑی مہارت سے لاٹھی چلائی اور مجھے کئی زوردار چوٹیں لگائیں۔ اس سے پہلے کہ کوئی چوٹ فیصلہ کن ثابت ہوتی اور میں چاروں شانے چت ہو جاتا، مجھے ایک موقع مل گیا۔ میں اپنا سر بچانے کی کوشش میں نیچے جھکا اور ایک جھٹکے سے وہ دری کھینچ لی جو لڑکیوں نے ڈھولک بجانے کے لئے زمین پر بچھا رکھی تھی۔ مدِمقابل پشت کے بل زمین پر گرا، میں نے چھلانگ لگا کر اسے دبوچ لیا۔ اس کو پھینٹی لگانے کے نیک کام میں چند عورتوں اور لڑکیوں نے بھی میرا ساتھ دیا اور مار مار کر اسے نڈھال کر دیا۔ کچھ دیر بعد میرے دونوں کانسٹیبل بھی موقع پر پہنچ گئے اور میرے اشارے پر انہوں نے خوانچہ فروش کو ہتھکڑی لگا دی۔

''خوانچہ فروش'' کے ذکر پر قارئین چونکے ہوں گے......جی ہاں......یہ وہی خوانچہ فروش یاسین تھا جو سردیوں کی راتوں میں گھوم پھر کر ''گرم انڈے اور ربڑی'' کی آواز لگاتا تھا اور جس نے چند ہفتے پہلے یہ بیان دیا تھا کہ اس نے واردات کی رات حبیب خان کو ایک موٹر رکشا سے اُتر کر وشوا ناتھ کے گھر میں داخل ہوتے اور پھر غائب ہوتے دیکھا تھا۔

☆======☆======☆

آبادی کے بہت سے لوگ ہمارے اردگرد جمع ہو چکے تھے۔ یاسین کو جلوس کی شکل میں واپس اس مکان میں لایا گیا جہاں سے وہ بھاگا تھا۔ ڈرائیور غفورا اور ادھیڑ عمر شخص مبین اختر دروازے پر کھڑے تھے اور بے حد خوفزدہ نظر آ رہے تھے۔ یہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ یہی خوانچہ فروش مبین اختر کا ''چھوٹا بھیا'' ہے۔ آبادی کے عوام وخواص اس واقعے میں بڑی دلچسپی لے رہے تھے اور بار بار مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ اس شخص نے کیا کیا ہے۔ میں سب کو گول مول سا جواب دے رہا تھا۔ ابھی تو ٹھیک سے مجھے بھی معلوم نہیں تھا کہ اس نے کیا کیا ہے؟ ہاں ایک بات مجھ پر اور میرے عملے پر واضح ہو چکی تھی۔ یہ خوانچہ فروش کسی نہ کسی طور پر وشوا ناتھ کے قتل میں ملوث ہے۔ میرا دھیان اس ٹیکسی کی طرف چلا گیا جو خوانچہ فروش یاسین

کے بھائی کی ملکیت تھی۔ ٹیکسی کی ڈگی میں خون کے دھبے موجود تھے...... یہ بات عین ممکن تھی
کہ ان دھبوں کا براہِ راست تعلق وشوانا تھ سے ہو...... یاسین بڑے عجیب طریقے سے قابو
میں آیا تھا۔ اگر معمول کی چیکنگ میں یہ ٹیکسی نہ پکڑی جاتی تو ہم اس مکان تک کیونکر پہنچتے اور
اگر یاسین مجھے دیکھ کر اچانک بھاگ نہ اٹھتا تو شاید اس مکان تک پہنچنے کے باوجود ہم ملزم تک
پہنچنے میں کامیاب نہ ہوتے...... یاسین کے گھر میں پہنچ کر معلوم ہوا کہ اس نے بھاگتے
بھاگتے جو چیز دروازے کے پاس پھینکی تھی وہ دراصل گرم انڈوں والی ٹوکری تھی۔ وہ پھیری لگا
کر واپس گھر آیا تھا۔ بالکل غیر متوقع طور پر مجھے کمرے میں بیٹھے دیکھا تو ڈر کر بھاگ کھڑا
ہوا۔ اردگرد کے لوگوں سے چند بیانات لینے کے بعد ہم نے یاسین اور اس کے بھائی مبین اختر
اور کھٹارہ ٹیکسی ڈرائیور غفور احمد کو حراست میں لیا اور تھانے کی طرف روانہ ہو گئے۔

خوانچہ فروش یاسین کو ہتھکڑیوں میں دیکھ کر میرا سارا عملہ حیران رہ گیا۔ کسی کے وہم و
گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ بے ضرر سا شخص قتل کیس کا ملزم ٹھہر جائے گا۔ خود مجھے بھی یقین
نہیں آرہا تھا لیکن حالات کی انگلی بڑی بے رحمی سے یاسین کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔ یاسین
شروع میں بہت گھبرایا ہوا تھا لیکن تھانے پہنچ کر بالکل پُرسکون ہوگیا۔ وہ ذات کا میواتی تھا۔
میں نے سن رکھا تھا کہ میواتی بڑے جنگجو ہوتے ہیں اور ان میں سے بعض نے تلوار بازی، لٹھ
بازی اور گتکے کی باقاعدہ تربیت لی ہوتی ہے۔ آج اپنی آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھ لیا تھا۔
شامیانے کے اندر یاسین نے جس مہارت اور بے خوفی سے مجھ پر لاٹھی گھمائی تھی، اگر چند
سیکنڈ اسے اور مل جاتے تو یقیناً مجھے ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا دیتا۔

کیس کے آغاز میں یاسین نے یہ بیان دیا تھا کہ اس نے حبیب خان کو وشوانا تھ کے
گھر میں داخل ہوتے دیکھا ہے۔ دوسرے لفظوں میں حبیب خان کو پھنسانے والا بھی یاسین
تھا۔ اب ایسا دکھائی دے رہا تھا کہ یاسین خود اس اغوا اور قتل میں ملوث ہے۔ اگر ایسا تھا تو
کیوں ہوا تھا۔ اس کے لئے یاسین کی زبان کھلوانے کی ضرورت تھی۔ یاسین نے بہت مشکل
سے زبان کھولی لیکن جب ایک بار کھولی تو پھر کچھ بھی نہیں چھپایا۔ آنکھوں میں آنسو بھر کر اور
چہرے پر جوش سجا کر وہ بولتا چلا گیا۔ بڑی روانی سے، بڑے اعتماد سے، سب اسے خاموشی
سے سنتے رہے۔ اس نے کہا۔ ''میں وشوانا تھ کا قاتل ہوں اور مجھے اس بات پر بے حد افسوس
ہے۔ کاش...... کاش میں حبیب خان کا قاتل ہوتا۔ میں نے اگر سزائے موت پائی تو مجھے
اپنے پھانسی چڑھنے کا افسوس نہیں ہوگا، صرف اس بات کا افسوس ہوگا کہ میں حبیب خان کی
بجائے ایک بے گناہ کے قتل میں پھانسی پا رہا ہوں۔ کاش وشوانا تھ مجھے اپنے قتل پر مجبور نہ

کرتا۔ کاش وہ میری بات مان جاتا۔''

وہ ہچکیوں سے رونے لگا۔ کچھ دیر رو چکا تو اس واقعے کی تفصیلات بتانے لگا۔ اپنی گلوگیر
آواز میں اس نے کئی انکشافات کئے اور آخر میں یہ بتایا کہ وشوانا تھ بے گناہ ہونے کے
باوجود اس کے ہاتھوں سے کیونکر اور کیسے قتل ہوا۔ اس کے طویل بیان کا خلاصہ درج ذیل
ہے۔

''آج سے پانچ برس پہلے میری شادی ہوئی تھی۔ میری بیوی کا نام فہمیدہ تھا۔ وہ میری
تایازاد بہن تھی۔ اس کو سب ''شہزادی شہزادی'' کہتے تھے۔ وہ کسی شہزادی ہی کی طرح خوب
شکل تھی۔ ہماری برادری میں اکثر افراد کے رنگ سانولے ہوتے ہیں لیکن اس کا رنگ بھی
صاف تھا۔ پتہ نہیں کب اور کس وقت وہ ایک شیطان کی نظروں میں آگئی...... ہاں میں اسے
شیطان ہی کہوں گا۔ سیدھی سادی عورتوں کو بہکانے ورغلانے اور خراب کرنے میں اس
بدکردار کو کمال حاصل ہے...... آپ سب لوگ اس شیطان کو حبیب خان کے نام سے جانتے
ہیں۔ اس نے شہزادی کو کہیں بازار میں دیکھا اور ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ گیا۔ پہلے ''بھائی''
بن کر اس کے قریب آیا، اس کے دل میں جگہ پیدا کی پھر اپنی اصلیت پر اُتر آیا۔ مجھے اس چکر
کا پتہ بہت دیر سے لگا۔ شہزادی خاموش اور افسردہ سی رہنے لگی۔ پہلے بچے کی پیدائش کے بعد
سے اخراجات بہت بڑھ چکے تھے اور آمدنی بہت کم تھی۔ میں نے سمجھا شاید گھر کی حالت کی
وجہ سے پریشان ہے۔ پھر وہ بیمار ہوگئی۔ ایک روز مجھ سے کہنے لگی کہ میں اسے اس کے میکے
چھوڑ آؤں۔ یہاں اس کا دم گھٹ رہا ہے یہاں رہی تو اور بیمار ہو جائے گی۔ مجھے اس کی
باتیں سمجھ میں نہیں آرہی تھیں۔ اس کا میکہ ڈلہوزی میں تھا۔ میں نے کہا ڈلہوزی میں تو بہت
سردی ہے وہ اس موسم میں وہاں نہ جائے لیکن وہ نہ مانی۔ میں نے کرائے کا انتظام کیا اور
اسے ڈلہوزی چھوڑ آیا۔

اس کے جانے کے ایک مہینے بعد اس کی ایک سہیلی سے مجھے پتہ چلا کہ ایک شخص ہاتھ
دھو کر اس کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ گھر کے چکر لگاتا تھا، خط لکھتا تھا اور ہر طرح تنگ کرتا تھا۔ وہ
ڈرتی تھی کہ اگر گھر میں بتایا تو فساد ہو جائے گا۔ اسی شخص سے جان چھڑانے کے لئے وہ
ڈلہوزی چلی گئی ہے۔ میں اس اطلاع پر سخت پریشان ہوا اور بیوی سے ملنے ڈلہوزی روانہ ہوا۔
جس وقت میں امرتسر سے ڈلہوزی روانہ ہوا اسی وقت ایک شخص ڈلہوزی سے امرتسر روانہ
ہو گیا۔ وہ میری بیوی کے مرنے کی خبر لے کر آیا تھا۔ وہی ہوا تھا جس کا مجھے اندیشہ تھا۔ سخت
سردی کے باعث اس کی حالت بگڑ گئی تھی اور وہ آٹھ دس روز نمونیے میں مبتلا رہنے کے بعد مر

گئی تھی...... یہ سراسر ایک حادثہ تھا لیکن مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ یہ ایک قتل ہے اور قتل کرنے والا وہی بدکردار ہے جس نے میری بیوی کو ایک عرصے سے ہراساں کر رکھا تھا۔ اگر وہ اس پر ڈورے نہ ڈالتا، اس کی سیدھی سادی زندگی میں ہلچل نہ مچاتا تو شاید وہ اب بھی زندہ ہوتی۔ میں رنڈوا اور میرا بچہ بے آسرا نہ ہوتا۔ میں نے دل میں پکا ارادہ کر رکھا تھا کہ زندگی میں جب بھی موقع ملا اس شخص کو سبق ضرور سکھاؤں گا۔ اوپر والے نے مجھے زیادہ انتظار نہیں کرایا۔ بیوی کے مرنے کے بعد میں امرت پور سے امرتسر چلا آیا تھا۔ نو دس ماہ پہلے حبیب خان بھی امرت پور سے امرتسر آ گیا۔ مجھے پتہ چلا کہ وہ اپنے مالک نظیر بادشاہ کی بیوی اغوا کر لایا ہے اور اس کے ساتھ محلہ رستم نگر میں رہ رہا ہے...... میں نے اس کا ٹھکانہ دیکھ لیا اور اس سے بدلہ لینے کے نئے نئے منصوبے بنانے لگا۔ میں کوئی دولت مند سیٹھ یا بڑا افسر نہیں تھا۔ ایک غریب خوانچہ فروش تھا اور میرے لئے حبیب خان سے ٹکرانا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ بس دل ہی دل میں کھولتا اور کڑھتا رہتا تھا۔ میں جان چکا تھا کہ حبیب خان شادی شدہ عورتوں کا شکاری ہے۔ یہ شکاری میرے سامنے گھومتا پھرتا تھا لیکن مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اسے جہنم واصل کر سکتا...... اسے مارنا ایک "نیک کام" تھا لیکن یہ نیک کام کرنا میرے بس میں نہیں تھا۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں واردات سے دو تین روز پہلے حبیب خان اور وشوانا تھ میں لین دین پر سخت لڑائی ہوئی اور دونوں نے ایک دوجے کو قتل کی دھمکیاں دیں۔ بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح میں نے بھی یہ لڑائی دیکھی۔ اس لڑائی سے دو تین روز بعد رات کو پھیری لگاتے ہوئے میں وشوانا تھ کے گھر کے سامنے سے گزرا تو مجھے حبیب خان نظر آیا۔ وہ ایک موٹر رکشا سے اُتر کر وشوانا تھ کے گھر میں داخل ہو رہا تھا۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ میں سمجھ گیا کہ کوئی گڑبڑ ہونے والی ہے۔ میں وہیں ایک تاریک گلی میں دبک کر کھڑا ہو گیا۔ آٹھ دس منٹ بعد ایک کھٹارہ سی جیپ وہاں پہنچی۔ جیپ میں سے ایک شلوار قمیص والا شخص برآمد ہوا۔ جیسا کہ بعد میں پتہ چلا کہ وہ نظیر بادشاہ تھا۔ اس نے وشوانا تھ کے دروازے پر دو تین بار دستک دی۔ پھر ایک دم وہ گھبرایا ہوا سا نظر آنے لگا۔ اس نے بڑی احتیاط سے ارد گرد کا جائزہ لیا۔ گلی دور تک سنسان نظر آ رہی تھی۔ وہ اچک کر دیوار پر چڑھا اور اندر کود گیا۔ اسے اندر کودے بمشکل ایک منٹ ہوا تھا کہ مکان کے پچھواڑے سے حبیب خان بھاگتا ہوا برآمد ہوا۔ وہ خوف زدہ نظر آ رہا تھا۔ سڑک پر پہنچ کر اس نے احتیاط سے دائیں بائیں دیکھا پھر جلدی سے موٹر رکشا میں سوار ہو گیا۔ رکشا والے نے اس کے بیٹھتے ہی رکشا اسٹارٹ کیا اور آگے بڑھا دیا۔ اسی دوران نظیر بادشاہ بھی دروازہ کھول کر باہر نکلا اور اپنی کھٹارہ جیپ میں بیٹھ کر نو دو گیارہ

ہو گیا۔ اب اس بات میں شبے کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ مکان میں کوئی گڑبڑ ہو چکی ہے۔

میں پندرہ بیس منٹ تک وہیں تاریک گلی میں کھڑا رہا۔ پھر وشوانا تھ کے گھر میں داخل ہو گیا۔ میں نے وشوانا تھ کو کمرے کی دہلیز پر دیکھا۔ وہ اوندھا پڑا تھا۔ اس کے کندھے اور سر سے بہنے والا خون فرش پر بکھرا ہوا تھا۔ وہ بے ہوش تھا۔ مجھے یہ جاننے میں بالکل مشکل نہیں ہوئی کہ وہ حبیب خان کے ہاتھوں زخمی ہوا ہے۔ میرے دماغ میں ایک خیال آیا۔ اگر بے ہوش وشوانا تھ کو موقعے سے غائب کر دیا جاتا تو حبیب خان سخت مشکل میں پڑ سکتا تھا۔ عین ممکن تھا کہ اس پر قتل کا الزام ہی لگ جاتا...... بغیر کچھ سوچے سمجھے میں اپنے گھر کی طرف بھاگا۔ میرا گھر وشوانا تھ کے گھر سے زیادہ دور نہیں ہے۔ اگر چھوٹی گلیوں سے ہو کر نکلا جائے تو بندہ دس منٹ میں پہنچ جاتا ہے۔ میں بھاگتا ہوا گیا تھا اس لئے دس منٹ سے بھی پہلے وہاں پہنچ گیا۔ بھائی جی کی ٹیکسی اس رات گھر ہی میں تھی۔ میں نے ان سے چابی لی اور ٹیکسی چلا کر وشوانا تھ کے مکان پر لے آیا۔ بھائی جی کا سالا بھی میرے ساتھ تھا۔ اس کا نام اشرف ہے۔ ہم دونوں نے مل کر بے ہوش وشوانا تھ کو ٹیکسی کی ڈگی میں ڈالا اور گھر لے آئے۔ اشرف کمپاؤنڈر ہے اس نے خود ہی وشوانا تھ کی مرہم پٹی کر دی اور بازار سے ایک ٹیکہ بھی منگوا کر لگا دیا۔ میں نے وشوانا تھ کے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے تھے۔ وہ پورے بیس روز ہمارے گھر کی کاٹھ کباڑ والی کوٹھڑی میں بند رہا۔ بھائی جی، ڈرائیور غفور اور میرے علاوہ کسی کو اس بات کا پتہ نہیں تھا۔ اس دوران میرے بیان پر حبیب خان گرفتار ہو چکا تھا اور اس پر مار پیٹ اور اغوا کا کیس بن چکا تھا...... اب میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وشوانا تھ کا کیا کروں۔ ہفتے دو ہفتے کی اور بات تھی لیکن اسے مہینوں تک اسی طرح بند نہیں رکھا جا سکتا تھا۔

میں نے سوچا کہ اسے کسی طرح ڈلہوزی بھجوا دوں اور کم از کم اس وقت تک قید رکھوں جب تک حبیب خان کو سزا نہیں سنا دی جاتی لیکن اسی دوران ایک خطرناک واقعہ ہو گیا۔ ایک روز وشوانا تھ نے کسی طرح اپنے ہاتھوں کی بندش کھول لی اور منہ سے کپڑا نکال کر چیخنے چلانے لگا۔ آپ نے دیکھا ہی ہے کہ ہمارا گھر گنجان آبادی میں ہے۔ وہ اسی طرح چیختا رہتا تو اڑوس پڑوس والے ہوشیار ہو جاتے۔ میں دروازہ کھول کر کوٹھڑی میں داخل ہوا تو وشوانا تھ مجھ سے گتھم گتھا ہو گیا۔ میں نے ڈرائیور غفور کے ساتھ مل کر اسے دبوچ لیا لیکن وہ مسلسل گلا پھاڑ کر چیخ رہا تھا۔ میں نے اس کی آواز بند کرنے کے لئے ایک آزار بند سے اس کا گلا دبانا شروع کر دیا۔ میں اسے قتل کرنا نہیں چاہتا تھا...... لیکن اس نے آخری وقت تک جدوجہد جاری رکھی۔ میں بھی اس کا گلا دباتا چلا گیا۔ اسی دوران ایک پڑوسی شور سن کر ہمارے گھر میں بھی چلا

آیا۔ خوف کی وجہ سے مجھے کچھ پتہ نہیں چلا کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ ایک دم وشوا ناتھ کا جسم ڈھیلا پڑ گیا۔ میں نے کوٹھڑی کے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا...... وہ مر چکا تھا۔

اب ہمارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ لاش کہیں پھینک دیں۔ لاش کو ایک بوری میں بند کیا گیا۔ میں نے خشک انجیروں میں پروئی جانے والی ایک رسی خاص طور سے حاصل کی اور بوری میں ڈال دی۔ مقصد یہی تھا کہ حبیب خان پر پولیس کا شک اور مضبوط ہو جائے۔ بعدازاں ہم رات کے وقت بوری کو ٹیکسی میں لاد کر گندے نالے میں پھینک آئے۔

☆======☆======☆

حوالات میں حبیب خان میرے سامنے بیٹھا تھا۔ اس نے داڑھی رکھ لی تھی۔ یہ داڑھی آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھی۔ کچھ آنسو داڑھی کے بالوں سے گزرنے کے بعد گردن تک بہہ رہے تھے۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''انسپکٹر صاحب! بہت گناہ گار بندہ ہوں میں...... اتنے گناہ کئے ہیں کہ گئے دنوں کا سوچ کر بھی شرمندگی ہوتی ہے لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ اوپر والا معاف کرنے والا ہے۔ اس کے خزانے میں کسی کے لئے کوئی کمی نہیں ہے۔ اس کی رحمت جوش میں آتی ہے تو بدبخت ترین انسان بھی محروم نہیں رہتے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ غفورالرحیم مجھے بھی بخش دے لیکن میں یہ سب کچھ آپ سے اس لئے نہیں کہہ رہا کہ میں اپنی سزا میں کوئی رعایت چاہتا ہوں۔ خدا کی قسم ایسا نہیں ہے۔ مجھے سزا دیں اور پوری سختی سے دیں، میں آپ کو صرف یہ بتانا چاہ رہا ہوں کہ میں نے اپنے آپ سے اپنی زندگی کا رخ بدلنے کا عہد کر لیا ہے۔ میں جیل میں ناظرہ قرآن مجید پڑھ رہا ہوں اور پانچ وقت کی نماز بھی دوبارہ شروع کر دی ہے۔ میں خدا کو حاضر ناظر جان کر قسم کھا چکا ہوں کہ شاہینہ میری زندگی میں آنے والی آخری عورت ہوگی۔ میں رات دن یہ دعا کرتا ہوں کہ رب العزت مجھے اس عہد پر قائم رہنے کی توفیق بخشے۔''

میں نے چند روز کے اندر حبیب خان، یاسین اور دیگر ملزموں کے خلاف چالان مکمل کر کے عدالت میں بھیج دیا۔ دستور کی عدالتی کارروائی کے بعد حبیب خان کو مار پیٹ، اغوا اور دھوکہ دہی کی مختلف دفعات کے تحت پانچ سال قید بامشقت کی سزا ہوئی۔ ڈھائی سال پہلے درج ہونے والے ڈکیتی کے کیس میں بھی اسے ایک سال کی سزا ہوئی۔ اس کیس میں یہ ثابت ہو گیا کہ حبیب خان نے واقعی سوبھاش ناتھ کو چار ہزار روپیہ دیا تھا، لہٰذا جج نے صرف آرمز ایکٹ کے تحت سزا سنائی اور لوٹ مار کے الزامات کو غلط قرار دیا۔ یاسین کو قتل اور اغوا

کے جرم میں بارہ سال قید بامشقت اور اس کے بھائی مبین اختر اور ڈرائیور غفور کو اعانتِ جرم میں بالترتیب پانچ سال اور تین سال کی سزا ہوئی۔

انسان زندگی کے راستے پر اپنی بداعمالیوں سے جو دھول اُڑاتا ہے وہ بہت دور تک اس کا پیچھا کرتی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ حبیب خان نے شاہینہ سے ٹوٹ کر عشق کیا تھا اور اسے اپنانے کے بعد وہ ہر بے راہ روی سے تائب ہو گیا تھا۔ وہ گھر اور دکان کی چار دیواری تک محدود ہو کر ایک پُرسکون اور پُرامن زندگی گزارنا چاہتا تھا لیکن...... جیسا کہ قارئین نے پڑھا...... حالات ابھی اپنا خراج مانگ رہے تھے اور حالات نے یہ خراج اس طرح مانگا کہ وشوا ناتھ، حبیب خان کے ہاتھوں زخمی ہوا اور بعدازاں اسے یاسین اٹھا کر لے گیا۔ حبیب خان ایک بار پھر تھانے کچہری کے چکروں میں گھسیٹا جانے لگا۔ اب وہ جیل کی چکی پیس رہا ہے۔ اپنی آخری محبت شاہینہ کو دوبارہ پانے کے لئے اسے کم از کم چھ سال سزا کی بھٹی میں جلنا تھا......

اس کہانی کا مظلوم ترین کردار یاسین تھا۔ اپنی بیوی کی موت کا بدلہ لینے کے چکر میں اس نے ایک بے گناہ شخص کے خون سے ہاتھ رنگ لئے اور ایک بے آسرا بچے کو بالکل بے آسرا کر دیا۔ شاید مکافاتِ عمل کے تحت اسے کسی نامعلوم جرم کی سزا مل گئی تھی۔ اس کہانی کا تیسرا اہم کردار نظیر بادشاہ سن سنتالیس تک امرت پور میں خوش و خرم زندگی گزار رہا تھا۔ اس نے ایک پنجابی عورت سے شادی کر لی تھی اور اپنا کاروبار اُمرتسر اور چنڈی گڑھ تک بڑھا لیا تھا۔

☆======ختم شد======☆